WWW.PAKSOCIETY.COM

دل سے نکلے ہیں جو لفظ

فرحت اشتیاق

WWW.PAKSOCIETY.COM

دل سے نکلے ہیں جو لفظ

فرحت اشتیاق

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 042-37352332-37232336

www.paksociety.com

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنفہ (فرحت اشتیاق) اور پبلشرز (علم و عرفان) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلیے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

نام کتاب	....	دل سے نکلے ہیں جولفظ
مصنفہ	....	فرحت اشتیاق
ناشر	....	گل فراز احمد علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	....	عاصم/انیس احمد
سن اشاعت	....	جولائی 2010ء
قیمت	....	=/250 روپے

......ملنے کے پتے......

علم وعرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون 7352332-7232336

www.paksociety.com

ادارہ علم وعرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

اپنی بہن ہما اشتیاق کے نام

جو میری تحریروں کی پہلی قاری، پہلی نقاد اور پہلی مداح ہیں اور

جن کے پیہم اصرار نے مجھ سے یہ ناول لکھوایا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

پیش لفظ

''دل سے نکلے ہیں جو لفظ'' محبت کی کہانی ہے۔ یہ محبت پر کامل یقین رکھنے والوں کی کہانی ہے۔ یہ نفرتوں سے بھری دنیا میں محبتوں کے خواب دیکھنے والوں کی کہانی ہے۔ یہ محبت سوچتے، محبت بولتے، محبت لکھتے اور محبت کرتے عمر حسن کی کہانی ہے۔ یہ محبت اور انا میں کشمکش کا شکار ودایعہ کمال کی کہانی ہے۔ یہ محبتوں سے شدید محبت کرتی زنیرہ عباس کی کہانی ہے۔ میرے یہ تینوں کردار اپنے اپنے انداز میں محبت کو برتتے نظر آئیں گے، مگر اس مختلف انداز کے باوجود ان تینوں کی زندگی کی بنیاد اور اساس محبت ہی ہے۔ اپنے ان تینوں کرداروں کو میں نے بڑی محبت سے تخلیق کیا ہے۔ اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ خواتین ڈائجسٹ میں اس ناول کی قسط وار اشاعت کے دوران میرے قارئین نے بھی ان کرداروں سے میری ہی طرح محبت کی۔ محبت کی اس کہانی کو محبت ہی سے پڑھنے اور پھر میری طرف اس قدر والہانہ محبتیں بھیجنے پر میں اپنے تمام قارئین کی تہہ دل سے شکر گزار رہوں۔

کسی بھی کتاب کو کامیاب بنانے کے لیے جتنی کوشش رائٹر کو کرنی پڑتی ہے۔ اتنی ہی کوشش پبلشر کو کرنی پڑتی ہے۔ میری کتابوں کے حقوقِ اشاعت حاصل کرنے کے بعد علم و عرفان پبلشرز نے اس ذمہ داری کو میری توقعات سے زیادہ بہتر طور پر ادا کیا ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قارئین میری اس رائے سے اتفاق کریں گے۔

فرحت اشتیاق

www.paksociety.com

دل سے نکلے ہیں جو لفظ

اس صبح جب میں ابا میاں کے ساتھ واک کرنے نکلی تب میں نے پانچویں بار انہیں دیکھا اور انہیں دیکھتے ہی ایک بار پھر ان ہی کیفیات کا شکار ہوئی جن میں اس سے قبل ہر بار مبتلا ہوئی تھی۔ چالیس بیالیس کی عمر ہونے کے باوجود وہ بہت ہینڈسم تھے۔ ان کی آنکھوں پر موجود گلاسز اور کنپٹیوں کے پاس ہلکے ہلکے سفید بالوں نے ان کی شخصیت کو مزید پر وقار اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ پچھلی چاروں مرتبہ وہ مجھے مختلف رنگوں کی جینز کے ساتھ ہلکے رنگوں والے کارڈیگنز یا پل اوورز میں نظر آئے تھے اور آج بھی انہوں نے بلیو رنگ کی جینز کے اوپر آف وائٹ رنگ کا پل اوور پہن رکھا تھا۔ ان کا لباس نہ تو بہت قیمتی تھا اور نہ ہی ایسا کہ انہوں نے پوری توجہ اور پورا وقت اپنے ظاہر پر دیا ہوگا پھر بھی وہ بہت شاندار لگتے تھے۔ وہ عام سے لباس میں بھی خاص تھے۔ ان کی ظاہری خوب صورتی، متانت، وقار، سنجیدگی میں ان سب سے متاثر ہوئی تھی۔ ایسے باوقار مرد ہمیشہ سے میرے آئیڈیل رہے ہیں مگر میرے ان کی طرف متوجہ ہونے کا سبب یہ باتیں ہرگز نہیں تھیں۔ بلکہ اس کا سبب کچھ اور تھا۔ وہ سامنے سے آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اسی سمت آرہے تھے۔ ان کے ساتھ اپنے بائیں بازو سے محروم وہ نو دس برس کا بچہ بھی تھا جسے میں نے ہر مرتبہ ان کے ساتھ دیکھا تھا۔

یقیناً یہ بچہ ان کا بیٹا تھا۔ اس چھوٹے سے بچے کی اتنی بڑی محرومی مجھے اس بچے کے ساتھ ساتھ اس کے باپ سے بھی بے پناہ ہمدردی محسوس ہوتی تھی۔ جو اپنی اولاد کی معذوری جیسی بڑی آزمائش سے گزر رہا تھا مگر میرے اس شخص کی طرف متوجہ ہونے کا سبب ان باپ بیٹے سے ہمدردی بھی نہیں تھی۔ میرے متوجہ ہونے کا سبب تو یہ احساس تھا کہ میں نے اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ جیسے میں اس شخص کو جانتی ہوں، جیسے میں اس سے کبھی مل چکی ہوں مگر کب، کہاں، کس حوالے سے، یہ ہزار کوشش کے باوجود بھی یاد نہیں آرہا تھا۔

میرا بہترین حافظہ مجھے یہ تو بتا رہا تھا کہ میں نے اس چہرے کو پہلے بھی دیکھا ہے اور شاید کئی بار دیکھا ہے۔ مگر میں نے اسے کہاں دیکھا ہے، مجھے یاد نہیں آرہا تھا۔

میں ان دنوں اپنے نانا، نانی کے پاس ایبٹ آباد آئی ہوئی تھی اور ایبٹ آباد آنے کے دوسرے ہی روز جب میں گھر کے قریب درختوں کے جھنڈ میں گھرے خوب صورت گوشے میں بیٹھ کر لکھنے کے ارادے سے وہاں آئی تھی تب میں نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ میں ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھی لکھ رہی تھی۔ لکھ کیا رہی تھی، خود کو لکھنے کے لیے آمادہ کر رہی تھی۔ تب ایک شوخ اور بلند مردانہ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''گائیڈ نے پاکستانی سیاح کو پیسا کا مشہور ٹاور دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور جناب! یہ ہے پیسا کا وہ ٹیڑھا مینار جسے لوگ دنیا بھر سے دیکھنے آتے ہیں۔''

پاکستانی سیاح نے اوپر سے نیچے تک ٹاور کو دیکھا اور پھر منہ بنا کر بولا۔ ''اس میں تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس ٹھیکے دار کی بنائی ہوئی کئی

عمارتیں تو ہمارے ملک میں بھی موجود ہیں۔"

اس سناٹے اور خاموشی میں اس پرجوش اور پر مزاح آواز نے میرے لکھنے کے تسلسل کو توڑ دیا تھا۔ میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے سر اٹھایا۔ تب وہ مجھے اس بچے کے ساتھ زور زور سے باتیں کرتے اور چہل قدمی کرتے دکھائی دیئے تھے۔ اتنی مشکلوں سے میں نے لکھنے کا موڈ بنایا تھا، اور یہ پرسکون جگہ تلاش کر کے یہاں بیٹھی تھی تاکہ کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے اور یہ شخص بلاوجہ شور شرابا کرتا، میرا ارتکاز توڑ رہا تھا۔ پوری طرح بچے کی طرف متوجہ اسے لطیفے سنانے میں مصروف جبکہ بچہ خاموشی، اداسی بلکہ کسی قدر بیزاری کے ساتھ گھاس پر نظریں جمائے ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ وہ لطیفے پر ہنسنا تو دور، مسکرایا تک نہیں تھا۔ میری نگاہیں محسوس کر کے انہوں نے بچے کی طرف جھکا ہوا اپنا سر اوپر اٹھایا اور گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ان کی نظریں سیدھی مجھ سے ٹکرائی تھیں انہوں نے ایک پرخلوص مسکراہٹ میری طرف اچھالی اور دوبارہ اس بچے کی طرف متوجہ ہو گئے مگر میں ان پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔ پھر میں اپنے کاغذ اور قلم کی طرف متوجہ نہ ہو سکی۔

"مریض ڈاکٹر سے جا کر بولا۔" مجھے آپ کی دوا سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔

وہ اب بچے کو دوسرا لطیفہ سنا رہے تھے۔ اور میری طرف بالکل متوجہ نہیں تھے اور میری اب ان کے سوا کسی طرف توجہ نہیں تھی۔ اس بندے کو ایک نظر دیکھ کر ہی مجھے اس احساس نے اپنے حصار میں لے لیا تھا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں مگر کہاں......؟

وہ دونوں میرے قریب سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ چکے تھے اور میں گردن گھمائے مسلسل اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ گلاسز کے پیچھے چھپی وہ آنکھیں جو صرف ایک پل کو میری آنکھوں سے ملی تھیں۔ مجھے یہ احساس دلا رہی تھیں کہ میں ان آنکھوں کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں اور ایک مرتبہ نہیں، کئی مرتبہ دیکھ چکی ہوں۔ میں اپنی یادداشت پر زور ڈالتی سوچ رہی تھی اور الجھے چلی جا رہی تھی۔ وہ بچے کو ساتھ لیے دور جاتے جاتے کب کے میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے اور میں ہنوز الجھی ہوئی تھی۔ لکھنے کا میرا موڈ جو بڑی مشکلوں سے خود پر جبر کر کے بنایا تھا، ختم ہو چکا تھا۔ صبح سے لے کر رات گئے تک میرا ذہن اسی مانوس اجنبی میں الجھا رہا مگر جب پہچان کا کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تو تھک ہار کر میں نے خود کو نیند کے حوالے کر دیا۔

اگلے روز لکھنے کا ارادہ کر کے میں ایک مرتبہ پھر اسی جگہ آ گئی۔ صاف ستھری آب و ہوا، کھلی کھلی فضا، ہریالی، سبزہ، پھول، درخت، پہاڑ، خوب صورت موسم یہ سب میری قنوطیت اور ڈپریشن کو خوشگوار موڈ میں بدل ڈالیں گے۔ میرے مزاج پر یہ تمام خوب صورتیاں خوشگوار اثر ڈالیں گی۔ فطرت سے قریب ہوں گی تو لکھنے سے جو ایک بے زاری کی کیفیت میں ان دنوں مبتلا ہوں اس سے باہر نکل آؤں گی۔ یہی سب سوچ کر تو میں ایبٹ آباد ابا میاں اور رنا کے پاس آئی تھی مگر میرے ساتھ ہو کیا رہا تھا۔ میں گھر پر آتش دان کے قریب کرسیاں ڈال کر ڈرائی فروٹس اور کافی سے لطف اندوز ہوتے ابا میاں سے لمبی لمبی علمی بحثیں کرتی۔ سیاست، حالات حاضرہ پر گرما گرم مباحثے کرتی، رنا سے اپنی پسند کی ڈشز پکوا پکوا کر کھاتی، خوب گپیں مارتی اور لکھنے کی بات آتی تو خود کو "ابھی موڈ نہیں بن رہا، رات میں لکھوں گی۔" کہہ کر اطمینان دلا دیا کرتی۔ میں یہاں اپنا ناول مکمل کرنے آئی تھی۔ نوے فیصد سے بھی زیادہ میں اسے لکھ چکی تھی۔ بہت محنت کی تھی میں نے اپنے اس ناول پر۔ اتنی ریسرچ میں نے اب تک اپنے کسی ناول پر نہیں کی جتنی اس پر کی تھی۔

کتنی راتیں میں نے اسے جاگ جاگ کر لکھا تھا۔ اپنی کتنی صبحیں، کتنی دوپہریں اور کتنی شامیں ساری دنیا کے ہنگاموں سے کٹ کر صرف اپنے کمرے میں مقید ہو کر اس کی نذر کی تھیں۔ یہ میری ڈیڑھ سال کی محنت تھی اور اب جب ناول تکمیل کے آخری مراحل میں تھا، تب میں یکا یک اس ناول سے کیا سرے سے لکھنے ہی سے بیزار ہو رہی تھی۔ اپنی کی ہوئی محنت خود ہی کو یاد دلا کر بدقت موڈ بناتی۔ میں پہلے روز فطری حسن سے مالا مال اس خوب صورت درختوں سے گھری سرسبز شاداب جگہ اگر بیٹھی تو اس اجنبی نے مجھے اپنی پہچان میں الجھا کر لکھنے نہیں دیا اور دوسرے روز جب میں وہاں پہنچی تو وہ ایک مرتبہ پھر اسی بچے کے ساتھ گھومتے پھرتے نظر آئے۔

زور زور سے بولتے، بچے کو لطیفے اور پہیلیاں سناتے، اسے بولنے پر اکساتے۔ وہ بچہ پہلے روز ہی کی طرح اس روز بھی بہت اداس تھا۔ بالکل خاموش، ساری دنیا سے بیزار اور خفا خفا سا۔ وہ دونوں میرے پاس سے گزرے تو میں انہیں بغور دیکھنے لگی۔ کل ہی کی طرح انہوں نے بچے پر سے توجہ ہٹا کر لمحہ بھر کے لیے میری طرف دیکھ کر ایک سادہ سی مسکراہٹ اچھالی اور بچے سے باتیں کرتے آگے بڑھ گئے۔ ان کے مسکرانے پر مجھے ایک دم ہی اپنی حماقت کا شدید احساس ہوا۔ میں کل بھی اور آج بھی عجیب بے تکے پن سے منہ اٹھا کر انہیں گھور گھور کر دیکھتی رہی تھی۔ مجھے ٹکٹکی باندھ کر اپنی سمت دیکھتا پا کر وہ از راہ اخلاق مسکرائے مگر دل میں انہوں نے نجانے میرے متعلق کیا خیال کیا ہوگا۔ خود کو سرزنش کرتی میں اسی وقت وہاں سے اٹھ کر گھر واپس آگئی تھی۔

''میں نے اس بندے کو کب اور کہاں دیکھا ہے؟''

پھر تیسرے اور چوتھے دن میں نے اپنی بالکونی سے انہیں اس بچے کے ساتھ اسی جگہ گھومتا پھرتا دیکھا تھا۔ مجھے جہاں تک وہ نظر آتے رہے، میں انہیں دیکھتی رہی اور الجھتی رہی۔

''ہوگا کوئی، دیکھا ہوگا کہیں۔ نہیں یاد آ رہا تو بس نہیں آ رہا۔ کیا اب اسی ایک بات کے پیچھے پڑے رہنا ہے۔''

تنگ آ کر خود کو ملامت کرتی۔ میں کل رات جھنجھلا کر سوگئی تھی اور صبح صبح جب میں اس بندے کو یکسر بھلائے ابامیاں کے ساتھ صبح کی تر و تازہ اور صاف شفاف ہوا اور دلکش مناظر کو انجوائے کرتی سڑک پر بے فکری سے واک کر رہی تھی۔ تب وہ ایک مرتبہ پھر سامنے آ گئے تھے۔ ان کے بار بار ٹکرانے سے میں یہ تو سمجھ چکی تھی کہ وہ یہاں کہیں قریب ہی رہتے ہیں۔

وہ مسکراتے ہوئے ہماری ہی طرف آ رہے تھے۔ کتنی مختلف سی تھی یہ مسکراہٹ۔ ایسی اداسی بھری مسکراہٹ جوان کے چہرے کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ شاید یہ بیماری سب ہی لکھنے والوں کو ہوتی ہوگی۔ ہر چیز، ہر جگہ، ہر شخص اور ہر چہرے کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کی بیماری۔

یہ اداس اور بجھی ہوئی آنکھیں۔ میں نے ان آنکھوں کو پہلے بھی دیکھا ہے مگر یوں بجھا ہوا نہیں۔ میں نے یہ آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں مگر خوشی اور امید کے عکس لیے ہوئے۔ میں نے انہیں بجھا ہوا نہیں بلکہ مسکراتا ہوا دیکھا ہے۔ میں نے ان میں بڑی پیاری سی چمک دیکھی ہے، میں نے ان میں زندگی دیکھی ہے۔ میرا وجدان بڑی شدت سے مجھ سے کہہ رہا تھا۔

وہ میری الجھی ہوئی کیفیت سے انجان ابامیاں اور میرے قریب آ کر رک چکے تھے۔

''السلام علیکم پروفیسر صاحب!''

''وعلیکم اسلام۔ کیسے ہو عمر؟'' ان کے خوش اخلاقی سے کیے گئے سلام کا ابا میاں نے گرم جوشی سے بھرپور انداز میں جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح واقف تھے، نہ صرف یہ کہ واقف تھے بلکہ ان کے درمیان خاصے خوشگوار قسم کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔

''الحمدللہ میں خیریت سے ہوں۔ آپ سنائیے۔''

''میں مزے میں ہوں، بہت خوش ہوں۔ میری نواسی جو آئی ہوئی ہے۔'' ابا میاں نے ہنستے ہوئے میری طرف اشارہ کیا۔

اس بار انہوں نے بہت توجہ سے مجھے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے ابا میاں سے پوچھنے لگے۔ ''آپ کی نواسی، وہ جو لکھتی ہیں؟''

''اوہ تو میری شہرت مجھ سے پہلے یہاں تک پہنچ چکی ہے۔'' میں بے ساختہ مسکرائی۔

''جی جناب! وہی نواسی۔ مشہور و معروف مصنفہ زنیرہ عباس۔ کبھی اسکے فینز کے خطوط اور ای میلز پڑھو۔ کیسے زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اس کی شان میں۔'' ابا میاں نے حسب عادت میری تعریفیں شروع کیں۔ میری کوئی ایک تحریر بھی انہوں نے کبھی نہیں پڑھی تھی مگر میرے لکھے ہوئے کی تعریفیں ان سے زیادہ کوئی کر نہیں سکتا تھا۔ ان کی نگاہوں میں میرا مقام قراۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور بانو قدسیہ سے بس کچھ ہی کم تھا۔ محبت کے اندھے ہونے کا میرا خیال ہے اس سے بڑا کوئی ثبوت ہو ہی نہیں سکتا۔

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر زنیرہ! آپ کو ہمارا شہر کیسا لگا؟''

وہ دور سے دیکھنے میں جتنے ڈیسینٹ اور نرم مزاج لگتے تھے، قریب سے اس سے بھی زیادہ محسوس ہو رہے تھے۔ دھیما دھیما سا پر خلوص لہجہ۔ گفتگو کا انداز انتہائی مہذب اور شائستہ، نگاہوں میں سادگی، تصنع اور بناوٹ سے قطعاً پاک چہرہ۔

''آپ کا شہر بہت اچھا ہے۔'' میں نے ان کے سوال کا جواب دیا۔

''ایبٹ آباد پسند ہے، تب ہی تو یہاں اپنا ناول مکمل کرنے آئی ہے، یہ آنا نانا نانی کے لیے تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو یوں ہے کہ فطرت سے قریب ہو کر مصنفہ صاحبہ نے کچھ تخلیق کرنا ہے۔''

ابا میاں نے موقع دیکھتے ہی اپنا کئی دفعہ کا کیا گیا شکوہ ایک مرتبہ پھر دہرایا۔

کیلی فورنیا سے واپس آ جانے کے بعد پچھلے دو سالوں سے ابا میاں اور نانا ایبٹ آباد میں رہ رہے تھے۔ بھاگتے دوڑتے ہنگامہ پرور شہروں سے دور انہوں نے اپنا بڑھاپا یہاں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا اور یہ بہر حال میری نالائقی تھی کہ میں ان دونوں کے بہت بلانے پر بھی ان دو سالوں میں ایک بار بھی یہاں نہیں آ پائی تھی۔ چنانچہ ذرا خفا خفا سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں، میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ آپ کچھ لکھ رہی تھیں۔ شاید وہ آپ کا ناول ہی تھا اور میں نے اور محبؔ نے وہاں آ کر یقیناً آپ کو ڈسٹرب کیا تھا، تب ہی کل اور پرسوں آپ وہاں نظر نہیں آئیں۔'' ابا میاں کے شکوے اور میری روٹھی نگاہوں کو محظوظ نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں

نے اپنی اور اپنے ساتھ کھڑے ہوئے بچے کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا۔

اس سے قبل کہ میں اب جواب میں کچھ کہتی، ابا میاں ان سے کوئی اور بات کرنے لگے۔

''تم لوگوں کے فنکشن کا کیا ہوا؟ تیاریاں کہاں تک پہنچیں؟''

''تیاریاں بس مکمل ہی سمجھیے۔'' میں چونکہ اس کے متعلق کچھ جانتی نہیں تھی، اس لیے اس گفتگو سے لاتعلق خاموشی سے کھڑی انہیں اور اس بچے کو دیکھنے لگی۔

تین چار منٹ بعد وہ مسکراتے ہوئے ہمیں خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ وہ باپ، بیٹا آگے بڑھ گئے تو میں فوراً ہی ابا میاں سے ان کے متعلق پوچھنے لگی۔

''یہ عمر ہے، یہاں قریب ہی رہتا ہے۔ اچھے بچوں کی طرح سڑک پر چل کر جاؤ تو پہنچنے میں دس، گیارہ منٹ لگتے ہیں اور ڈھلوانی اور کچے راستے سے کودتے پھاندتے پہنچو تو صرف تین یا چار منٹ۔''

ان کا جواب حسب توقع غیر سنجیدہ تھا۔

''وہ تو مجھے بھی پتا چل گیا ہے ابا میاں کہ ان کا نام عمر ہے۔ ابھی آپ نے میرے سامنے ان کا نام لیا تھا۔ میں ان کا تفصیلی تعارف جاننا چاہ رہی ہوں۔ یعنی یہ کون ہیں؟ کیا کرتے ہیں؟''

''یہاں ہمارے گھر کے قریب معذور، بے سہارا اور لاوارث بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم ہے، چمن زار کے نام سے۔ عمر کو تم وہاں کا نگران سمجھ لو۔''

ابا میاں نے میری دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے سنجیدگی سے بتایا مگر ان کے جواب نے میری الجھن کو ختم کرنے کے بجائے مزید بڑھا دیا تھا۔

''کوئی فلاحی ادارہ اور اس کا نگران؟'' اس طرح کے کسی آدمی سے میری، میرے والدین، اور بہن بھائیوں میں سے کسی کی بھی کبھی واقفیت نہیں۔

''پھر میں انہیں کیسے جانتی ہوں؟'' میں نے دل ہی دل میں خود سے پوچھا۔

''چمن زار بہت بڑے رقبے پر بنا ہوا ہے۔ ایک پاکستانی میاں بیوی ہیں، جنہوں نے یہ ادارہ بنایا ہے۔ دراصل ان کے پانچ بیٹے ہیں اور پانچوں کے پانچوں کسی نہ کسی ذہنی وجسمانی معذوری میں مبتلا۔ وہ دونوں میاں بیوی اور ان کے کچھ قریبی عزیز واقارب اور دوست اس ادارے کے مالک اور کرتا دھرتا ہیں، مگر سب کے سب پاکستان سے باہر رہتے ہیں۔ کوئی امریکہ، کوئی کینیڈا، کوئی آسٹریلیا، کوئی عرب امارات، سال میں ایک یا دو بار ہی یہ لوگ یہاں آتے ہیں اور یہاں کا نظم ونسق انہوں نے عمر کے حوالے کیا ہوا ہے اور پچھلے کئی سالوں سے وہ اپنی ذمہ داریاں بڑی اچھی طرح نبھا رہا ہے۔ ان بے سہارا بچوں کے لیے چمن زار میں اسکول بھی ہے اور ہوسٹل بھی۔ یعنی وہ یہاں رہتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں۔ ہوسٹل کا ماحول بالکل گھر کے جیسا ہی ہے۔ ہوسٹل کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی انیکسی ہے جس میں عمر رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ عمر دن رات ان بچوں ہی کے ساتھ رہتا

ہے۔ کہنے کو نہ وہ اس ادارے کا مالک ہے اور نہ ہی اس نے اسے قائم کیا ہے۔ مگر قریب سے دیکھو تو پتا چلے گا کہ یہ اس کی ملازمت نہیں، یہ اس کی زندگی کا ایک واضح مقصد ہے۔ ایک نصب العین، یہ لاوارث اور معذور بچے اس کے سب کچھ ہیں۔ اس نے اپنی پوری زندگی ان بچوں کے لیے وقف کردی ہے۔ بغیر کسی صلے اور ستائش کی تمنا کے۔ یہ بچہ محبؔ جسے تم نے ابھی اس کے ساتھ دیکھا تھا، ایک ایکسیڈنٹ میں اس نے اپنے ماں باپ کے ساتھ ساتھ اپنا ایک ہاتھ بھی گنوادیا ہے۔ رشتے دار کب کسی کے ہوئے ہیں۔ اس کے چچا، تایا اسے یہاں داخل کروا کے اپنی جان چھڑا گئے۔ ابھی اس حادثے کو گزرے اور اسے یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے، اسی لیے عمر آج کل ہر وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رکھتا ہے تاکہ اس کی دل جوئی کر سکے، اسے اپنائیت اور محبت کا احساس دلا سکے اور اسے اس جگہ سے مانوس کرا سکے۔"

اور میں اپنی پچھلی سوچ کو بھلا کر حیرت سے ابا میاں کو سن رہی تھی۔ میں پچھلے چار دنوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور اس بچے کے ساتھ ان کے محبت اور شفقت بھرے انداز کو دیکھ کر میں نے اتنے یقین سے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ان کا بیٹا ہے مگر ایک آدمی کسی اور کے بچے سے، کسی بالکل غیر اور پرائے بچے سے باپ کی طرح پیار کرے، اس کی دل جوئی کرے تو یہ یقیناً بے حد حیرت کی بات تھی۔

"اس نفسا نفسی اور خود غرضی کے دور میں ابھی عمر جیسے بے غرض اور بے لوث لوگ بھی موجود ہیں، جو انسانیت پر سے ہمارے اٹھتے یقین کو بچا لیتے ہیں۔"

ابا میاں کے توصیفی جملوں سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ وہ شخص ابا میاں کو کس قدر پسند ہے۔

☆☆☆

من و سلویٰ (معاشرتی رومانی ناول)

من و سلویٰ آپ کی پسندیدہ مصنفہ **عمیرہ احمد** کی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے جو انہوں نے حرام، حلال رزق کے حصول جیسے اہم موضوع پر تحریر کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو اپنی روزی کمانے کے لئے رزق حلال کا راستہ چنتے ہیں اور دوسرے وہ جو کامیاب ہونے کے لئے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ اس ناول میں مصنفہ نے جائز اور ناجائز کا فرق بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حلال کی کمائی ہمیں برائی پر جانے سے روکتی رہتی ہے اور حرام کا ایک لقمہ بھی اگر ہمارے خون میں شامل ہو جائے تو وہ کس طرح ہمیں بربادی کے کنارے لے جاتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میرا اپنے پسندیدہ، پرسکون اور خوب صورت گوشے میں جا کر لکھنے کا ارادہ تھا مگر ابر آلود ہوتا موسم اور سردی کی شدت میں یک دم ہی ہو جانے والے اضافے نے مجھے گھر میں ہی بند رہنے پر مجبور کر دیا۔ بہت مشکلوں سے میں چند سطریں لکھ پائی اور پھر وہی بیزاری اور کوفت۔ ایسا نہیں تھا کہ اپنی کہانی کے اختتام کے حوالے سے میں کسی الجھن یا پریشانی کا شکار تھی۔ میری پوری کہانی اپنے انجام سمیت میرے ذہن میں واضح تھی۔ میں کوئی بھی چیز اس وقت تک لکھنا شروع ہی نہیں کرتی تھی جب تک اس کی چھوٹی سی چھوٹی تفصیل بھی مجھ پر واضح نہ ہو مگر یہاں اصل مشکل یہ تھی کہ سب کچھ ذہن میں ہر اعتبار سے واضح ہونے کے باوجود میں اسے لکھ نہیں پا رہی تھی۔

''یا اللہ یہ لکھنے کی طرف میری طبیعت مائل کیوں نہیں ہو رہی؟'' مجھے جلد سے جلد اپنے اس ناول کو شائع ہوتا دیکھنے کی شدید خواہش تھی اور اپنی اسی خواہش کے زیرِ اثر میں اپنی ایڈیٹر سے یہ وعدہ لے کر آئی تھی کہ وہ کسی بھی دوسرے ناول پر میرے ناول کو فوقیت دیتے ہوئے اسے فوراً شائع کر دیں گی۔ مگر اس ترجیحی اور اعزازی سلوک کے ساتھ انہوں نے مجھے ایک ڈیڈ لائن بھی دے دی تھی۔ مسودہ ان تک پہنچنے کی ڈیو ڈیٹ۔ اور مجھے اپنی قبول کی ہوئی ڈیو ڈیٹ سے پہلے پہلے مسودہ ان تک پہنچانا تھا۔

کافی دیر تک میں قلم ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی پھر جب بہت کوششوں کے باوجود بھی کچھ لکھ نہیں پائی تو کاغذ قلم میز پر چھوڑ کر بک شیلف کے پاس آ گئی۔ جو کتاب مجھے وہاں سے لینا تھی، وہ بالکل سامنے ہی رکھی ہوئی تھی۔ میرا پسندیدہ ترین ناول ہے۔ بات تو کچھ عجیب سی ہے مگر ہے بالکل سچ۔ جب بھی لکھتے لکھتے الجھ جاؤں، کسی پیچیدہ مرحلے پر کہانی کو سنبھالنے میں مشکل محسوس کرنے لگوں تو ہر بار یہی کتاب میری الجھن دور کر کے مجھے مزید لکھنے پر آمادہ کرتی ہے۔

''محبت جن کے ساتھ ہوتی ہے، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ محبت انہیں کبھی تنہا ہونے نہیں دیتی۔''

پانچ سال پہلے اسی ناول کے اسی جملے نے مجھ سے میرا پہلا افسانہ لکھوایا تھا۔ اسے چھپوانے کی جرات گو میں دو سال بعد یعنی تین سال قبل کر پائی تھی مگر لکھا میں نے اسے پانچ سال پہلے تھا۔ میرا پہلا افسانہ جو شائع بھی ہوا تھا اور جس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں لکھ بھی سکتی ہوں یہ ناول میں نے پہلی مرتبہ آج سے سات سال قبل جب میں آنرز کے پہلے سمسٹر میں تھی، تب پڑھا تھا۔ ہاں ایسا ہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔ ہاں محبت کو اتنی ہی شدت سے میں بھی محسوس کرتی ہوں۔ ہاں محبت کو میں بھی لکھنا چاہتی ہوں اسی شدت کے ساتھ، اسی گہرائی کے ساتھ۔ میرے اندر چھپے رائٹر کو اسی ناول نے دریافت کیا تھا۔

یہ ناول میں نے فٹ پاتھ پر پرانی کتابیں بیچتے ایک ٹھیلے والے سے خریدا تھا۔ بڑا ادب اکثر چھوٹی جگہوں پر ملا کرتا ہے۔ یہ میری بہت پرانی عادت ہے۔ مجھے جب کبھی بڑے ادب کی تلاش ہوتی، تو میں ایسی عام سی ہی جگہوں کا رخ کیا کرتی ہوں۔ ایسی جگہیں جہاں بیچنے والے کو خود نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کوڑیوں کے مول کیسی کیسی انمول چیزیں بیچ رہا ہے۔

''Forever'' نام کا یہ ایک انگریزی ناول تھا اسے لکھنے والا ایک مسلمان تھا۔ یہ کتاب اٹھا کر مصنف کا نام دیکھتے ہی مجھے پتا چل گیا تھا۔ یہ مصنف میرے لیے قطعاً اجنبی تھا مگر جس چیز نے مجھے اس ناول کو خریدنے پر مجبور کیا، وہ اس کا انتساب تھا۔

''محبت کے نام..... جو میرے لکھنے کی پہلی اور آخری وجہ ہے جس کے لیے میں لکھتا ہوں جس کی وجہ سے میں لکھتا ہوں۔''

میں نے وہ ناول فوراً خرید لیا تھا اور اسے پہلی بار پڑھ کر میرے دل کی جو حالت ہوئی تھی وہ شاید میں پوری طرح کسی کو سمجھا بھی نہیں سکتی۔ اس کتاب نے مجھے یوں اپنے حصار میں لیا تھا کہ میں کتنے ہی دنوں تک اس کے اثر سے نہیں نکل سکی تھی۔ میں اتنی جذباتی نہیں کہ فرضی قصے کہانیوں پر روؤں یا انہیں پہروں سوچتی رہوں مگر اس ناول نے مجھے کئی راتیں جگائے رکھا تھا۔ باوجود اس کے بعض حصوں نے مجھے بے طرح رلایا تھا تو بعض نے بے انتہا ہنسایا بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر میں اس مصنف کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ یہ کون تھا جو محبت کو اتنی شدت سے محسوس کرتا تھا، بالکل میری طرح۔ مجھ سے اتنا بھرپور لکھا نہیں جاتا مگر وہ محبت کو بالکل ویسے ہی لکھتا تھا جیسے میں اسے سوچتی تھی۔ ایسا بہترین ادب نہ میں نے اس سے پہلے کبھی پڑھا تھا اور نہ اس کے بعد۔ ان سات سالوں میں نجانے کتنی بار اس کتاب کو پڑھ چکی تھی۔ میں اس مصنف کی گرویدہ ہو چکی تھی۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھتا میرا فیورٹ رائٹر کون ہے تو میں انہی کا نام لیتی۔ اکثر سوال پوچھنے والا حیرت سے مجھے دیکھتا کہ یہ کون غیر معروف مصنف ہے جسے میں اپنا پسندیدہ مصنف قرار دے رہی ہوں۔ خاص طور پر میرے دوست، یعنی میرے ایج گروپ کے افراد۔ ان کی حیرت پر میں انہیں بتاتی کہ یہ کوئی معمولی رائٹر نہیں ہے، اس کے پہلے ہی ناول نے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ ہاں مگر یہ بات بیس سال پرانی ہے۔ میری نسل کے لوگ بیس سال قبل شائع ہونے والی ایک کتاب کے مصنف کو کیونکر جان سکتے تھے جبکہ اس ایک ناول کے بعد اس نے کبھی کچھ لکھا بھی نہ ہو۔ 1985ء میں یہ ناول لندن کے ایک پبلشنگ ہاؤس نے شائع کیا تھا۔

میں اس مصنف کے بارے میں مزید جاننا چاہتی تھی اور اس مقصد کے لیے میں نے انٹرنیٹ کا سہارا لیا تھا جس پبلشنگ ہاؤس نے یہ ناول شائع کیا تھا، میں ان کی آفیشل ویب سائٹ پر گئی۔ عمر حسن اور forever ٹائپ کرتے ہی مجھے اس ناول کے متعلق مزید معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ بیس سال پہلے یہ ناول شائع ہوا تھا تو اس نے شہرت اور مقبولیت کے کون کون سے ریکارڈ قائم کیے تھے۔ مجھے یہ آگاہی حاصل ہوئی مگر مصنف کے بارے میں سوائے اس بات کے کہ اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔ مجھے کچھ خاص معلوم نہ ہو سکا۔ مگر مجھے یہ ضرور پتا چلا کہ جب یہ ناول شائع ہوا تب اس وقت لندن کے مختلف اخبارات و جرائد کی بیسٹ سیلر لسٹ میں اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ تین پینتیس ہفتے گزارے تھے۔ ہارڈ کور کے ساتھ ساتھ فوراً ہی اس کتاب کا پیپر بیک ایڈیشن بھی شائع کیا گیا تھا۔ گارجین، آبزرور اور ٹائمز جیسے بڑے اخبارات و جرائد کے ادبی صفحوں میں اس ناول پر تبصرے شائع ہوئے تھے۔ نقادوں نے تیسری دنیا اور خاص طور پر مسلمانوں کے خلاف اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اسے دل کھول کر سراہا تھا۔ مختلف ویب سائٹس ڈھونڈتے اور کھنگالتے میں عمر حسن کے اس وقت لندن اور کراچی کے مختلف اخبارات و جرائد کو دیے گئے انٹرویوز میں سے چند ایک ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر ان انٹرویوز کو پڑھ کر بھی میں ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں سوائے اس کے کہ ان کا تعلق کراچی سے ہے اور وہ وہیں پیدا ہوئے، وہیں اپنا یہ ناول لکھا، کچھ اور جان نہیں پائی۔ انہوں نے انٹرویوز میں ساری باتیں بس اپنے ناول کے حوالے سے کی تھیں۔ ایک پاکستانی مصنف نے بین الاقوامی طور پر خود کو تسلیم کروایا۔ اپنے اول Debut novel کے ذریعہ اس نے کئی لٹریری پرائز تک جیت لیے پھر وہ یک دم کہاں غائب ہو گیا؟ اس ایک ناول کے بعد اس نے دوبارہ کبھی کچھ نہیں لکھا؟ میرے ان سب سوالوں کے جواب میں انٹرنیٹ خاموش تھا۔

''عمر حسن! آپ کیسے ہوں گے؟ آپ نجانے کہاں رہتے ہوں گے؟ کبھی جو آپ مجھے ملیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ میں نے آپ سے کیا کیا کچھ سیکھا ہے۔ آپ اپنی تحریر میں جیسے لگتے ہیں نجانے ویسے ہوں گے بھی یا نہیں مگر میرا دل کہتا ہے کہ آپ بالکل ویسے ہی ہوں گے محبت اور خلوص سے بھرا دل رکھنے والا ایک سادہ و حساس انسان جو نفرت کرنا جانتا ہی نہیں ہوگا۔ جو اپنے کرداروں ہی کی طرح استعجابیہ انداز میں پوچھا کرتا ہوگا۔

''نفرت کیسے کرتے ہیں؟''

اور جو کبھی آپ واقعی مجھے مل جائیں تو میں خوشی سے اچھل ہی پڑوں گی۔ کچھ شک نہیں کہ میں ٹین ایجرز جیسی بے وقوفانہ حرکتیں بھی کر گزروں۔ جانتی ہوں کہ آپ سے ملنا ایک ناممکن سی خواہش ہے پھر بھی اگر کبھی آپ سے مل سکی تو آپ کو یہ ضرور بتاؤں گی کہ جو کچھ اپنی تحریر میں آپ نے کہنا چاہا ہے مجھ سے زیادہ اچھی طرح کسی نے بھی محسوس نہیں کیا ہوگا۔'' یہ وہ جملے تھے جو اس کتاب کو پڑھتے ہوئے میں نے بار بار دہرائے تھے۔

جو میرے لیے ایک استاد کا سا درجہ رکھتا ہے۔ ابھی بھی جب کچھ لکھنے کے دوران میں کہانی کے کسی موڑ پر الجھ جاتی ہوں، تو عمر حسن کا ناول اٹھا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ اسے پڑھتے پڑھتے کہیں نہ کہیں مجھے میری الجھن کا سرا مل جاتا ہے۔ ہر بار اسے پڑھ کر لکھنے کے لیے مجھے نئی توانائی اور نیا حوصلہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ......؟ شاید یہ کہ وہ شخص بھی بالکل میری طرح سوچتا تھا۔ جو میں سوچتی تھی اور لکھ نہیں پاتی تھی، وہ اسے لفظوں کا بہت خوب صورت پیراہن پہنا کر کاغذ پر منتقل کر دیا کرتا تھا۔ سات سو صفحوں کے اس ضخیم ناول کو پڑھ کر بھی ایک مصنف کی سوچ کو پوری طرح جاننے کا دعوا یقیناً نہیں کر سکتی تھی مگر پھر بھی جو کچھ اس ناول میں موجود تھا، وہ مجھے میرے دل سے انتہائی قریب محسوس ہوتا تھا۔

بک شیلف سے کتاب نکال کر اب میں بیڈ پر بیٹھی اس کا پہلا باب پڑھ رہی تھی۔ یہ میری اس کتاب سے انتہائی وابستگی تھی جو میں اسے اپنے مختصر ترین ضروری سامان اور اپنے ادھورے مسودے کے ساتھ لے کر آئی ہوئی تھی۔ اور ہمیشہ کی طرح اسے پڑھتے ہوئے میں گردو پیش سے بے نیاز ہو چکی تھی مگر بہت دیر تک پڑھتے رہنے کے بعد جب میں پہلا باب پڑھ کر فارغ ہوئی تب مجھے یہ احساس ہوا کہ باقی سب کچھ تو آج ہمیشہ جیسا ہی ہوا ہے لیکن ہمیشہ کی طرح آج میری الجھن کا حل موجود نہیں ہے۔ میری یہ بے زاری میری پسندیدہ کتاب بھی دور کرنے سے قاصر تھی اور ایسا آج پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔

''سر! آج تو آپ بھی میری کوئی مدد نہیں کر پائے۔''

کئی گھنٹوں بعد میں نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور مایوسی کے عالم میں اپنے سامنے بکھرے اپنے ادھورے مسودے کو دیکھنے لگی۔

☆☆☆

مایوس اور پریشان میں کس وقت سو گئی تھی یہ تو مجھے معلوم نہیں، ہاں یہ ضرور معلوم ہے کہ میری آنکھ باتوں کی آوازوں سے کھلی تھی۔ نیچے سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ذرا غور کرنے پر مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ان آوازوں میں ابا میاں اور رنا کے ساتھ ایک اور آواز بھی شامل تھی۔ یقیناً کوئی مہمان آیا ہوا تھا۔ میری نگاہ گھڑی پر گئی۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے۔ ''او مائی گاڈ۔'' میں چھلانگ لگا کر بیڈ پر سے اٹھی۔ آنے والے مہمان پر بے وقت سونے والی حرکت کا کیا امپریشن پڑے گا۔ منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں تیزی سے برش چلا کر دوپٹہ اوڑھتی میں فوراً نیچے آ گئی۔

''آیے بھئی رائٹر صاحبہ! کہاں تھیں آپ؟''

لاؤنج میں قدم رکھتے ہی میں نے انہیں دیکھ لیا تھا۔ وہ گرم جوشی سے مجھ سے مخاطب ہوئے تھے۔ وہ لاؤنج میں ابا میاں اور ننا کے ساتھ صوفے پر بیٹھے تھے۔ سامنے رکھے خالی کپ یہ بتا رہے تھے کہ ابھی ابھی چائے یا کافی پی گئی ہے۔

''میری آنکھ لگ گئی تھی۔'' کسی قدر شرمندگی سے جواب دیتے ہوئے میں سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''آج بھی اپنی مخصوص جگہ پر لکھنے نہیں آئیں؟ میں اور محب صبح وہاں گئے تو تم کہیں پر نظر نہیں آئیں۔'' انہوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تکلف کے مجھے ''تم'' کہہ کر مخاطب کیا۔ جیسے کہنا چاہتے ہوں۔

''میں تم سے اتنا بڑا ہوں کہ تمہیں ''تم'' کہہ سکوں۔''

ہر کسی سے اپنائیت محسوس نہیں ہوتی، ہر کسی کی طرف دل نہیں کھنچتا، ایسا کوئی کوئی ہوتا ہے، ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے اور مجھے اس اجنبی شخص سے اپنائیت کا عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

''موسم ابر آلود ہو رہا تھا نا اور پھر مجھے سردی بھی بہت لگ رہی تھی۔''

وہ میرے جواب پر مسکرائے ''کراچی سے آئی ہو نا، اسی لیے آٹھ دس ڈگری ہی میں سردی لگنی شروع ہو گئی۔ اگر تمہارے رہتے یہاں کی اصلی والی سردی شروع ہو گئی خوب زوردار بارشوں اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ پھر کیا کرو گی؟''

''فوراً واپس چلی جاؤں گی۔'' میں ہنستے ہوئے بے ساختہ بولی۔

''عمر تم کھانا کھا کر جانا۔ میں نے آج مچھلی بریانی بنائی ہے۔'' ننا نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا۔

''آج نہیں آنٹی! پھر کسی دن میں.....'' ان کی معذرت کو ابا میاں اور ننا دونوں ہی نے مکمل نہیں ہونے دیا تھا۔

''تمہارا پھر کسی دن، کبھی نہیں آئے گا۔ ہمیں کیا تمہاری مصروفیات کا علم نہیں ہے۔ کارڈ دینے کے بہانے اگر آ ہی گئے ہو تو اب آرام سے بیٹھو۔'' ننا انہیں کہتے ہوئے کچن میں چلی گئیں۔ اصولاً اور اخلاقاً مجھے بھی ننا کے ساتھ ہی کچن میں چلے جانا چاہیے تھا اور میں جانے کے لیے اٹھنے ہی لگی تھی کہ ابا میاں کا فون آ گیا۔ وہ فون سننے کے لیے اٹھے تو مجھے اخلاق نبھانے کو مہمان کے ساتھ ہی بیٹھا رہنا پڑا۔ کچن کے چور کام نہ کرنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔

''تمہارا ناول کہاں تک پہنچا؟'' وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

''بس اب اختتام کے قریب ہے۔'' میں انہیں اپنی الجھن اور پریشانی کیا بتاتی اور جو بتا بھی دیتی تو کون سا وہ اسے سمجھ لیتے۔

''اس ناول کے بعد آگے کیا لکھنے کے ارادے ہیں؟''

''آگے بہت کچھ لکھنے کے ارادے ہیں، بہت سی خواہشات ہیں، وہ جو مصرع ہے کہ ''تخیل ماہتاب ہو، اظہار آئینہ'' آرزو ہے کہ ایسا لکھ پاؤں۔ میرے ناولز کے دوسری زبانوں میں ترجمے ہوں۔ میرا ہر ناول بیسٹ سیلر ہو۔ میں سب سے زیادہ چھپنے والی، سب سے زیادہ پڑھی جانے والی

اور سب سے زیادہ پسند کی جانے والی مصنفہ کہلاؤں۔ بڑے بڑے لٹریری پرائز میں سے کئی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، وغیرہ وغیرہ۔''

میرے جوشیلے انداز پر ان کی ہنسی بے ساختہ تھی۔

''بڑے بڑے لٹریری پرائز مثلاً Nobel، Pulitzer prize، Booker prize، Orange prize، Smith prize وغیرہ وغیرہ۔''

شرارتی سے لہجے میں انہوں نے میرے ہی انداز میں وغیرہ کی گردان کی۔ ان کی شوخ ہنسی پر کافی جھینپ گئی تھی۔ خفت سے میں نے ان کی طرف دیکھا۔

''آپ میرے بچکانہ انداز پر یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میری تحریریں بھی اتنی ہی بچکانہ اور بے وقوفانہ ہوتی ہوں گی۔''

''ہرگز نہیں۔'' انہوں نے فوراً ہی تردیدی انداز میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری تحریر بہت خوب صورت ہوگی۔ اس میں بالکل ایسی ہی امید، ایسا ہی عزم اور ایسا ہی جوش ہوگا، جیسا تمہاری باتوں میں ہے۔'' سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے انہوں نے جھٹ میری شرمندگی دور کرنے کی کوشش کی۔

''آج جو کچھ تمہیں ناقابل رسائی اور خواب جیسا لگ رہا ہے، کیا پتا کل تم وہ سب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ جو لوگ یہ سارے پرائز حتیٰ کہ نوبل پرائز حاصل کرتے ہیں، وہ بھی میرے اور تمہارے جیسے انسان ہی ہوتے ہیں۔ اگر وہ محنت کر کے اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں تو تم کیوں نہیں جبکہ تمہارے پاس تو جیت لینے کا عزم اور لگن بھی ہے۔''

''اس شخص نے زندگی میں کبھی بھولے سے بھی کسی کا دل نہیں دکھایا ہوگا۔'' میں نے بے اختیار سوچا۔

''تم نے لکھنا کیسے شروع کیا زنیرہ؟'' انہوں نے ایک رائٹر سے اسی کی پسند کے موضوع پر بات چیت شروع کر دی۔

''بالکل اتفاقیہ طور پر۔ میرے ساتھ ایسا کچھ معاملہ نہیں ہوا۔ وہ بچپن سے لکھنے کا شوق تھا، والا۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''میرے لکھنا شروع کرنے کی وجہ عمر حسن ہیں، میرے فیورٹ رائٹر، ان کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا ہے۔ اگر آپ کو لٹریچر میں دلچسپی ہے تو شاید آپ نے ان کا نام سن رکھا ہو۔ صرف ایک ہی ناول لکھا ہے انہوں نے اور اس ایک ہی ناول کے ذریعہ انہوں نے بڑے بڑے رائٹرز کے درمیان بلکہ ان سے بھی کہیں آگے ادبی دنیا میں اپنی جگہ بنالی۔ ایسے مصنف روز روز پیدا نہیں ہوتے، صدیوں میں کوئی ایک ایسا پیدا ہوتا ہے۔ ان ہی کو پڑھ کر میں نے لکھنا سیکھا اور لکھنا شروع کیا۔''

''کسی رائٹر کو پسند کرنا، ان کے انداز تحریر سے متاثر ہونا، یہ سب تو سمجھ میں آتا ہے مگر کسی کو پڑھ کر لکھنا سیکھ لینا، یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں رائٹرز بنتے نہیں، رائٹرز پیدا ہوتے ہیں۔ سیکھنے سے اگر لکھنا آجاتا تو دنیا کا ہر دوسرا فرد شیکسپیئر ہوتا۔ سیکھنے والی بات یوں مانی جاسکتی ہے کہ لکھنے کی فطری صلاحیت موجود تھی۔ بس کوششوں سے، محنت اور مطالعے سے اسے نکھار لیا گیا ہے۔'' انہوں نے بغور مجھے دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لکھنے کی فطری صلاحیت اللہ نے مجھے یقیناً عطا کی ہوئی تھی مگر میں اپنی اس صلاحیت سے آگاہ نہیں تھی۔

میری یہ صلاحیت کبھی خود مجھ پر ہی ظاہر نہ ہوتی، اگر میں اتنا ڈوب کر اور اتنی گہرائی سے ان کے ناول forever کو نہ پڑھتی۔ انہیں پڑھ کر مجھے لکھنے کی تحریک ملی تھی اور اب بھی ملتی ہے۔ محبت کو عمر حسن ہی کی طرح لکھنے کی شدید خواہش دل میں رکھتے میں نے اپنا پہلا افسانہ لکھا تھا۔ میں یہ بات پورے دعوے اور مکمل یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ عمر حسن کے بعد میں ہی وہ دوسری ہستی ہوں جس نے ان کے لکھے ہر لفظ اور ہر جملے کو خود ان ہی کی طرح محسوس کیا۔ دنیا کے کئی ممالک میں ان کے فینز ہوں گے مگر مجھ سے بڑا ان کا کوئی فین نہیں ہو سکتا۔ میں ان کا ناول اتنی بار پڑھ چکی ہوں کہ اب تو خود مجھے بھی صحیح گنتی یاد نہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہر بار میں ان کے ناول کے ہر صفحے اور ہر سطر کو اسی طرح دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر پڑھتی ہوں جیسے پہلی بار پڑھ رہی ہوں وہ میرے لیے ایک استاد کی طرح ہیں۔ جب بھی کبھی میرے ساتھ ایسا ہو کہ کہانی تو میرے پاس ہے مگر اسے لکھنے کی تکنیک یا پلاٹ وغیرہ کے متعلق میں کسی الجھن کا شکار ہو جاؤں تو پھر میں اپنے ان ہی استاد سے رہنمائی حاصل کرتی ہوں اور آپ یقین کریں کہ وہ مجھے کبھی مایوس نہیں کرتے۔ وہ ہر بار میری مدد کرتے ہیں۔ میں کاغذ، قلم ایک طرف رکھ کر ان کا ناول ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتی ہوں اور اس کی کوئی نہ کوئی سطر، کوئی نہ کوئی لفظ، کوئی نہ کوئی بات اچانک ہی میری الجھن کو سلجھا دیتی ہے۔

میں ان جیسا نہیں لکھتی، ان کے جیسا لکھنا میرے بس کی بات ہی نہیں، زندگی کے بارے میں، رشتوں کے بارے میں اور سب سے بڑھ کر محبت کے بارے میں۔

روانی سے بولتے بولتے میں ایک دم زبان دانتوں تلے دبا کر یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ کہیں میں انہیں بور نہ کر رہی ہوں۔ یہ میرے اردو یا انگلش لٹریچر کے کسی پروفیسر کا آفس نہیں، ابا میاں کا گھر تھا اور سامنے بیٹھا ان کا مہمان نجانے ادب وغیرہ میں دلچسپی رکھتا بھی تھا کہ نہیں۔ وہ گہری سنجیدگی سے مجھے بولتا سنتے رہے تھے۔ مگر جیسے ہی میں خاموش ہوئی وہ مدھم سے مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے۔

"یعنی آپ عمر حسن کی ڈائی ہارڈ فین ہیں۔"

"جی ہاں۔ کیا آپ نے ان کا ناول پڑھا ہے؟" میں نے یہ سوال انکار سننے کی امید پر کیا تھا۔ میرے اس سوال کا اکثر لوگ انکار ہی میں جواب دیا کرتے تھے مگر ان کا جواب اثبات میں تھا اور اس اثبات نے میرے جوش و خروش میں لازمی اضافہ ہی کرنا تھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے اس کے بارے میں؟"

"ہاں، اچھا ناول ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک لو اسٹوری۔ ایک مسلمان لڑکی اور انگریز فوجی افسر کی محبت کی کہانی۔"

انہوں نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا مگر یہ سنجیدہ اور مختصر تبصرہ مجھے سخت ناگوار گزرا۔ اتنی بے مثال کہانی کو محض لو اسٹوری قرار دینا۔

"شاید آپ نے اس ناول کو سرسری انداز میں پڑھا ہے، اس لیے یہ بات کہہ رہے ہیں۔ ہاں یہ محبت کی کہانی ہے مگر یہ صرف ایک لڑکے اور ایک لڑکی کی محبت کی کہانی نہیں ہے۔ مصنف نے اس محبت کو بہت وسیع معنوں میں لیا ہے۔ محبت کا کون سا رنگ اور کون سا انداز ہے جو اس میں موجود نہیں۔ اسے پڑھ کر محبت کی وسعت کا، اس کے لامحدود ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ گو اس ناول میں سب کچھ فرضی ہے۔ مصنف نے خود اسے

ایک مکمل فکشن کا نام دیا ہے۔ اس کے باوجود اس میں ہر جگہ سچائی اور حقیقت کی جھلک نظر آتی ہے۔ تقسیم سے قبل کے ہندوستان کی، اس دور کے مسلمانوں، ہندوؤں اور انگریزوں سب کی سوچ کی، نظریات کی کس قدر بھرپور عکاسی کی ہے۔ پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے ہم تاریخ کے اسی موڑ پر جا کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ جنگیں انسانوں سے ان کا کیا کیا کچھ چھین لیا کرتی ہیں، جنگوں کی بے رحمی اور ظلم کا نشانہ بننے والوں کا کرب جیسے اپنے دل سے محسوس کیا اور دل سے لکھا ہے عمر حسن نے۔ یہ صرف کسی مخصوص علاقے، مخصوص خطے یا مخصوص تہذیب کے لوگوں کے درد وغم کی کہانی نہیں، بلکہ اس میں جنگوں سے نفرت کرنے والے ساری دنیا کے انسانوں کی بات ہے۔ اس کا پیغام آفاقی ہے۔ جو بات مجھے سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ محبت ہے۔ ان کے ہاں محبت زندگی کا ثانوی نہیں بلکہ بنیادی جذبہ ہے۔ وہ جذبہ جس پر انسان کی زندگی کی بنیادیں کھڑی ہوتی ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد آپ اسے بھول نہیں سکتے۔ یہ آپ کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے اور جو چیز آپ کو زندگی کے مقاصد کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرے، آپ کے اندر اچھائیوں سے محبت کرنے کا جذبہ جگائے، آپ کو آپ کی تخلیق کا مقصد یاد دلائے جسے پڑھ کر آپ اس پر دنوں سوچیں وہ چیز عام نہیں، خاص بلکہ خاص الخاص ہوتی ہے۔''

میں نے ان سے مہذبانہ لہجے میں واضح اختلاف کیا۔ میری طویل تقریر کے دوران وہ خاموش بیٹھے بغور مجھے دیکھتے رہے تھے۔

''جب دوسروں کی اس طرح وکالت کرتی ہو تو پھر جب کوئی تمہارے لکھے پر تنقید کرتا ہو گا تو کیا حال ہوتا ہو گا؟'' ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''تب خاموش رہتی ہوں۔ چاہے وہ تنقید جانبدارانہ انداز میں بے رحمی اور سنگ دلی ہی کے ساتھ کیوں نہ کی گئی ہو۔ چاہے اس تنقید میں میرے اصلاح کا کوئی پہلو سرے سے موجود نہ ہو کیونکہ اگر ایسا نہ کروں تو الزام فوراً لگ جائے گا کہ ان سے تنقید برداشت نہیں ہوتی۔''

''زنیرہ عباس پر کون تنقید کر سکتا ہے؟'' ابا میاں چند سیکنڈز قبل ہی ہمارے درمیان واپس آ کر بیٹھے تھے۔

''کر سکتا ہے ابا میاں! بالکل کر سکتا ہے۔ تنقید کرنے والوں نے جب غالب، اقبال، شیکسپیئر، ہارڈی اور کیٹس جیسے عظیم تخلیق کاروں کی شاہکار تخلیقات کو نہیں بخشا تو میں کیا اور میری بساط کیا؟''

''تنقید بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے، اگر تنقید کرنے والے کی سوچ تعمیری اور مثبت ہے، وہ کسی کے انداز تحریر میں بہتری اور اصلاح کے لیے تنقید کر رہا ہے تو یہ تنقید بہت اچھی تنقید ہے لیکن اگر کوئی تنقید اصلاح کا کوئی پہلو ذہن میں نہ رکھتے ہوئے شوقیہ اور عادتاً کی جا رہی ہے تو یہ بری بلکہ بدترین تنقید کہلائے گی۔''

ابا میاں جو ہماری اس گفتگو کے دوران ایک سامع کا منصب سنبھالے بیٹھے تھے اپنی وہ خاموشی ترک کر کے بے ساختہ بولے۔

''لیکن ایک لکھنے والے کو اتنا مضبوط ضرور ہونا چاہیے کہ وہ کسی بھی بے رحمانہ تبصرے اور ناجائز تنقید کے اثرات صرف اس حد تک قبول کرے کہ وہ اس کی زندگی کا محض ایک دن خراب کریں گے دوسرا نہیں۔ وہ اسے اپنی زندگی کا دوسرا دن خراب نہ کرنے دے۔ دوسرے دن وہ نئے ولولے اور نئے جوش کے ساتھ وہی کچھ پھر سے لکھنا شروع کر دے جو وہ لکھا کرتا ہے اور جو لکھنا اسے اچھا لگتا ہے۔ تعمیر اور اصلاح کے مقصد سے

عاری ان تبصروں اور تنقید کی بابت مثبت انداز میں یوں سوچیں کہ لوگ آپ کو پڑھتے ہیں۔ سرسری انداز میں نہیں، بہت غور سے، بڑی باریک بینی کے ساتھ۔ انہیں کون مجبور کرتا ہے؟ وہ نہ پڑھیں، آپ کو نظرانداز کر دیں اور پھر کسی بھی انداز میں سہی وہ آپ کی تحریر پر تبصرہ اور تنقید کرتے ہیں۔ وہ اپنے قیمتی وقت میں سے کتنا بہت سا وقت آپ کی تحریر کو دے دیتے ہیں۔ کیا یہ آپ کی کامیابی کی دلیل نہیں؟''

''بھئی، میں پروفیسر صاحب کی بات سے سو فیصد متفق ہوں۔ تم رائٹرز کو عادت سے مجبور اور تنقید برائے تنقید کا شوق رکھنے والے ان افراد کو اپنی کامیابی کی دلیل سمجھنا چاہیے۔ تم لوگوں کے اطمینان کے لیے کیا یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ تمہارا بہت نوٹس لیتے ہیں، وہ تم لوگوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔'' ہم تینوں کی یہ گفتگو جاری رہتی مگر سجاد کے کھانا لگ جانے کی اطلاع دینے پر ہم نے گفتگو کا سلسلہ موقوف کر کے ڈائننگ روم کا رخ کیا، جہاں نانا ڈائننگ ٹیبل کے پاس کھڑی ہم لوگوں کا انتظار کر رہی تھیں۔

چند منٹوں بعد ہم چاروں کھانے اور باتیں کرنے میں مشغول ہو چکے تھے۔ ابا میاں، مہمان کی خاطر تواضع اور ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے جبکہ نانا حسب معمول میرے نخرے اٹھانے میں۔ وہ مجھے تازہ پکی ہوئی بریانی کو چھوڑ کر دوپہر کی باسی اسپگیٹیز کھانے پر ٹوک رہی تھیں۔

''نانا! مجھے اسپگیٹیز کھانے دیں نا پلیز۔ اس میں آپ نے چیز (پنیر) ڈالی ہوئی ہے اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کھانے کی ہر وہ شے جس میں چیز ہو، میری فیورٹ ہے۔''

میں نے اسپگیٹیز فورک میں پھنساتے ہوئے لاپروائی سے کہا۔ ابا میاں کے ساتھ گفتگو میں پوری طرح مشغول ہونے کے باوجود عمر نے ایک دم چونک کر میری طرف دیکھا۔ میرے جملے میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس پر چونکا جائے یا حیران ہوا جائے۔ میں ان کے حیران ہونے پر حیران ہوئی۔ انہوں نے فوراً ہی اپنی نظریں مجھ پر سے ہٹالی تھیں مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ بظاہر ابا میاں کے ساتھ باتیں کرنے کے باوجود وہ میری ہی طرف متوجہ ہیں۔

مجھے الجھن تو محسوس ہوئی مگر میں نے قصداً اپنا دھیان اس طرف سے ہٹا کر سلاد کا پیالہ اپنی طرف کھسکا کر سلاد کے مخصوص قسم کے قینچی نما اسٹائل کی چمچے کی مدد سے پیالے میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چن چن کر سلاد کے پتے اپنی پلیٹ میں ڈالنے لگی۔ کافی دیر بعد اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سر اوپر اٹھایا تو نظریں سیدھی ان کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ وہ اپنا کھانا روک کر حیران نظروں سے ایک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس بار میں ان کے حیران ہونے کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ اکیلے میں ہم آلو گوشت کے شوربے میں روٹی چور چور کر کے کھالیں یا پائے کی ہڈیاں خوب مزے لے لے کر چوس لیں مگر مہمانوں کے سامنے کھانے پینے کے کچھ آداب ہوا کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے اتنی عالمانہ باتیں کرتی لڑکی اب ڈائننگ ایٹی کیٹس سے قطعاً ناواقف نظر آ رہی تھی۔ سلاد کے پیالے میں سے سلاد کے پتے تلاش کرتی پھر رہی ہے تو وہ بے چارے حیران ہی ہوں گے۔

خود کو ڈانٹتے ہوئے میں مکمل تہذیب اور شائستگی سے کھانا کھانے لگی۔ کھانے کے بعد میں سب کے لیے چائے بنا کر لائی۔ چائے پیتے ہی وہ جانے کے لیے اٹھ گئے۔ میں انہیں گیٹ تک خدا حافظ کہنے آئی تھی، جبکہ ابا میاں کو انہوں نے گیٹ تک آنے سے احتراماً روک دیا تھا۔

''تمہاری اپنے نانا نانی کے ساتھ بہت دوستی ہے؟''

میں نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

''جی ہاں، بہت زیادہ، ابامیاں کے ساتھ تو خاص طور پر میری بہت زیادہ انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ بچپن میں، میں ابامیاں اور بنا کے پاس اتنا زیادہ رہی ہوں کہ ان کا گھر مجھے ابھی بھی اپنے گھر سے زیادہ اپنا لگتا ہے۔ ابھی بھی جب میں ایبٹ آباد آ رہی تھی تو میری بہن مجھے چھیڑ رہی تھی۔ بجو اپنے میکے جا رہی ہیں۔''

وہ میری بات پر خوب کھل کر ہنسے میں نے ان کی ہنسی کو بغور دیکھا۔ آج چھٹی بار میں اس چہرے کو دیکھ رہی تھی اور ان چھ مرتبہ میں، میں اس چہرے پر ہنسی خوشی، مسکراہٹ، سنجیدگی، سادگی، خاموشی، شوخی، شرارت کی کیفیات دیکھ چکی تھی مگر یہ آنکھیں ہر تاثر کے ساتھ ایک ہی جیسی رہی تھیں، اداس اور خاموش، گہرا کرب اور ملال لیے ہوئے۔ وہ مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے اور میں ان کی آنکھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں کی سوگواری اور خاموشی مجھے ایک پل میں اس خواہش میں مبتلا کر گئی تھی کہ میں ان پر ایک کہانی لکھوں۔ اس سوگواری اور ملال کے پیچھے یقیناً ایک کہانی چھپی تھی۔ کبھی کبھی سوچوں تو خود پر شرم بھی آتی ہے اور ندامت بھی ہوتی ہے۔ جو کسی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ وہ ہم رائٹرز کے لیے ہماری ایک کہانی ہے۔

وہ کب کے جا چکے تھے اور میں ہنوز گیٹ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ یخ بستہ، سرد ہوائیں میرے جسم کو چھو کر گئیں تو چونک کر ایک گہری سانس بھرتے ہوئے واپس اندر آ گئی۔

''ابامیاں ان کی فیملی بھی کیا یہیں پر رہتی ہے؟'' میرے اندر کے خود غرض کہانی نویس کو ایک نئی کہانی کی تلاش تھی۔

''نہیں، وہ یہاں اکیلا رہتا ہے۔'' ابامیاں نے میرے استفسار پر سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے اور میں ان کے پیروں کے پاس فلور کشن پر۔ بنا بھی وہیں موجود تھیں مگر ان کی توجہ ٹی وی کی طرف تھی۔

''پھر ان کی فیملی...... میرا مطلب ہے بیوی، بچے کیا کہیں اور رہتے ہیں؟''

''اس نے شادی نہیں کی۔''

میں ابامیاں کے جواب پر حیرت اور تجسس میں بیک وقت مبتلا ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس عمر تک آ کر کوئی شادی نہ کرے۔ ایسا بے وجہ تو نہیں ہوتا۔

''اور ان کی فیملی کے باقی افراد؟ والدین، بھائی، بہن؟''

''پتا نہیں اس کی کوئی فیملی ہے یا نہیں، اس کا کوئی رشتہ دار ہے یا نہیں، ہم لوگ نہیں جانتے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی اور اپنی فیملی کے متعلق بات کرنا پسند نہیں کرتا تو مجھے معلوم کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ یہاں پر شاید ہی کوئی اس کی فیملی وغیرہ کے متعلق کچھ جانتا ہو۔ ہمارے لیے یہی کافی ہے کہ وہ عمر ہے۔ کئی معصوم دلوں کی آس اور امید، کئی بجھتی ہوئی آنکھوں کی روشنی، کئی سادہ لبوں کی مسکراہٹ۔ اس کے ماضی سے، اس کے خاندان سے، اس کے حسب نسب اور کنبے سے ہمارا کیا واسطہ ہے۔''

ابامیاں نے میرے تجسس کو اپنے سنجیدہ و مدبرانہ جواب سے قائل کرنا چاہا۔ میں نے پھر اس حوالے سے مزید کوئی سوال ان سے نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

کل کے ابر آلود اور بے تحاشا سرد موسم کے بعد آج مطلع بالکل صاف تھا اور سردی بھی ایسی تھی جسے سویٹر کے اوپر گرم شال لپیٹ کر اور پیروں میں موزے پہن کر انجوائے کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ صبح دس بجے اپنا لکھنے کا ساز و سامان لیے میں اپنے پسندیدہ پرسکون گوشے میں چلی آئی اس جگہ کو کسی بھی مصنف کے لکھنے کے لئے آئیڈیل جگہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ یہاں فطری حسن جا بجا بکھرا ہوا تھا۔ سرو قامت سرسبز و شادات درخت، ہری بھری گھاس، ڈھیر سارے جنگلی پھول، تاحد نگاہ پھیلی ہریالی، پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں کی بھینی بھینی دلفریب مہک اور سب سے بڑھ کر سکون اور خاموشی، لیکن میں اسی پرسکون ماحول میں پچھلے ایک گھنٹے سے قلم منہ میں دبائے بیٹھی تھی۔ ایک گھنٹے میں فقط ایک ہی سطر لکھی تھی اور اسے بھی لکھ کر کاٹ دیا تھا۔

لکھنے سے بیزاری کی جس مستقل کیفیت کا میں شکار ہو رہی تھی، اس سے چھٹکارا کیسے پاؤں یہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ معاً اس سناٹے میں مجھے کہیں بہت دور سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ آواز بہت ہلکی آ رہی تھی، بالکل مدھم، میں نے اس آواز کو سننے کی کوشش کی تو باتیں تو سمجھ میں نہیں آئیں مگر ایک ٹھہرا ٹھہرا نرم و شیریں لہجہ میں ضرور پہچان گئی۔ میں اپنی فائل اور قلم سنبھال کر اٹھی اور اندازوں سے اسی سمت چلنے لگی، جہاں سے یہ آواز آ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں عمر اور محبؔ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھے مجھے نظر آ گئے۔

''سپر مین کی کہانی تو ہوگئی ختم۔ اب میں تمہیں ہیلن کیلر کی کہانی سناؤں؟''

میں کچھ فاصلے پر رک کر ان دونوں کو دیکھنے لگی تھی۔ ان دونوں کی میری طرف پشت تھی۔ ''پتا ہے ہیلن کیلر کون تھی؟'' محبؔ نے نفی میں سر ہلایا تو وہ اسے ہیلن کیلر کی معذوری اور اس کے کارناموں کے متعلق سادہ آسان لفظوں میں بتانے لگے۔

''قدرت نے مجھے بہت کچھ عطا کیا اور میرے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت نہیں کہ مجھے کیا کچھ نہیں ملا۔'' کتنی خوب صورت بات کی ہے نا محبؔ! ہیلن کیلر نے، مجھے تو اس کی یہ بات بہت پسند آئی تھی۔ تمہیں کیسی لگی؟''

''آپ کو ہیلن کیلر کے بارے میں یہ سب کہاں سے پتا چلا عمر انکل؟''

ان کے سوال کے جواب میں محبؔ نے بھی سوال کیا تھا۔ اتنے دنوں میں آج میں نے پہلی بار اسے کچھ بولتے سنا۔

''کتاب پڑھ کر۔ میں نے ہیلن کیلر کی زندگی کے بارے میں کتاب پڑھی تھی۔ اچھے لوگوں کے بارے میں اچھی کتابیں پڑھو تو بہت کچھ پتا چلتا ہے۔ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی، وہ بول اور سن نہیں سکتی تھی اور ایسا اس کے ساتھ پیدائشی طور پر نہیں تھا بلکہ وہ ایک حادثے میں ان نعمتوں سے محروم ہوئی تھی۔ ذرا سوچو محبؔ! ہم تم جو پھولوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ رنگوں، بارشوں، تتلیوں، اللہ کی بنائی ہر چیز کو دیکھ سکتے ہیں مگر دیکھ کر خوش نہیں ہوتے، اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔ وہ ان سب کو نہ دیکھ سکنے کے باوجود بھی اتنی خوش رہتی تھی، اتنی مطمئن اور ان نعمتوں کے نہ ہوتے ہوئے بھی وہ دنیا میں کتنے اچھے اور غیر معمولی کام کر کے گئی ہے۔ جو لوگ اتنے اچھے ہوتے ہیں، ایسے غیر معمولی کام کرتے ہیں انہیں ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔''

اس آواز میں نرمی اور محبت گھلی ہوئی تھی۔ میں چلتے ہوئے ان دونوں کے قریب آ گئی۔ وہ اپنے اور محبؔ کے درمیان رکھے ایک شاپنگ بیگ کو کھول کر اس میں سے بہت ساری کتابیں نکال رہے تھے۔

''یہ دیکھو محبؔ! میں تمہارے لیے کتنی اچھی اچھی کتابیں لایا ہوں۔ مجھ سے کہانیاں سننے میں تمہیں اتنا مزا نہیں آئے گا جتنا خود پڑھنے میں۔''

''ان میں ہیلن کیلر کی کہانی بھی ہے؟'' محبّ نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معصومیت اور سادگی سے پوچھا۔ میں اس بچے کو اب تک کئی مرتبہ دیکھ چکی تھی۔ ہر مرتبہ یہ مجھے مایوس، رنجیدہ اور زندگی سے بیزار نظر آیا تھا مگر آج ابھی اسی لمحے میں، میں نے اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی امید کی ایک کرن دیکھی تھی۔

''ہاں ان کہانیوں میں ایک کہانی ہیلن کیلر کی بھی ہے اور بھی بہت ساری اچھی کہانیاں ہیں۔'' محبّ نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ کتابوں کا یہ تحفہ قبول کر لیا۔

''شکریہ عمر انکل!'' وہ اب اپنے دائیں بازو کی مدد سے جلدی جلدی ساری کتابیں دیکھنے لگا تھا۔ ایک ہاتھ سے کتابیں اٹھانے، انہیں کھولنے اور دیکھنے میں اسے کافی مشکل پیش آ رہی تھی اور میں دل میں دکھ محسوس کرتی یہ سوچنے لگی تھی کہ یہ اپنے باقی سارے کام کس طرح خود کرتا ہوگا؟ محبّ کی کتابیں دیکھنے میں مدد کرتے ہوئے ان کی اچانک ہی مجھ پر نگاہ پڑی۔

''زنیرہ! تم...... کیا آج بھی ہم نے تمہیں ڈسٹرب کیا ہے؟ یقین کرو، آج تو میں بہت آہستہ آواز میں بول رہا تھا بلکہ دیکھو، آج تو ہم دونوں یہاں وہاں گھومنے کے بجائے ایک جگہ سکون سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے محبّ سے کہا کہ ہمارے شہر میں ایک معروف مصنفہ آئی ہوئی ہیں اور ہمیں ان کے تخلیقی عمل کے دوران انہیں بالکل تنگ نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں بولے۔ وہ اس سے قبل ہر بار ہی میرے ساتھ خوش اخلاقی سے ملے تھے مگر آج مجھے ان کے انداز میں خوش اخلاقی کے ساتھ ساتھ گرم جوشی اور والہانہ پن بھی محسوس ہوا۔

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔ میں مشہور بھی ہو جاؤں، معروف بھی بلکہ ہوا بہار کی ہو جاؤں۔'' میں کھلکھلا کر ہنستے ہوئے محبّ کے برابر میں بیٹھ گئی۔ وہ مجھ پر ایک سرسری نظر ڈال کر دوبارہ اپنی کتابوں میں مگن ہو چکا تھا۔ وہ باہر کی شائع شدہ کتابیں کتنی مہنگی تھیں، مجھے صرف ایک نظر ڈال کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔

''ویسے میں کافی دیر سے یہاں کھڑی تھی۔ آپ دونوں آپس میں اتنے مصروف تھے کہ آپ کو میرے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔''

''ہاں واقعی مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔''

''عمر انکل! ان بکس میں تو ہیری پوٹر بھی ہے۔'' ہماری باہم گفتگو کو محبّ کی جوشیلی آواز نے منقطع کیا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور تجسس تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ دیکھی تھی اور میں ایک ٹک اس معصوم چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔

''ہاں، ان میں ہیری پوٹر بھی ہے۔ تم یہ پڑھ لو پھر میں تمہیں ہیری پوٹر سیریز کی باقی کتابیں بھی لا کر دوں گا۔'' محبّ جلدی جلدی بے صبری سے صفحے پلٹتا بے یقینی سے اس کتاب کو دیکھ رہا تھا۔ نجانے یہ کتاب پڑھ لینا اس کی کب کی خواہش تھی اور کیا خبر مرنے سے ایک دو روز قبل اس کے باپ نے اسے یہ کتاب لا کر دینے کا وعدہ بھی کر رکھا ہو۔

''محبّ! یہ اس سیریز کی پہلی کتاب ہے۔ ہیری پوٹر سیریز کی دوسری اور تیسری کتابیں میرے پاس موجود ہیں اور اتفاق سے وہ میرے

سامان کے ساتھ یہاں بھی آ گئی ہیں۔ میں تو انہیں کئی بار پڑھ چکی ہوں، اب وہ تم لے لینا۔''

میرے بے تکلفانہ اور دوستانہ انداز پر اس نے قدرے حیرت سے مجھے دیکھا پھر کچھ شرمیلے سے انداز میں سر اثبات میں ہلا دیا۔ محبّ سے ہٹ کر میری نگاہیں ان پر پڑیں تو وہ مجھے اپنی ہی طرف دیکھتے نظر آئے۔ وہ بہت گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر گمبھیر خاموشی اور گہری سنجیدگی تھی۔

''ہم دونوں تو اب واپس جانے والے تھے، تمہارا کیا ارادہ ہے؟'' مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے ایک دم ہی واپسی کا فیصلہ کیا ہے۔

''میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔'' اپنے چہرے پر مرکوز ان کی نگاہوں پر حیران ہوتے ہوئے میں نے بھی گھر واپسی کا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے محبّ کے ساتھ مل کر اس کی تمام کتابیں شاپنگ بیگ میں واپس ڈلوائیں اور پھر ہم تینوں کھڑے ہو گئے۔

''آپ کو تحفے میں کتابیں دینا اچھا لگتا ہے؟'' ہم تینوں آہستہ قدموں سے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''ہاں ویسے صرف دینا نہیں، لینا بھی اچھا لگتا ہے۔'' اپنی جیب سے چیونگم کا پیکٹ نکالتے ہنستے ہوئے بولے۔ انہوں نے مجھے اور محبّ کو چیونگم آفر کی جسے ہم دونوں نے قبول کر لیا۔

''آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟'' قطار در قطار تن کر کھڑے درختوں کے بیچ سے گزرتے کچھ دیر خاموش چلنے کے بعد میں نے ان سے یہ سوال پوچھا۔

''اکیلا......؟ نہیں بھئی! یہ میرے گرد اتنے پیارے پیارے بچے تمہیں نظر نہیں آ رہے۔ محبّ ہے اور بھی ڈھیر سارے پیارے پیارے بچے ہیں۔ میں تمہیں اکیلا کہاں سے نظر آ گیا؟'' چیونگم منہ میں ڈالتے ہوئے انہوں نے جواب دیا۔

''اتنے سارے لوگوں اور اتنی ساری محبتوں کے ہوتے کوئی اکیلا کس طرح ہو سکتا ہے؟'' وہ اپنی بات کی وضاحت میں مزید بولے۔

''ہاں خیر، آپ کی یہ بات بھی صحیح ہے۔ یوں بھی محبت جن کے ساتھ ہوتی ہے، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ محبت انہیں کبھی تنہا ہونے نہیں دیتی۔''

میری اس بات پر وہ بے ساختہ بولے۔ ''بہت اچھی بات کہی ہے تم نے۔''

''شکریہ۔ ویسے یہ بات میں نے نہیں، میرے فیورٹ رائٹر نے اپنی کتاب میں کہی ہے۔ یہ جملہ عمر حسن کا ہے۔''

''تم نے کیا کتاب حفظ کر رکھی ہے؟''

''بس کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ اپنے لکھے بہت سے جملے خود انہیں اتنی اچھی طرح یاد نہیں رہے ہوں گے جس طرح مجھے یاد ہیں۔'' میں جواباً مسکرا کر بولی۔

بات سے بات نکلتے میرا سوال اور ان کا ٹالنے والا جواب کہیں پس منظر میں جا چکا تھا مگر میں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ وہ مجھے اپنے بارے میں ہرگز کچھ نہیں بتائیں گے۔

''چلو بھئی تمہارا گھر تو آ گیا۔'' ہم لوگ گھر کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اندر آنے کی دعوت دی۔ محبّ تو خاموشی سے ہم

دونوں کو دیکھتا رہا مگر وہ اندر آنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی مصروفیات کا بتا کر اندر آنے سے معذرت کر لی اور پھر مجھے خدا حافظ کہتے آگے بڑھ گئے۔

اندر آ کر ننا سے کھڑے کھڑے دو چار باتیں کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ فائل اور قلم میز پر رکھنے کے بعد میں خود بھی رائٹنگ ٹیبل کے آگے کرسی پر بیٹھ گئی اور حیرت کی بلکہ بے تحاشا حیرت کی بات میرے ساتھ یہ ہو رہی تھی کہ میں لکھ رہی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے میں اپنے تخلیقی عمل کے دوران دلجمعی سے لکھا کرتی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میں لکھنا چاہتی تھی۔ بغیر رکے میں مسلسل لکھے جا رہی تھی اور پھر میں نے لکھنا اس وقت موقوف کیا جب ننا نے مجھے کھانے کے لیے آواز دی۔ لکھنے سے میری بے زاری، بے دلی، قنوطیت، ڈپریشن سب کچھ یک دم ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ایسا کیسے ہو گیا؟ قلم منہ میں دبا کر میں نے پل کے پل سوچا۔ اور میری سمجھ میں اس کی وجہ آ گئی تھی۔

''ابا میاں! میں سوچتی تھی کہ میں محبت، پیار، خوشیوں، خلوص اور ایثار کی باتیں کیسے لکھوں۔ یہ سب جذبے تو اس دنیا سے معدوم ہو رہے ہیں۔ انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ عراق میں انسانیت سسک رہی ہے، افغانستان میں وحشت و بربریت کا بازار گرم ہے اور خود ہمارے اپنے ملک میں؟ نہ انسان کی جان محفوظ ہے نہ عزت اور ہمارے عہد کے انسان کے گرے ہوئے ہونے کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو گی کہ ایک قدرتی آفت پر اللہ کے قہر و غضب سے پناہ مانگنے کے بجائے مجبور بے کس انسانوں کی جانوں کا سودا کریں۔ ہم یہاں سونامی سے تباہ و برباد ہو جانے والے انسانوں اور خاندانوں کا ماتم کر رہے ہیں اور وہاں ان ممالک میں اس تباہی کے ہاتھوں یتیم ہو جانے والے بچوں کی خرید و فروخت ہو رہی ہے۔

ابا میاں مجھ سے بالکل نہیں لکھا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ جو میں اپنی کہانیوں میں محبت کی، پیار کی، انسانیت کی باتیں کرتی ہوں تو اپنے ساتھ ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہوں۔ اس ظالم دنیا کی سچائی تو یہ قدم قدم پر بکھرا ظلم ہے۔

مگر آج میں نے ایک یتیم بچے کے لبوں پر مسکراہٹ آتی دیکھی، امید جگمگاتی دیکھی، وہ میری لکھی کسی کہانی کا کوئی منظر نہیں تھا ابا میاں! میرا تخیل، اس دنیا کو اچھا دیکھنے کا میرا خواب، وہ سچ تھا ابا میاں! ایک حقیقی منظر جو میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس معصوم اور بے سہارا بچے کے لبوں پر مسکراہٹ لانے والے اس شخص کو دیکھ کر میرے دل نے بے ساختہ کہا کہ یہ دنیا ابھی اتنی ناقابل قبول نہیں ہوئی ہے۔ ابھی اچھائی ختم نہیں ہوئی، اچھے لوگ ابھی بھی اسی دنیا میں ہمارے آس پاس بس رہے ہیں۔ وہ شخص کتنا مختلف ہے ابا میاں! کتنا مختلف، بغیر کسی رشتے کے، بغیر کسی لالچ کے وہ کتنے ننھے دلوں میں امید اور آس کے دیے جلا رہا ہے۔ اس بچے کی آنکھوں میں ابھرتی وہ امید، وہ آس اور اس کے لبوں پر بکھری وہ مدہم سی مسکراہٹ۔

ابا میاں! میں اس منظر کو بھول ہی نہیں پا رہی۔ میرا جی چاہ رہا ہے میں محبت کی، پیار کی، اور وفاؤں کی داستانیں لکھوں اور لکھتی ہی چلی جاؤں۔''

میں اس رات ابا میاں سے اپنے دل کی باتیں شیئر کر رہی تھی۔

''وہ ایسا ہی ہے بیٹا! ہمیں تو یہاں آئے صرف دو سال ہوئے ہیں۔ مگر وہ چمن زار کے ساتھ پچھلے پندرہ سالوں سے وابستہ ہے اور جو لوگ اسے شروع وقت سے یہاں دیکھتے آ رہے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ کتنے بے شمار بچوں کو مایوسیوں اور ناکامیوں کے اندھیروں میں گم ہونے سے اس نے بچایا ہے۔ اس کے زیر سایہ، اس کی زیر تربیت ان کے اسکول سے پڑھ کر نکلے بچوں میں سے کتنے آج اچھی اچھی ملازمتیں کر رہے ہیں، کتنے

ہیں جو پروفیشنل ڈگریز حاصل کر کے ڈاکٹرز، انجینئرز، وکیل آرکیٹیکٹس اور نجانے کیا کیا کچھ بن چکے ہیں۔''

ابا میاں بھی اس شخص کو اتنا ہی پسند کرتے تھے جتنا میں۔

پھر اس ساری رات میں لکھتی رہی، مسلسل اور متواتر نہ کوئی بیزاری نہ کوئی تھکاوٹ، فجر کی اذانوں کے وقت میں نے قلم بند کیا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر کچھ دیر یونہی آنکھیں بند کیں تو میرے ذہن میں پہلا خیال یہ آیا کہ مجھے آج ان سے ملنے کے لیے جانا چاہیے۔ مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا تھا۔ اپنی ایک بہت بڑی الجھن اور پریشانی سے میں نے انہیں کے ذریعے نجات پائی تھی۔

ابا میاں نے بتایا تھا کہ اگر اچھے بچوں کی طرح سڑک والے راستے سے جائیں تو چمن زار میں گیارہ منٹ میں پہنچتے ہیں مگر چونکہ اس وقت میرا اچھا بچہ بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے میں کودتی، پھاندتی، اونچے، نیچے، ڈھلوانی راستے پر چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی دل چاہتا ہے نا بچوں جیسی حرکتیں کرنے کو، خاص طور پر ایسی جگہ جہاں کوئی واقف کار اور کوئی شناسا بھی نہ ہو۔

میں ناشتا کرتے ہی نانا اور ابا میاں سے چمن زار کا راستہ سمجھ کر اور انہیں اپنے وہاں جانے کا بتا کر گھر سے نکل آئی تھی۔ خود کو گرنے سے بچاتی، سنبھلتی میں آخر کار وہاں پہنچ ہی گئی تھی۔ گیٹ پر کھڑے چوکیدار سے ''عمر صاحب موجود ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔'' پوچھتے ہوئے میں نے اندر قدم رکھا۔

دو قدیم طرز کی عمارتوں کے درمیان ایک وسیع گراؤنڈ تھا۔ اور اس وقت میں اسی گراؤنڈ میں کھڑی تھی۔ میں نے ان عمارتوں پر کندہ حروف پڑھے تو پتا چلا کہ میرے دائیں طرف والی عمارت اسکول ہے اور بائیں طرف والی ہوسٹل، وسیع وعریض گراؤنڈ ہر طرف سے سبزہ ہریالی میں گھرا ہوا تھا۔ کچھ دور لمبی لمبی قطاروں میں اسکول یونیفارم پہنے مجھے ڈھیر سارے بچے نظر آئے ان بچوں کے ساتھ کھڑی ایک خاتون اور ایک مرد شاید ان کے ٹیچر تھے۔ اپنے گردو پیش پر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالتی میں اب کسی سے عمر کے متعلق پوچھنا ہی چاہ رہی تھی کہ وہ مجھے اسکول والی عمارت سے باہر نکلتے نظر آئے۔ میں تیزی سے چلتے ہوئے اس طرف چلی آئی۔ انہوں نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر حیرت بھی نمودار ہوئی تھی۔

''تم یہاں؟'' میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

''جی..... ابا میاں سے چمن زار کی اتنی تعریفیں سنی تھیں کہ میرا دل چاہنے لگا اس جگہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا۔ ویسے آپ یہ پھول کیا میرے استقبال کے لیے ہی لے کر کھڑے تھے؟''

انہوں نے اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا مگر خوبصورت سا گلدستہ پکڑا ہوا تھا جو کسی بچے کے ہاتھ کا بنایا ہوا لگ رہا تھا اور میں نے شرارتی لہجے میں اسی طرف اشارہ کیا تھا۔

''ہاں..... یہ پھول تمہارے ہی استقبال کے لیے ہیں۔'' میری شرارت کو انجوائے کرتے وہ خود بھی مسکرائے اور پھول فوراً ہی میری طرف بڑھا دیے۔

''پھولوں کا بھی شکریہ اور میرا اتنا اچھا استقبال کرنے کا بھی۔'' میں نے ہنستے ہوئے وہ پھول ان سے لے لیے۔

''یہاں پر آپ لوگوں کے فنکشن کی تیاریاں ہو رہی ہیں؟'' میں نے ''یہ دیس ہمارا ہے'' جوش وخروش سے گاتے بچوں کو دیکھتے ہوئے ان سے پوچھا۔ ان کے اسکول کا سالانہ فنکشن ہونے والا تھا۔ پرسوں رات وہ اسی کا بلاوا دینے ہی ہمارے گھر آئے تھے۔

''ہاں، بچے فنکشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ آؤ تم بھی دیکھو۔'' وہ مجھے قطاروں میں کھڑے بچوں اور ان کے اساتذہ کے قریب لے آئے۔ وہاں موجود دونوں ٹیچرز سے انہوں نے میرا تعارف کروایا۔

''خیال رکھیے گا یہ رائٹر صاحبہ ہیں اور ان کا اگلا ناول یقیناً یہیں کے بارے میں ہوگا۔'' ان کے شرارتی فقرے پر دونوں ٹیچرز تو مسکرا دیے ،میں بھی ہنس پڑی تھی۔

''ہاں میں اگلا ناول یہیں کے بارے میں لکھوں گی اور میرے ناول کے ہیرو آپ ہوں گے۔ یوں بھی آپ میں ایک ہیرو بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔''

''ہیرو بننے پر مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ شوق سے بناؤ'' میری شرارت کے جواب میں ان کی برجستگی نے ہم سب ہی کو محظوظ کیا۔

کچھ دیر ہم سب توجہ سے بچوں کو دیکھتے رہے۔ قطاروں میں کھڑے ان بچوں کے بیچ مجھے محب بھی نظر آیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ سرد وسپاٹ نظروں سے میری طرف دیکھنے کے بجائے وہ کچھ شرمیلے سے انداز میں مسکرایا تھا۔

''آج محب بھی اسکول آیا ہے؟'' وہ روز اسکول کے ٹائم پر اسے لے کر گھوما پھرا کرتے تھے اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ اسکول نہیں جاتا۔

''آج وہ پہلے دن اسکول آیا ہے۔ اتنا ذہین بچہ جو اپنے اسکول کا سب سے بہترین اسٹوڈنٹ تھا، جس کے پچھلے اسکول کا ریکارڈ قابل ستائش ہے وہ اب اسکول آنے کے نام سے ہی خائف تھا۔ صرف اسکول سے ہی کیا وہ انسانوں سے یہاں تک کہ زندگی ہی سے خائف تھا۔ جانتی ہو اس کے والد ایک عام سے تنخواہ دار انسان تھا۔ مگر اپنی محدود آمدنی میں بھی وہ اسے بہترین تعلیم دلوا رہے تھے۔ 5th گریڈ میں پڑھ رہا تھا یہ، جب وہ الم ناک حادثہ ہوا۔ اس نے جس طرح آناً فاناً تھوڑی سی دیر میں اپنا سب کچھ کھودیا اس سے یہ واقعی بہت بری طرح ڈر گیا تھا۔ شکر ہے کہ محب اسکول آنے اور زندگی کی طرف پلٹنے کے لیے آمادہ ہوگیا ہے۔ کچھ وقت لگے گا اس کا یہ ڈر اور خوف بھی جاتا رہے گا۔''

بچوں اور ان کے ٹیچرز کو فنکشن کی تیاریوں میں مصروف چھوڑ کر ہم دونوں وہاں سے آگے بڑھ چکے تھے۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو کوریڈور میں چلتے ہوئے ہو رہی تھی۔

''پھر تو آج آپ بہت خوش ہوں گے؟''

''ہاں، آج میں بہت خوش ہوں۔'' وہ اپنی کوششوں اور اپنی مسلسل محنت کے رنگ لے آنے پر واقعی بہت خوش تھے۔ مگر یہ خوشی ان کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ ایسا کیوں ہے دوسروں کو خوشی دینے والے کی آنکھیں سوگوار کیوں رہا کرتی ہیں؟'' وہ ایک کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئے پھر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اندر آنے کو کہا۔ یہ یقیناً ان کا آفس تھا، وہ ایک سادہ ومختصر سے فرنیچر سے آراستہ

عام سا آفس تھا۔

''جس روز کوئی بچہ اپنے دکھوں اور محرومیوں کے ساتھ سمجھوتا کر کے نارمل زندگی گزارنے پر آمادہ ہوتا ہے، وہ دن میرے لیے بہت خوشی کا دن ہوتا ہے۔'' میں ان کی میز کے مقابل رکھی ایک کرسی پر بیٹھ چکی تھی اور وہ بھی اپنی کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔

''آپ ایک انتہائی بامقصد زندگی گزار رہے ہیں۔ خلق خدا کی خدمت کا جو جذبہ آپ کے اندر ہے، میں اس سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔'' میں نے بے حد سچائی سے ان کی تعریف کی۔

''خلق خدا کی خدمت؟'' وہ بے ساختہ ہنسے۔

''رائٹر صاحبہ! ہر چیز میں Fantasy مت ڈھونڈیں۔ جو آپ کو خلق خدا کی خدمت نظر آرہی ہے وہ میری جاب ہے اور اپنی اس جاب کی میں باقاعدہ ہر ماہ تنخواہ وصول کرتا ہوں۔ میں یہاں ایک تنخواہ دار ملازم ہوں۔ مجھے تنخواہ ہی اس بات کی ملتی ہے کہ تمام بچوں کا بہت اچھی طرح خیال رکھوں۔'' گویا میری نگاہوں میں اپنی قدر گھٹانے کو اپنی غیر معمولی خوبیوں کو کم تر ثابت کرنے کی خاطر اختیار کی گئی صاف گوئی کا مظاہرہ۔ میں خاموشی سے انہیں دیکھنے لگی تو وہ خود پر سے میری توجہ ہٹانے کو فوراً بولے۔

''تم چائے پیو گی یا کافی؟ بغیر تکلف کے بتاؤ۔ یہ میری گارنٹی ہے کہ چائے ہو یا کافی، ہو گی بہت مزے دار۔''

''کافی۔''

میں نے بھی بغیر کسی تکلف کے انہیں اپنی پسند بتائی تھی۔ وہ ''میں ابھی آیا'' کہہ کر اٹھے اور اپنے آفس سے ملحق ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں چلے گئے۔ آٹھ دس منٹوں بعد ان کی واپسی ہوئی تو ان کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ وہ کافی خود بنا کر لائے تھے۔

''میں آج یہاں آپ کا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔''

''میرا شکریہ؟ مگر کس سلسلے میں؟'' اپنا کپ اٹھاتے ہوئے انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''میں بہت ڈپریس ہو کر کراچی سے بھاگ کر یہاں آئی تھی۔ یہ بات شاید ہر کسی کے لیے بہت اہم بھی نہیں مگر میں کیا کروں؟ میں خود کو کیسے تبدیل کروں؟ میرے کزنز اور دوست کہتے ہیں میں پاگل ہوں۔ اپنے گھر کے پرسکون اور آسودہ ماحول میں بیٹھے بیٹھے مجھے عراق کا غم ستاتا ہے۔ سونامی سے مرنے والوں کے غم میں، میں دبلی ہوئی جاتی ہوں۔ نئے سال کی آمد پر میرا شہر فائرنگ اور پٹاخوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا تو میں اپنے ہی شہر کے بے حس انسانوں کی بے حسی پر کڑھ رہی تھی۔ فقط چند روز پہلے کروڑہا لوگوں کی زندگیاں اجڑی ہیں، ان کے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا ہے، وہ لوگ ہمارے بہت قریب ہی آباد تھے اور ہم جشن منا رہے ہیں۔ نئے سال کی خوشیاں دھوم دھام سے منالیں تو بسنت کا ہنگامہ جاگا۔ لاہور پتنگوں سے سج گیا۔ مصیبت ہم پر تو نہیں آئی ہم تو خیریت سے ہیں۔ جن پر آئی ہے وہ جانیں اور ان کا خدا۔ انسان اتنا بے حس کیوں ہے؟ انسان اتنا ظالم کیوں ہے؟ آپ یقین کریں ایسی باتیں مجھے بہت چبھتی ہیں، مجھے اندر تک زخمی کر دیتی ہیں۔ پھر میں جو محبت پر لکھتی ہوں، میں جس کا موضوع ہی محبت ہے سرے سے محبت ہی سے منکر ہونے لگتی ہوں، محبت مجھے جھوٹ لگنے لگتی ہے۔ ایسا ہی اب کی بار بھی ہوا تھا۔ میں لکھنا چاہتی

تھی مگر لکھ نہیں پا رہی تھی۔ میری طبیعت لکھنے کی طرف مائل ہو ہی نہیں رہی تھی۔ جب بھی میں ایسی کیفیت کا شکار ہوتی ہوں تو عمر حسن میری مدد کر دیا کرتے ہیں۔ ہر بار انہیں پڑھ کر محبت اور انسانیت پر سے اٹھتا میرا یقین پھر سے جی اٹھتا ہے میں پھر سے لکھنے لگتی ہوں۔ مگر اب کی بار عمر حسن بھی میری مدد نہیں کر پائے۔ اب کی بار ایک دوسرے عمر نے میری مدد کی ہے۔ اب کی بار آپ نے میری مدد کی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اپنی تعریفیں سننا پسند نہیں کرتے مگر میں پھر بھی آپ سے یہ ضرور کہنا چاہتی ہوں کہ آپ سے مل کر پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ جن کرداروں کو میں اپنی کہانیوں میں تخلیق کرتی ہوں، وہ میرے تخیل کا کرشمہ سہی پر حقیقت سے اتنے دور بھی نہیں۔ میرے کرداروں جیسے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں چاہے کمیاب اور نایاب ہی سہی، پر ہیں ضرور۔''

ان کی سنجیدہ نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔ وہ گم صم سے انداز میں ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہے تھے۔ میری بات ختم ہونے کے بعد بھی ان کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ ان کی وہ گہری سیاہ آنکھیں جن میں اداسیاں ڈیرا جمائے رہتی تھیں اس وقت میری نگاہوں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مجھے بالکل کھوئے کھوئے سے لگے۔ مجھے احساس ہوا کہ ان کا یہ کھویا کھویا انداز میں نے کل اور پرسوں بھی نوٹ کیا تھا۔ وہ جو مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں وہ دراصل ان کا کچھ کھویا ہوا سا انداز تھا۔

''آپ کیا سوچنے لگے؟'' میں نے ان کی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر مجھے دیکھا۔ ان کی نگاہیں مجھے ایسی لگیں جیسے ایک ہی پل میں کہیں بہت دور تک کا سفر طے کر آئی ہیں۔

''میں تمہاری بات پر غور کر رہا تھا۔ تمہاری اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ واقعی کسی بھی لکھنے والے کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ لکھنا چاہے اور لکھ نہ پائے۔ کہانیاں اس کے پاس آئیں پر لفظ کھو جائیں۔''

اب کی بار حیرت سے گم صم ہو جانے کی باری میری تھی، میں ایک ٹک حیران نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنی یہ کیفیت میں نے اپنے والدین، نانا، نانی، بھائی، بہن اور دوستوں سب سے شیئر کی تھی مگر ان میں سے کوئی ایک بھی اسے اس طرح سمجھ نہیں پایا تھا۔ کوئی ایک بھی یہ نہیں جان پایا تھا کہ یہ کیفیت ایک عذاب جیسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔

''تم کافی نہیں پی رہیں۔ اس کا مطلب ہے کافی اچھی نہیں بنی۔'' وہ ایک پل کچھ ایسا کہتے جس سے مجھے لگتا وہ پرت پرت مجھ پر کھلنے والے ہیں اور اگلے ہی پل وہ اپنے خول میں واپس بند ہو جاتے۔

''آپ نے مجھے بہت مزے دار کافی پلائی ہے اور ساتھ ہی مجھے بہت سارا وقت بھی دیا ہے۔ آپ تو بامروت انسان ہیں یہ ظاہر نہیں کریں گے کہ میں آپ کا وقت ضائع کر رہی ہوں لہٰذا مجھے خود ہی اٹھ جانا چاہیے۔'' اپنا کافی کا کپ ایک گھونٹ میں ختم کرتے ہوئے کچھ دیر قبل کے اپنے موڈ اور الجھن کو قصداً نظر انداز کر کے میں بشاشت سے بولی۔

''یہ میری مروت نہیں بلکہ مفاد پرستی ہے۔ تمہارا اگلا ناول یہاں کے بارے میں ہوگا نا وہی جس کا کہ ہیرو بھی میں ہی ہوں گا تو اس لیے اپنا جتنا اچھا امپریشن ڈال سکوں اتنا ہی اچھا ہے۔''

کچھ سیکنڈز پہلے کا کوئی تاثر اب ان کے چہرے پر نہیں تھا۔ وہ اب ایک خوش باش، زندہ دل اور شوخ انسان تھے۔ میں کرسی پر سے اٹھی تو وہ بھی مجھے رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، دروازے کے پاس آ کر مجھے ان کے دیے وہ پھول یاد آ گئے جو کافی پینے کے دوران میں نے میز پر رکھ دیے تھے۔ میں پھول میز پر سے اٹھانے کے لیے فوراً واپس مڑی۔ انہوں نے خاموشی سے مجھے پلٹتے دیکھا۔ میں پھول اٹھا کر واپس ان کے پاس آئی تو ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

''میں یہ پھول بھول گئی تھی۔'' پتا نہیں وہ کس وجہ سے مسکرا رہے تھے۔ ان کی مسکراہٹ سے الجھ کر میں نے بلاوجہ وضاحت دی۔

''مجھے پتا تھا کہ تم پھول اٹھانے گئی ہو۔ اپنے اندازوں کی درستی پر مسکرا رہا ہوں۔''

نجانے میرے متعلق انہوں نے کس کس قسم کے اندازے قائم کر رکھے تھے۔ میں خوامخواہ ہی حساس ہونے لگی۔ اسکول کی عمارت سے باہر نکل کر ہم گراؤنڈ میں پہنچ چکے تھے۔

''پتا نہیں مجھے آپ سے یہ بات کہنا چاہیے یا نہیں مگر آپ سے مل کر ہر بار مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں آپ کو پہلے سے جانتی ہوں۔ میرا مطلب ہے ایبٹ آباد آنے سے بھی پہلے سے۔ پہلی بار سے لے کر آج تک ہر بار آپ کو دیکھ کر مجھے یہی احساس ہوا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھ رکھا ہے۔ آپ کی آنکھیں مجھے اتنی جانی پہچانی سی لگتی ہیں۔ مگر میں نے آپ کو پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا اور کس حوالے سے دیکھا تھا یہ مجھے بالکل یاد نہیں آتا۔ کیا مجھے دیکھ کر آپ کو بھی یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟'' میں نے اپنے دل میں موجود یہ سوال آج کر ہی ڈالا۔

''ہاں ہوتا ہے۔'' وہ عجیب کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بھی وہ ایسے ہی لگے جیسے کہیں اور دیکھ رہے ہیں۔ ''شروع میں تو یہ احساس نہیں ہوا تھا مگر اب بڑی شدت سے ہونے لگا ہے۔'' ان کا گمبھیر لہجہ اور کھوئی ہوئی آنکھیں میری الجھن کو سلجھا رہی تھیں یا اسے مزید الجھا رہی تھیں۔

''ہم ہندو بھی نہیں ورنہ کہہ سکتے تھے کہ ضرور یہ پچھلے کسی جنم کا کوئی تعلق ہے۔ انڈین فلموں میں تو ایک گانا گا کر ہیرو ہیروئن کو پچھلے جنم کی ہر بات یاد آ جاتی ہے اب ہم کیا کریں؟''

میں نے ہکا بکا انداز میں انہیں دیکھا۔ میری سنجیدہ شکل دیکھ کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ یہ قہقہہ ایسا تھا جیسے وہ خود بھی مذاق کے موڈ میں ہیں اور میں نے جو انہیں پہلے سے پہچاننے والی بات کی ہے وہ اسے بھی مذاق ہی میں لے رہے ہیں۔

''شاید میری شکل تمہارے اسکول کے کسی ٹیچر سے ملتی ہوگی۔ بچپن میں دیکھے چہرے حافظے میں ہمیشہ کے لیے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ خیر یہ بتاؤ تم اکیلی گھر چلی جاؤ گی یا میں چوکیدار کو تمہارے ساتھ بھیجوں۔'' انہوں نے سنجیدگی سے مجھ سے پوچھا۔

''میں چلی جاؤں گی۔'' میری اتنی سنجیدہ بات کو جس طرح انہوں نے مذاق میں لیا تھا وہ مجھے بہت برا لگا تھا۔ اپنی ناگواری کو چھپاتی میں وہاں سے نکل آئی تھی۔ وہ ایسے کیوں ہیں۔ بولتے بولتے کھو جانے والے، کچھ بتاتے بتاتے چپ ہو جانے والے، ایک دم سے خود کو ہزار پردوں میں چھپا لینے والے۔

گھر کے قریب آتے آتے مجھ پر اچانک ہی اس بات کا انکشاف ہوا کہ ان کا وہ قہقہہ اور غیر سنجیدہ جواب جو مجھے بہت برا لگا تھا وہ دراصل مجھ سے اپنے اس بے ساختہ اقرار کو چھپانے کے لیے تھا ''شروع میں تو یہ احساس نہیں ہوا تھا مگر اب بڑی شدت سے ہونے لگا ہے۔'' بے خیالی اور روانی میں جو بات وہ مجھ سے کہہ گئے تھے اس کا اثر زائل کرنے کے لیے انہوں نے قصداً مذاق اڑانے والا انداز اختیار کیا تھا۔ وہ مجھ سے کیا چھپانا چاہتے تھے اور کیوں؟

میں الجھی الجھی سی گھر میں داخل ہوئی۔ باغبانی کرتی نانا، اور اسٹڈی میں بیٹھے ابا میاں سے سلام دعا کرتی میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرا موڈ اس وقت عجیب سا ہو رہا تھا۔ میں ادھر ادھر توجہ دیے بغیر سیدھی اپنے بیڈ روم کی طرف آئی۔ میرا ارادہ کچھ دیر بالکل تنہا رہنے کا تھا۔ میں بیڈ پر گرنے والے انداز میں بیٹھنے ہی لگی تھی کہ میری شال میں اٹک کر سائڈ ٹیبل پر رکھی کتاب نیچے گری ''Forever''۔ میں کارپٹ پر گری کتاب اٹھانے کے لیے جھکی۔ وہ تصویر جسے نجانے میں نے کتنی بار دیکھ رکھا تھا۔ ان گنت بار، بے شمار بار، اس چہرے کا ایک ایک نقش مجھے از بر تھا۔ چہرے پر دل آویز مسکراہٹ لیے تیس چوبیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان، بلیو جیکٹ اور سفید قمیض پہنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے۔ آنکھوں میں چمک، خوشی، امید، کچھ کر دکھانے کا عزم، یہ آنکھیں، یہ آنکھیں، میری بے دھیانی دھیان میں اور میری بے توجہی ایک دم ہی توجہ میں بدلی تھیں۔

میں اسی طرح جھکی ہوئی تھی۔ اور میری نظریں ان آنکھوں پر جمی تھیں، یہ آنکھیں، یہ آنکھیں ان میں سے اگر میں زندگی کی چمک ہٹا دوں، ان ہنستی آنکھوں میں اداسیاں بھر دوں، ان آنکھوں کے گرد بہت سی لکیریں ڈال دوں، اور سلور فریم والا ایک چشمہ لگا دوں، بڑھتی عمر کو ظاہر کرنے کے لیے لبوں کے دونوں کناروں پر لکیروں کو تھوڑا سا گہرا کر دوں، چوڑی پیشانی پر چند سلوٹیں لے آؤں، چہرے کی اس بے فکر مسکراہٹ کو دبیز سنجیدگی اور بردباری میں بدل دوں، سلیقے سے جمے، بہترین اسٹائل والے ان گھنے سیاہ بالوں کے گھنے پن کو تھوڑا سا کم کر دوں، انہیں کنپٹیوں کے پاس سے سفید کر دوں، مختصر یہ کہ اگر اس نوجوان چہرے کو ایک چالیس سال کے مرد کے چہرے میں بدل دوں، اس نوجوان چہرے کو انیس بیس سال آگے لے جاؤں پھر...... پھر...... ایک بجلی سی کوندی تھی۔ ایک جھماکا سا ہوا تھا۔ میرے خدا۔

''کسی بھی لکھنے والے کے لیے اس سے بڑا عذاب اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ لکھنا چاہے اور لکھ نہ پائے۔ کہانیاں اس کے پاس آئیں پر لفظ کھو جائیں۔''

ایک آواز تھی جو میرے بالکل قریب گونجی تھی، اس آواز میں ایک نامحسوس سا کرب چھپا تھا۔ میں ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ ناول بیڈ پر اچھالا اور پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے کمرے سے باہر نکلی۔

''ابھی تو آئی تھیں اب پھر کہاں جا رہی ہو زنیرہ؟'' یہ نانا کی آواز تھی، وہ لان میں کھڑی مجھے گیٹ کی طرف جاتے دیکھ کر دور سے چلائی تھیں۔

''میں ابھی آ رہی ہوں نانا!'' میں نے بھاگتے ہوئے بغیر مڑے انہیں جواب دیا اور گیٹ سے نکل آئی۔ میں اس کچے اور اونچے نیچے ڈھلان والے راستے پر اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔

چمن زار میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے میں وہی ٹین ایجر، امیچور سی زنیرہ عباس بن گئی ہوں وہ زنیرہ عباس جو عمر حسن کا ناول پڑھ

کر اس سے ملنے کی حسرت اپنے دل میں لیے بیٹھی تھی۔

میں کسی بھی ذہنی ناپختگی کا ثبوت نہیں دینا چاہتی تھی، مگر اچانک ملنے والی یہ خوشی ایسی تھی کہ میں میچور اور سوبر زنیرہ عباس بن ہی نہیں سکتی تھی۔

''وہ کلاس لے رہے ہیں۔'' کسی نے مجھے بتایا تھا۔ کون سی کلاس ہے اور کہاں ہے، پوچھتی میں اب اس کلاس کے دروازے پر کھڑی تھی۔

وہ بلیک بورڈ پر لکھ رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا تھا، کسی بچے نے انہیں میری طرف متوجہ کروایا تھا۔ انہوں نے گردن گھما کر دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر بے انتہا حیرت پھیلی۔ میں ابھی تو یہاں سے گئی تھی اور فقط پندرہ بیس منٹ بعد پھر ان کے سامنے جو آ کھڑی ہوئی تھی۔

چاک اور ڈسٹر ہاتھ میں لیے ہوئے ہی وہ دروازے پر آ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان تیزی سے بولی۔

''آپ عمر حسن ہیں؟ میرے فیورٹ رائٹر عمر حسن؟'' حیرت اور خوشی کی زیادتی کے سبب مجھ سے بمشکل بولا گیا۔ میرے چہرے پر اس وقت بچوں جیسی خوشی بکھری ہوئی ہوگی، یہ بات میں آئینہ دیکھے بغیر بھی جانتی تھی۔ انہوں نے ایک پل کے لیے اچنبھے سے مجھے دیکھا، ایسے جیسے میں نے کوئی بہت عجیب وغریب بات ان سے کہہ دی ہے۔

''بتایئے آپ میرے فیورٹ رائٹر عمر حسن ہی ہیں نا۔''

''ہاں...... '' مجھے اثبات میں جواب دیتے ہوئے وہ مبہم سا مسکرائے۔ ان کے چہرے پر صرف مسکراہٹ تھی۔ اور اس تصدیق کے بعد میرا حال ایسا تھا کہ خوشی سے چھلانگیں مارنا شروع کر دوں۔ میری نظریں اس چہرے پر تھیں اور میرے ذہن میں یک بارگی بہت سے جملے دستک دینے لگے تھے۔

''نفرت کیسے کی جاتی ہے آنا؟''

''محبت اس کا زادِ سفر تھی اور یہ زادِ سفر اسے بہت تھا۔''

''محبت جن کے ساتھ ہوتی ہے، وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے۔ محبت انہیں کبھی تنہا ہونے نہیں دیتی۔''

''زنیرہ! کیا ابھی تم گھر واپس جا سکتی ہو؟ میری کلاس پچیس منٹ کے بعد ختم ہو جائے گی۔ کلاس لینے کے بعد میں خود تمہارے گھر آ جاؤں گا۔'' قبل اس کے کہ میں ان سے مزید کچھ کہتی۔ انہوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''لیکن میں آپ سے......'' میں نے کہنا چاہا۔

''مجھے معلوم ہے تم مجھ سے بہت کچھ کہنا اور پوچھنا چاہتی ہو، مگر اس کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں۔ پلیز......''

میری جوش وخروش سے بھرپور تیز آواز کے سبب واقعی پوری کی پوری کلاس اپنا کام چھوڑ چھاڑ ادھر ہی متوجہ تھی۔ مجھے دل پر جبر کر کے ان کی بات ماننا پڑی۔

''آپ آئیں گے نا؟'' میں نے ان سے یقین دہانی چاہی۔ انہوں نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

''اپنی ڈائی ہارڈ فین سے ملنے تو مجھے آنا ہی پڑے گا۔ تم گھر پہنچو میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔''

''تو اتنے دنوں سے میں جس بندے سے مل رہی ہوں، اس سے متاثر ہو رہی ہوں وہ عمر حسن ہیں۔ میری پسندیدہ کتاب کے مصنف، میرے پسندیدہ ترین مصنف، اتنے دنوں سے ان سے مل رہی ہوں اور انہیں پہچان نہیں پائی۔''

میں گھر واپس جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں عمر حسن سے مل چکی ہوں۔ ایک بے یقینی تھی، ایک سرخوشی تھی۔

مگر میں انہیں پہچانتی بھی کیسے؟ میرے قریب کے اور دور کے ملا کر چار کزنز عمر نام کے تھے، یونیورسٹی کے دوستوں میں تین کا نام عمر تھا۔ یہ نام میرے کئی جاننے والوں کا تھا۔ جب یہ نام اتنا کامن ہے پھر میں اس کی مماثلت پر کیونکر چونک سکتی تھی۔ مجھے ان کا پورا نام معلوم نہیں تھا لیکن اگر معلوم ہوتا میں تب بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ یہ عمر حسن وہ والے عمر حسن ہیں۔ کہاں شہرت کی بلندیوں پر ایک ہی جست میں پہنچ جانے والا خوبرو نوجوان، جس کی کتاب ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہو اور جس کی کتاب نے دھڑا دھڑ بک کر اس کے پاس دولت کی بھی کوئی کمی نہ چھوڑی ہو، جو راتوں رات ایک Celebrity بن گیا ہو اور کہاں متوسط درجہ کی زندگی گزارتا پختہ عمر کا ایک عام سا مرد، جس کا لباس بھی عام سا ہو اور شہرت و مقبولیت تو ایک طرف رہی اسے اس کے گرد موجود لوگوں کے سوا کوئی جانتا تک نہ ہو۔

میں لان میں یہاں سے وہاں ٹہل ٹہل کر بے صبری سے ان کا انتظار کر رہی تھی۔ ٹھیک پینتیس منٹ بعد گیٹ پر بیل ہوئی تھی۔ وہ واقعی اپنے وعدے کے پکے اور وقت کے پابند تھے۔ میں تو جیسے کھڑی ہی گیٹ کے پاس تھی، ادھر بیل ہوئی ادھر میں نے گیٹ کھولا۔ میرا جوش، میری خوشی، میری بے صبری میرے چہرے سے عیاں تھی، اور میں اسے چھپانا چاہتی بھی نہیں تھی۔

''آپ واقعی عمر حسن ہیں؟ Forever آپ ہی نے لکھی تھی؟''

ایک مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے سر اقرار میں ہلا دیا تھا۔ ''آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا؟ آپ کے سامنے آپ ہی کا اتنا ذکر کرتی تھی، اتنی تعریفیں کرتی تھی اور آپ مجھے بتا ہی نہیں رہے تھے۔'' خوشی کے ساتھ ہی مجھے ان سے یہ شکوہ بھی تو تھا۔

''میرا دل چاہتا تھا زنیرہ! تم مجھے خود پہچانو۔ ایک بچکانہ سی خواہش، جسے مجھ سے ملنے کی اتنی جستجو ہے، جو مجھے اتنا پسند کرتی ہے، جو مجھے لکھنا بھول جانے والے کو شدت سے یاد دلا رہی ہے کہ میں عمر حسن کبھی لکھا بھی کرتا تھا، وہ مجھے خود پہچانے۔'' ہم لان میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔

''اور اگر میں نہ پہچان پاتی یونہی واپس چلی جاتی پھر؟'' ''پھر میں تمہارے واپس جانے سے پہلے خود تمہیں بتا دیتا۔ مگر میری بچکانہ خواہش یہی تھی کہ جو مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک آ گئی ہے وہ میرے بتائے بغیر خود مجھے پہچان بھی لے۔''

ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میری نگاہیں ان کے چہرے پر جمی تھیں اور ان کی گھاس پر۔ سرما کی نرم نرم سی دھوپ اس پل بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

''پورے پندرہ سالوں کے بعد کسی نے مجھے یاد دلایا ہے کہ میں نے کبھی کچھ لکھا بھی تھا۔ اب تو یہ بات میں خود بھول چکا تھا۔ تم نے مجھے کیسے یاد رکھا زنیرہ؟''

اس آواز میں بہت سے دکھ تھے۔ میں دکھوں کی اس آنچ کو محسوس کر سکتی تھی۔

''جو اتنا اچھا لکھے اسے کیسے بھولا جا سکتا ہے۔ آپ کے لفظوں سے میں نے روشنی پائی ہے، اور بھی نجانے کہاں کہاں آپ کے لفظوں کے شیدائی موجود ہوں گے۔ مجھ جیسے کتنے آپ کے فینز ہوں گے جو Forever سے میری ہی طرح عشق کرتے ہوں گے۔ میرے دل کی طرح آپ ان سب کے دلوں میں بھی موجود ہوں گے اور وہ سب بھی بالکل میری طرح ہی سوچتے ہوں گے کہ عمر حسن لکھتے لکھتے اچانک کہاں کھو گیا۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے زنیرہ! یقین کرو ایسا کچھ نہیں ہے۔ 'Forever' Forever (ہمیشہ) کے لیے نہیں تھی۔ میرے لفظوں میں وہ تاثیر نہیں تھی کہ چاہے میں فنا ہو جاؤں مگر وہ باقی رہ جائیں۔ مجھے لگتا تھا جب میں نہیں رہوں گا، میرے لفظ تب بھی رہیں گے۔ میری خام خیالی، میری خوش فہمی۔ میں اپنے جن لفظوں سے ہمیشگی کی توقع رکھتا تھا وہ تو چند سال بھی زندہ نہ رہ پائے۔ لوگ بھول گئے۔ 'Forever' کو لوگ بھول گئے مجھے۔ وہ مجھ سے نہیں میری تحریر سے پیار کرتے تھے۔ مگر ایک ہی تحریر سے کب تک پیار کریں؟ ہر سال لکھنے والوں کی ہزاروں کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس ہجوم میں میری وہ کتاب تو کب کی کہیں کھو چکی۔ اب تو آؤٹ آف پرنٹ ہو کر وہ بھولے بھٹکے ہی کسی لائبریری یا پرانی کتابوں کا اسٹاک رکھے کسی بک اسٹور کے کسی آخری شیلف کے کسی سب سے آخری خانے میں گرد و غبار میں اٹی پڑی ہوگی۔'' اس اداس لہجے میں بہت سے ان کہے درد چھپے ہوئے تھے۔

''لیکن آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟ پہلی ہی کتاب کے ذریعے اتنی بے مثال شہرت اور مقبولیت، اتنی پذیرائی، اس کے باوجود آپ نے دوبارہ کچھ کیوں نہیں لکھا؟ اگر آپ لکھتے رہتے تو آج دنیا کے صف اول کے مصنفین میں آپ کا شمار ہوتا۔ آپ اچانک کہاں گم ہو گئے تھے؟ میں نے انٹرنیٹ کے ذریعے آپ کو اور آپ کی مزید تحریروں کو تلاش کرنے کی اتنی کوششیں کیں پر ناکام رہی۔ ہم جنہیں بہت پسند کرتے ہیں ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم جبھی انہیں یہ بتا پائیں کہ وہ ہمیں کس قدر عزیز ہیں۔ میرا دل چاہتا تھا میں کبھی آپ سے ملوں آپ کو بتاؤں کہ آپ کی سوچ، آپ کے نظریات اور آپ کا انداز تحریر ان سب سے میں نے کیا، کیا کچھ سیکھا ہے، اور آپ سے یہ بھی کہوں کہ ''آپ نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے عمر حسن! آپ لکھیں، آپ پلیز لکھیں۔ اپنے ان تمام چاہنے والوں کے لیے جو آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر، آپ میرے ''زنیرہ عباس'' کے لیے لکھیں، میں آپ کو پڑھنا چاہتی ہوں آپ میرے لیے لکھیں عمر حسن!'' اپنے دل کی بات میں بے دھڑک کہہ گئی۔ گھاس پر جمی نظریں اٹھا کر وہ ایک ٹک مجھے دیکھنے لگے۔ بنا پلکیں جھپکائے۔ ان آنکھوں میں اتنا درد کیوں ہے، یہ ہنستی کیوں نہیں۔ وہ کون سا دکھ تھا، کون سا حادثہ، کون سا سانحہ تھا کہ وہ اپنے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی عزت، شہرت، دولت سب سے کنارہ کشی اختیار کر کے گوشہ نشینی اور گمنامی کی زندگی جی رہے تھے۔

''کہانی لکھنا حساب کا کوئی پیچیدہ فارمولا نہیں، سائنس کی کوئی مشکل تھیوری نہیں، جسے محنت اور ذہانت سے دل کی مرضی کے خلاف جبراً سلجھایا جا سکے۔ کہانی نہ جبر سے لکھی جاتی ہے، نہ محنت سے، نہ ذہانت سے۔ کہانی دل سے لکھی جاتی ہے۔ جو لفظ دل سے لکھے جاتے ہیں وہی پڑھنے

والے کے دل پر اثر بھی کرتے ہیں۔ ان گزرے برسوں میں ایسا نہیں تھا کہ میں لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں لکھنا چاہتا تھا۔ اپنے پہلے ناول سے بھی زیادہ بھرپور اور بہترین، میں نے کوشش کی۔ میں نے بہت مرتبہ کوشش کی۔ مگر میرے دل نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں گھنٹوں کی مشقت کے بعد چند سطریں لکھتا پھر جب اپنے لکھے لفظوں کو پڑھتا تو خود ہی کو یقین نہ آتا کہ یہ بے روح اور بے رنگ لفظ میں نے لکھے ہیں۔ وہ بے جان اور مردہ لفظ میرے لکھے ہوئے لگتے ہی نہیں تھے۔ گہرائی اور خوب صورتی تو ایک طرف رہی ان میں تو زندگی ہی نہیں تھی۔ کیا کرتا پھر میں سوائے اس کے کہ ان بے جان اور بے روح لفظوں سے آراستہ صفحات کو پرزے پرزے کر ڈالوں۔

آج جب تم مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ تم لکھنا چاہ رہی تھیں اور لکھ نہیں پا رہی تھیں تو میں ڈر گیا تھا۔ اللہ نہ کرے کہ تم پر زندگی میں پھر کبھی ایسا وقت آئے۔ میری دعا ہے کہ تم لکھو اور خوب لکھو۔ وہ سب کہانیاں جو تمہارے دل میں ہیں اور جنہیں تم لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہو۔ اس رات جب تم بڑے بڑے Literary Prizes حاصل کرنے کی بات کر رہی تھیں تو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مجھے تمہارے چہرے پر وہی عزم اور وہی جوش نظر آ رہا تھا جو تیئس، چوبیس سال کے عمر حسن میں ہوا کرتا تھا۔ تمہاری عمر میں، میں تمہارے ہی جیسے خواب دیکھا کرتا تھا۔"

ان کے لہجے میں ٹوٹ کر بکھر جانے والے خوابوں کی کرچیاں تھیں، درد، آہیں اور آنسو تھے، مگر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا بھی رہے تھے۔

"مگر آپ کو آپ کے خوابوں کی تعبیر مل تو رہی تھی۔ عزت، شہرت، پذیرائی، آپ خود ہی یوں ان من چاہی تعبیروں سے کنارہ کش ہو گئے؟ یہ گوشہ نشینی، یہ گم نامی اور یہ بن باس آخر کیوں؟"

وہ لب بھینچے خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے تو میں بے اختیار مدھم آواز میں ایک سوال ان سے پوچھ بیٹھی۔

"وہ کون تھا جس کی وجہ سے آپ نے لکھنا چھوڑ دیا؟" میری اس جرأت پر وہ مجھ سے ناراض ہو سکتے تھے مگر میں پھر بھی بہادری سے ان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے صرف ایک پل کے لیے میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں دکھ تھا، غصہ تھا یا ناراضی میں سمجھ نہیں پائی مگر جس طرح اگلے ہی پل وہ کرسی پر سے اٹھے اور مجھے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر "میں چلتا ہوں" کہہ کر گیٹ کی طرف بڑھے اس سے مجھے یہی اندازہ ہوا کہ وہ میری جرأت پر ناراض اور خفا ہو کر جا رہے ہیں۔ مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا، میں تیزی سے اٹھ کر ان کے پیچھے آئی مگر وہ مجھ سے بھی تیزی سے گیٹ سے باہر نکل چکے تھے۔

☆☆☆

ابا میاں اور رنا کو انہوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہا اور پھر مجھ پر نظر ڈالی۔ مجھے لگا تھا وہ مجھے سرے سے نظر انداز کر دیں گے مگر چہرے پر ایک اچھے میزبان جیسی مسکراہٹ لاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دیا۔ میں یہاں بہت ڈرتے اور جھجکتے ہوئے آئی تھی۔ پرسوں دوپہر سے لے کر کل کا پورا دن اور آج صبح تک میں خود سے خفا ہو رہی تھی۔ اور اب میں ابا میاں اور رنا کے ساتھ چمن زار میں موجود تھی۔ ان کے اسکول کے سالانہ فنکشن میں، میں یہاں آنا بھی چاہتی تھی اور آتے ہوئے جھجک بھی رہی تھی کہ اگر انہوں نے مجھ سے پہلے جیسی خوش اخلاقی، گرم جوش اپنائیت سے بات نہ کی، مجھے بالکل نظر انداز کر دیا پھر؟ مگر ان کا رویہ میرے ساتھ نارمل تھا۔

ابا میاں اور ثنا کے برابر بیٹھی میں، اسٹیج پر مختلف نغمے، ڈرامے، ٹیبلوز، تقریریں اور فینسی ڈریس شو کا مظاہرہ کرتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ عمر حسن بہت متحرک یہاں وہاں گھومتے، مہمانوں کو ریسیو کرتے، ان کی نشستوں اور تقریب کے دیگر انتظامات وغیرہ کا دھیان رکھتے نظر آ رہے تھے۔ چمن زار کے مالکان اس تقریب میں شرکت کی غرض سے ان دنوں خاص طور پر یہاں آئے ہوئے تھے اور تقریب کے اختتام پر رفریشمنٹ کے دوران ابا میاں ان ہی میں سے کسی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھے جبکہ ثنا اپنی واقف کار مختلف خواتین سے مل رہی تھیں۔ میں پلیٹ ہاتھ میں لیے ایک طرف اکیلی کھڑی تھی کہ میرا واقف کار یہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

''تم خالی پلیٹ لے کر کیوں کھڑی ہو؟''

وہ اس وقت تقریب میں شریک ڈھیر سارے مہمانوں کے ساتھ بے تحاشا مصروف تھے اس مصروفیت میں انہیں پتا نہیں میرا دھیان کس طرح آ گیا تھا۔

''میں لے رہی ہوں، آپ فکر مت کریں۔'' میں جواباً مسکرائی تو تھی مگر کچھ ہچکچائے ہوئے انداز میں۔

''تم آئی ہو مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں الگ سے انوائٹ کرنا بھول گیا ہوں پتا نہیں تم آؤ گی یا نہیں۔'' وہ بالکل اسی طرح بات کر رہے تھے ان کے لہجے میں کہیں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔

''اور میں سوچ رہی تھی کہ شریک ہوں یا نہیں۔''

''کیوں بھئی یہ سوچ بچار کیوں؟'' میرے جواب پر انہوں نے فوراً پوچھا۔

''مجھے لگا تھا آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے آپ سے ایک پرسنل پوچھ لیا تھا جو شاید آپ کو اچھا نہیں لگا تھا۔ بس اس لیے میں آتے ہوئے ڈر رہی تھی۔''

''تم سے ناراض؟ ہرگز نہیں بھئی۔''

''پھر آپ اس طرح اٹھ کر۔'' میرا فقرہ ادھورا ہی رہ گیا تھا کہ انہوں نے میری بات بے ساختہ کاٹ دی۔

''وہ کوئی اور بات تھی زنیرہ! میں نہ تم سے ناراض ہو کر اٹھا تھا اور نہ ہی مجھے تمہاری کوئی بات بری لگی تھی۔''

وہ مجھ سے خفا نہیں ہیں ایک دم ہی پرسکون اور مطمئن ہو گئی۔ میں ان سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وہ اس وقت اتنے مصروف تھے کہ مزید میرے پاس کھڑے نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر طرف سے انہیں پکارا جا رہا تھا، ہر طرف ان ہی سے مخاطب ہوا جا رہا تھا۔ سو وہ کسی بھی ایک جگہ مستقل کھڑے نہیں تھے۔

''کل اپنی مخصوص جگہ پر لکھنے آؤ گی؟'' انہوں نے آگے بڑھتے ہوئے مجھ سے جلدی سے پوچھا۔ میں نے سر اثبات میں ہلایا تو وہ بولے۔

''ٹھیک ہے پھر، باقی باتیں کل وہیں پر ہوں گی۔'' اپنے باقی مہمانوں میں مصروف ہو چکے تھے۔

☆☆☆

صبح میں بہت جلدی اپنی پسندیدہ جگہ پر آ گئی تھی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے انہیں اس درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھے دیکھا جس سے ٹیک لگا کر میں بیٹھتی اور لکھتی تھی۔ وہ صبح آٹھ سے بھی کچھ پہلے یہاں نہ صرف موجود تھے بلکہ ان کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کافی دیر سے یہاں بیٹھے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھے ہوئے تھے مگر جیسے ہی میرے قدموں کی آواز ان کی سماعت تک پہنچی انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔

''میں سوچ رہا تھا تم نو، دس بجے سے پہلے نہیں آؤ گی۔'' میں ان سے کچھ دور گھاس پر بیٹھ چکی تھی۔ کل کی تقریب پر کچھ دیر ان کے ساتھ باتیں کرتے رہنے کے بعد میں نے اچانک ہی موضوع بدل دیا۔ ''کل آپ نے کہا تھا آپ مجھ سے ناراض نہیں۔''

''ہاں میں نے یہی کہا تھا۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم چاہتی ہو کہ اگر میں تم سے ناراض نہیں تو پھر تمہارے سوال کا جواب دوں۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ جواباً بولے۔ ''وہ کون تھا جس کی وجہ سے میں نے لکھنا چھوڑا؟''

کئی سیکنڈز بعد میں نے ان کی آواز سنی۔ کسی گہری سوچ میں گم وہ میرا سوال دوہرا رہے تھے۔

''یہ سوال تو بہت بعد کی بات ہے پہلے یہ پوچھو وہ کون تھا جس کی وجہ سے میں نے لکھنا شروع کیا۔''

میں بالکل خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''پتا ہے زنیرہ! میں اس روز تمہارے گھر سے اچانک چلا کیوں گیا تھا؟ تم سے ناراض ہو کر نہیں تمہاری باتوں سے الجھ کر۔ جانتی ہو زنیرہ! جو جملے تم نے مجھ سے کہے وہی برسوں پہلے کسی نے مجھ سے کہے تھے۔''

''تم لکھنا مت چھوڑو عمر تم لکھو، پلیز لکھو، کسی اور کے لیے نہ سہی تم میرے لیے لکھو۔ میں تمہیں پڑھنا چاہتی ہوں، تم میرے لیے لکھو۔'' ان ہی لفظوں نے سالوں پہلے مجھ سے میرا پہلا اور آخری ناول لکھوایا تھا۔ تم وہ نہیں، پر باتیں بالکل اسی جیسی کرتی ہو، تمہارا لہجہ، تمہارا انداز، تمہاری باتیں ہو بہو اسی کی طرح ہیں، میں اس مماثلت کو کیا نام دوں زنیرہ؟ میں حیران ہوں کہ تم اس جیسی کیسے ہو؟ تمہاری شکل اس سے بالکل مختلف ہے۔ مگر تمہاری عادتیں، تمہاری باتیں بالکل اسی جیسی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی، دوسروں کے احساسات کی پروا کرنے والی ایک لڑکی، جو میز پر رکھے چند معمولی سے پھول اٹھانا بھی اس لیے یاد رکھے کہ وہ معمولی چیز کسی کا دیا ہوا تحفہ تھی جو کبھی بھولے سے بھی کسی کے احساسات کو ہرٹ نہ کرتی ہو۔ دنیا میں اتنا ظلم کیوں ہے، ناانصافی کیوں ہے، طاقت ور کمزور کو کچل کیوں رہا ہے، ان باتوں پر کڑھنے والی جس کی کھانے پینے تک کی عادتیں اس کے جیسی ہیں۔ جسے اسی کی طرح چیز بہت پسند ہے، جسے سلاد کے پیالے میں سے سلاد کے پتے بالکل اسی کے انداز میں چننے کی عادت ہے۔

سب سے بڑھ کر تم بالکل اس کی طرح مجھے میری خوبیاں بتاتی ہو۔ میری تعریفیں یوں کرتی ہو گویا میں اس دنیا کا سب سے بہترین انسان ہوں، دوسروں سے بہت بہتر، دوسروں سے بہت الگ بلکہ سب سے الگ، سب سے مختلف، سب سے اچھا۔''

''وہ کون تھی؟''

میری آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

''ہاں میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ کون تھی۔ حالانکہ میری عقل، میرا شعور مجھے ایسا کرنے سے روک رہے ہیں۔ چار دن کی ملاقات میں کوئی کسی کے سامنے اپنی ذات کھول کر نہیں رکھ دیتا۔ مگر میرا دل، میرے عقل و شعور پر حاوی ہو رہا ہے۔'' ان کی آنکھیں مجھ پر تھیں مگر وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ آج میں جانتی تھی کہ وہ کہاں دیکھ رہے ہیں۔

''میں نے آنکھ کھولی تو خود کو ایک یتیم خانے میں پایا۔ میں کون تھا؟ کس کا بیٹا تھا؟ میرے ماں باپ کون تھے؟ میرا خاندان، قبیلہ، نسب کیا تھا؟ یہ سب میں کبھی نہ جان پایا۔ میری پہچان، میری شناخت، میری جڑیں، میرا اصل کہاں تھا، کیا تھا، ان سوالوں کے جواب ہی کسی انسان کی شخصیت کی بنیاد مضبوط کیا کرتے ہیں اور میری تو بنیادیں ہی اکھڑی ہوئی تھیں۔ بہت جاننے کی خواہش میں اگر کبھی کچھ پتا چل سکا تو بس اتنا کہ ایک نیک اور خدا ترس شخص مجھے روتے، تڑپتے اور بیمار بچے کو ایک روز یتیم خانے میں اس وقت داخل کرا گیا تھا جب ابھی میں فقط ایک دو ماہ کا تھا۔ وہ شخص کون تھا، اس کا مجھ سے کوئی رشتہ تھا یا نہیں یہ بھی مجھے کوئی بتانے والا نہیں تھا۔

یتیم خانے ہی میں کسی نے مجھ بے نام بچے کا نام عمر حسن رکھ دیا تھا۔ بے نام و نشان ہونا کوئی آسان بات نہیں میرے کوئی ماں، باپ نہیں، میرا کوئی خاندان نہیں، میری کوئی پہچان نہیں، میری کوئی شناخت نہیں، اس احساس نے زندگی کے ہر موڑ پر مجھے لہولہان کیا۔ وہ دو لوگ جو ہماری زندگی میں سب سے اہم ہوتے ہیں، ہمارے والدین، میں نہ ان کا نام جانتا تھا نہ نشان۔''

وہ بول رہے تھے اور میں سن رہی تھی۔ میری نظریں ان کے چہرے پر جمی تھیں اور دور کہیں پہاڑوں سے اس پار کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ کھوئی کھوئی اداس آنکھیں جو ماضی کی دھند میں گم ہو رہی تھیں۔ وہ ان یادوں کو پھر سے یاد کر رہی تھیں جنہیں وہ شاید کبھی بھولی ہی نہ تھیں۔ عمر حسن یادوں کے سفر پر نکلے تھے اور اس سفر میں، میں ان کی ہم سفر تھی۔ وہ کتنے گھنٹے بولتے رہے اور میں کتنے گھنٹے سنتی رہی اس کا کوئی احساس ہی نہ ہو سکا تھا، اور مجھے تو یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ جہاں جہاں وہ مسکرائے میں بھی مسکرائی تھی، جہاں جہاں وہ ہنسے میں بھی ہنسی تھی، جہاں ان کا لہجہ بوجھل ہوا آواز بھرائی وہاں میری آنکھوں کی سطح بھی نم ہوئی تھی۔

''بس اتنی سی ہے میری داستان جسے سننے کو تم اتنی بے چین تھیں۔ اس میں غیر معمولی کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک عام سے شخص کی ایک عام سی کہانی ہے۔''

کئی گھنٹوں تک بولنے کے بعد جب وہ خاموش ہوئے تو پھر بہت دیر تک خاموش رہے میں نے ان کے ساتھ ان کے ماضی کا پورا سفر طے کیا تھا اور اب جب ہم اس سفر سے لوٹے تو وہ اپنے آپ میں یوں گم ہوئے جیسے انہیں یہ یاد ہی نہ رہا ہو کہ ان کے برابر میں کوئی اور بھی بیٹھا ہے۔ جیسے ماضی کے سفر سے صرف میں لوٹی ہوں وہ ابھی بھی ماضی ہی کے کسی پل میں کھڑے ہیں۔ صرف ان کا جسم یہاں ہے اور ان کی روح، ان کا دل، ان کا دماغ، ان کی سوچیں، سب کہیں اور ہیں۔ مجھے ان کے چہرے پر بکھرا کرب ان کی آنکھوں میں ٹھہرا درد ہمیشہ سے کہیں سوا نظر آیا۔ مگر پھر وہ عمر حسن تھے، عمر حسن جنہیں دکھوں کو چھپا کر مسکرانا آتا تھا۔ انہیں تھوڑی ہی دیر میں میری موجودگی کا دھیان آ گیا تھا اور تب ہی انہوں نے سادے سے

لہجے میں یہ بات مجھ سے کہی تھی۔

میں ان سے کچھ بھی نہ کہہ سکی، کچھ بھی، میرے پاس کہنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ کوئی ہمدردی، کوئی دلاسا، کوئی تسلی کچھ بھی نہیں۔ کبھی کبھی لفظ اتنے بے قیمت اور بے توقیر نظر آتے ہیں کہ ان کے استعمال سے کہیں بہتر خاموشی ہوا کرتی ہے۔

''چلیں۔'' انہوں نے آہستگی سے مجھ سے پوچھا۔ وہ مجھے بہت تھکے ہوئے اور بڑے نڈھال لگ رہے تھے۔ میں گردن ہلاتی فوراً کھڑی ہوگئی۔ وہ مجھے گھر تک چھوڑنے آئے اور اس دوران ہم دونوں بالکل خاموش رہے تھے۔ یوں جیسے ہم دونوں ہی کے پاس کہنے سننے کو اب کچھ ہے ہی نہیں۔ گیٹ کے سامنے آکر ہم دونوں رکے تو وہ دھیمے لہجے میں مجھ سے بولے۔

''کسی کو اپنی زندگی کے پوشیدہ گوشے دکھا کر یہ کہنا کہ ''دیکھو میں نے تم پر اعتبار کیا ہے۔ میرے اعتبار کو ٹوٹنے نہ دینا۔'' اس کی توہین اور تذلیل کرنے کے مترادف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان یا تو کسی پر اعتبار کرے نہیں اور اگر کرے تو پھر پورا اعتبار کرے۔ یہ کچھ اعتبار اور کچھ بے اعتباری والی کیفیت دونوں فریقوں کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔''

وہ مجھ سے کیا کہنا چاہ رہے تھے، میں سمجھتی تھی۔ وہ در پردہ مجھ سے یہ وعدہ لے رہے تھے کہ انہوں نے مجھ پر اعتبار کیا ہے مجھے ان کا مان رکھنا ہے۔

میرے جواب سے پہلے ہی انہوں نے مجھے خدا حافظ کہا اور فوراً وہاں سے واپس پلٹ گئے۔

☆☆☆

سلگتے چہرے

ضوبار یہ ساحر کے جذبات نگار قلم سے ایک خوبصورت ناول..... اُن سُلگتے چہروں کی کہانی جن کی رتجگی آنکھوں میں انتظار کا عذاب لودے رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی داستانِ حیات جسے اپنے خوابوں کو کچل کر میدانِ عمل میں آنا پڑا۔ اس کے نرم نازک جذبوں پر فرض کا ناگ پھن کاڑھے بیٹھا تھا۔ اس لئے محبت کو جانچنے پرکھنے کے فن سے وہ ناواقف تھی۔ لیکن اس سب کے باوجود دل کے ویرانے میں کہیں ہلکی ہلکی آنچ دیتا محبت کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ وہ جو سائے کی طرح قدم قدم اسکے ساتھ رہا اس پر بیتنے والی ہر اذیت کو اُس نے بھوگا۔ وہ ادھوری لڑکی اُسے جاننے اور پہچاننے کی کوشش میں لگی رہی۔ مگر وہ عکس کبھی پیکر بن کر اسکے سامنے نہیں آیا اور جب وہ سامنے آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی؟؟

یہ ایک خاص شخص کی خاص کہانی ہے۔ یہ کہانی اس شخص کی ہے جس کے خوابوں اور جس کی خواہشات کی ابتدا بھی محبت تھی اور انتہا بھی محبت۔ لوگ زندگی سے اپنے لیے بہت کچھ چاہتے ہیں بہت کچھ مانگتے ہیں، وہ صرف محبت مانگتا تھا۔ وہ زندگی سے صرف محبت چاہتا تھا۔ اسے محبت کے سوا کبھی کسی سے کوئی تمنا ہی نہ کی تھی۔ مگر زندگی کی تنگ دامنی دیکھیے کہ جو ایک چیز وہ اس سے چاہتا تھا وہی ایک چیز اسے دیتے ہی زندگی کا دامن تنگ پڑ گیا تھا۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ محبتیں نہ چاہتیں، نہ خوشیاں، خوشیوں نے ہمیشہ دور دور سے اپنی جھلک دکھائی تھی، اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلی تھی اور محبت، اس نے اتنی آسانی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔

انسان جب اس دنیا میں آنکھیں کھولے اور یہ جانے کہ وہ تنہا ہے، اکیلا ہے، لاوارث اور بے سہارا ہے، بے نام ونشان تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ اس کا اصل، اس کی شناخت، اس کا حوالہ کیا ہے کہاں ہے؟ کوئی ایک عورت تو ہوگی جو اس کی ماں ہوگی جس نے بڑی تکلیفیں سہہ کر اسے جنم دیا ہوگا کوئی ایک مرد تو ہوگا جو اس کا باپ ہوگا جس نے اس کے دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا ہوگا۔ اس کے کانوں میں اذان دی ہوگی۔ وہ ایک عورت اور وہ ایک مرد وہ کہاں تھے؟ کہیں تھے بھی یا نہیں؟ وہ ان سے بچھڑ گیا تھا، ان سے کھو گیا تھا یا انہوں نے اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے اسے یہاں چھوڑ دیا تھا۔

وہ زندگی کے بہت برس تک کبھی طے ہی نہ کر پایا کہ وہ ان دو انسانوں سے محبت کرے یا نفرت۔ انہیں مظلوم اور بے بس سمجھے یا ظالم اور سنگ دل۔ اس کے ماں اور باپ کسی حادثے کا شکار ہو کر مر گئے تھے اور اس لاوارث و بے سہارا ایک یا دو، ماہ کے بچے کو کوئی خدا ترس اس یتیم خانے میں چھوڑ گیا تھا۔ اس کے ماں اور باپ بہت غریب تھے وہ اس کا بوجھ اٹھا سکنے کے قابل نہیں تھے غربت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے خود اسے یتیم خانے میں داخل کرا دیا تھا۔

وہ اس دنیا میں ان چاہا آیا تھا کسی گناہ کی جیتی جاگتی نشانی کے طور پر، اور گناہوں کو تمغوں کی طرح سینوں پر نہیں سجایا جاتا انہیں خود سے دور ہٹا دیا جاتا ہے، انہیں سب سے چھپا کر کہیں پھینک دیا جاتا ہے۔

اپنی سوچیں ممکنہ وجوہات میں سے وہ تیسری وجہ کو کبھی لاشعور سے شعور کی طرف لایا ہی نہیں۔ بہت عمر گزارنے کے بعد بھی اس نے تیسری وجہ سے کبھی نظریں نہ ملائیں۔ اسے اپنی وجوہات کی فہرست سے ہمیشہ خارج کیے رکھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو سر اٹھا کر کبھی کھڑا ہی نہ ہو پاتا۔ خود اپنے آپ سے بھی کبھی نظریں نہ ملا پاتا۔

اس نے یتیم خانے میں آنکھیں کھولی تھیں اور اسی کو اپنا مقدر جانا تھا۔ چار سال کی عمر تک تو وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یتیم خانے کی دنیا سے باہر جو دنیا ہے وہاں ہر بچے کا ایک گھر ہوتا ہے، ایک ماں باپ ہوتے ہیں، ماں، باپ، بھائی، بہن، گھر، خوشیاں، محبتیں یہ سب...... اسے ان بچوں کی باتیں سن سن کر پتا چلا جو تھوڑی بڑی عمر کے تھے۔ جنہوں نے باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کا ذائقہ چکھ رکھا تھا، جن سے ان کے ماں، باپ اور ان کے گھر کسی حادثے نے چھین کر انہیں یہاں پہنچا دیا تھا۔ اس کے بھی تو کوئی ماں، باپ ہوں گے، اس کا بھی تو کوئی گھر ہوگا پھر کہاں تھے وہ ماں، باپ؟ کہاں تھا وہ گھر؟

جب اس کے ان سوالوں کے جواب اسے کہیں نہ مل سکے تو سات سال کی عمر میں اس نے ایک عجیب سی حرکت شروع کی۔ اپنا ایک تصوراتی جہاں آباد کرلیا۔ ماں اور باپ کے تصوراتی خاکے بنا لیے۔ اس کی امی ایسی ہوں گی اور ابو ایسے امی کی آنکھیں ایسی ہوں گی اور ابا کے بال ایسے ہوں گے۔ وہ کہانیاں بننے لگا۔ اپنی من پسند دنیا اور من پسند زندگی کی کہانیاں۔ بچپن کی بے خبری سے کچھ کچھ آگاہی کی طرف جاتے وہ آگاہی کے جس تکلیف دہ احساسات سے دوچار ہو رہا تھا ان سے فرار حاصل کرنے کے لیے یہ کہانیاں اس کی مدد کیا کرتیں۔

اس کی تخلیق کردہ وہ دنیا بڑی حسین تھی۔ خوشیوں سے بھری اک دنیا، محبتوں سے بھری ایک زندگی پیار بھرا ایک گھر۔ اس کی ہر کہانی کا مرکزی خیال ایک ہی ہوتا۔ ''عمر حسن کو اس کے امی، ابو بہت پیار کرتے ہیں، وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔'' کہانی ہر بار الگ ہوتی مگر اس کا مرکزی خیال ہمیشہ یہی رہتا اور مرکزی کردار بھی یہی تین، عمر حسن، اس کی امی اور اس کے ابو، اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ رات میں جب سب سو جاتے ہیں تب وہ بستر پر لیٹ کر کیا سوچا کرتا ہے، کہاں پہنچ جایا کرتا ہے۔ وہ روز رات میں اپنی مرضی کے مناظر تخلیق کرتا اور پھر انہیں کو سوچتے نہ جانے کب اسے نیند آجاتی۔ اپنی اس تصوراتی دنیا میں اسے بڑا مزا آتا، بڑا سکون ملتا۔ دن بھر اسے کس کس نے کیا کیا کہا، کتنے برے لفظ بولے، مسرور سر نے اسے گالی دے کر بات کیوں کی، ماسٹر صاحب نے بغیر خطا کے اتنی بری طرح کیوں مارا یہ کہانیاں دن بھر کی ہر ذلت، ہر چھوٹ ہر تکلیف اور ہر دکھ کو بھلا دیتیں۔ دن کی کوئی بات اسے رات میں یاد ہی نہ رہتی۔

وہ اپنی اس خیالی دنیا میں بہت خوش رہنے لگا۔ اس کا تخیل اتنا مضبوط تھا کہ وہ جو منظر چاہتا اسے پورا تخلیق کرتا گویا وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ وہ اگر تصور میں اپنی امی کو اپنے لیے پراٹھا پکاتا دیکھتا تو اس کا ذائقہ تک اپنے منہ میں محسوس کرلیا کرتا۔ وہ ان کہانیوں کو تخلیق کرنے میں اتنا ماہر ہو چکا تھا کہ جس وقت اداس ہو رہا ہوتا، خود کو اکیلا سمجھ رہا ہوتا خود بخود اپنی مرضی اور اپنی پسند کا ایک ماحول ذہن میں ڈھال لیتا۔

مگر پھر ایک رات یوں ہوا کہ عمر حسن سے اس کے امی ابو بہت پیار کرتے ہیں اور وہ ان دونوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہ رہا ہے اس سے آگے بڑھ کر اس نے اپنی کہانی کا اختتام کرنا چاہا۔ کہانی جتنی خوشگوار تھی اس کا انجام اتنا ہی دردناک، ایک جہاز کریش ہوا تھا۔ زمین پر ہر طرف اس کا ملبا بکھرا ہوا تھا وہاں لاشیں تھیں۔ خون تھا، انسانی اعضا تھے، ان لاشوں میں ایک لاش اس کی امی اور ایک اس کے ابو کی بھی تھی اور وہ ان دونوں لاشوں کے پاس زخمی پڑا رو رہا تھا۔ اور پھر اگلے منظر میں اس نے خود کو یتیم خانے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کھڑے پایا۔ یہ کیسا انجام تھا، وہ ساری رات روتا رہا۔

اگلی رات اس نے پھر ایک نئی کہانی بنانی شروع کی ویسی ہی خوشگوار، ہنستی مسکراتی، قہقہوں اور خوشیوں سے بھری مگر آج ایک گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس کے امی، ابو گاڑی سمیت ایک گہری کھائی میں گر گئے تھے اور وہ پتھریلی زمین پر زخمی حالت میں بلک بلک کر رو رہا تھا۔ کہانی کے اگلے منظر میں، آخری منظر میں وہ یتیم خانے کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ ڈر گیا تھا، خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کی کہانیوں نے اسے سچائیاں دکھانی شروع کر دی تھیں۔ کبھی جہاز، کبھی ٹرین، کبھی گاڑی، کبھی اسکوٹر، کبھی بس، وہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا دیکھتا کبھی گھر کو آگ لگتا دیکھتا، کبھی چاقوؤں کے وار یا گولیوں کی بوچھاڑ سے ماں باپ کو مرتا اور آخری منظر میں خود کو اسی یتیم خانے میں اس جگہ جھڑکیاں کھاتا، ماریں کھاتا، تنہا اور لاوارث دیکھتا۔ تب اس کی اتنی عمر ہی نہ تھی کہ وہ ماں باپ کے اپنے پاس نہ ہونے کی کوئی اور تکلیف دہ وجہ سوچ پاتا۔ وہ وجہ جو بہت ذلت آمیز تھی۔ وہ

جو دوسری ہر وجہ سے بڑھ کر اذیت ناک تھی۔ مگر اسے تو یہ وجہ ہی ساری رات رلانے کے لیے کافی ہوا کرتی۔ جیسے ہی کہانی اپنے اختتام کی طرف آتی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہو جاتے۔ پھر وہ روتے روتے ہی سوتا اور سوتے میں بھی ڈراؤنے خواب، خون لاشیں اور حادثے ہی دیکھتا۔ اس کی کہانیاں جو اسے ایک خیالی دنیا میں لے جا کر کتنے ہی سنہرے اور دلکش خواب دکھایا کرتی تھیں اب سچائیوں کی جھلک دکھانے لگی تھیں اسے اپنی کہانیوں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس نے انہیں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ کہانیاں شروع میں بہت خوش کرتی ہیں مگر آخر میں رلاتی ہیں بہت زیادہ رلاتی ہیں۔ وہ اب انہیں کبھی نہیں سوچے گا۔ وہ اب خود کوئی کہانی نہیں بنے گا۔ وہ اب کبھی کوئی کہانی نہیں سوچے گا۔" اور یوں اس کی تخلیق کردہ وہ تصوراتی دنیا اپنی موت آپ مرگئی۔"

لکھتے لکھتے میں نے سر اٹھا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔

گھر واپس آنے کے بعد میں چند منٹ ہی ابا میاں کے ساتھ بیٹھی تھی اور پھر ان سے یہ کہتی کہ میں کمرے میں لکھنے جا رہی ہوں میں اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اندر آتے ہی جوتے اتارے اور دوپٹہ ایک طرف ڈالتے ہوئے رائٹنگ ٹیبل پر آگئی۔ اس میز پر سب سے نمایاں چیز میرے ناول کا مسودہ تھا۔ میں نے ان سب کو جلدی جلدی یکجا کیا۔ ساڑھے نو سو صفحات کو اکٹھا کرنے کے بعد میں نے انہیں بڑی حفاظت سے ایک بڑے سے لفافے میں رکھا۔ اس لفافے کو بند کیا اور احتیاط سے اپنے بیگ میں واپس رکھ دیا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں دوبارہ رائٹنگ ٹیبل کے قریب آئی۔ کرسی کھینچ کر میز کے سامنے بیٹھی۔ فائل میں نئے صفحات لگائے، قلم ہاتھ میں لیا اور لکھنا شروع کر دیا۔

میں کیا لکھنے جا رہی تھی میں جانتی تھی۔ مجھے کیا لکھنا تھا میں جانتی تھی، میری تھیم، میرا پلاٹ سب میرے ذہن میں بالکل واضح تھے۔ میرے ہاتھ میں قلم تھا، میرے سامنے خالی صفحے تھے اور میری سماعتوں میں ایک اداس لہجہ جو اپنی یادوں کے اس سفر میں مجھے اپنے ساتھ ساتھ لیے جا رہا تھا۔ جو کچھ انہوں نے مجھ سے کہا تھا وہ سب ابھی میری سماعتوں میں بالکل تازہ تھا۔ میں ان لفظوں کو جیسے انہیں کی آواز میں ایک بار پھر بغور سن رہی تھی۔ جو مجھے لکھنا تھا وہ میرا قلم لکھ رہا تھا مگر میری سماعتوں میں بازگشت ایک مدہم آواز کی تھی۔

☆☆☆

"میری کہانیاں مجھ سے چھن چکی تھیں۔ میں تلخ حقیقتوں اور کڑوی سچائیوں کے ساتھ سمجھوتا کر چکا تھا۔ یہی جگہ میرا نصیب تھی، میرے کوئی ماں باپ اور کوئی گھر نہیں تھا اور یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی تھی۔ اسی جگہ پر آنکھ کھولنے کے باوجود میں نجانے سب سے اتنا مختلف کیوں تھا۔ ایسے جیسے ایک انجان سیارے کی اجنبی سرزمین پر ایک Alien جو باتیں دوسرے بچوں کو بری نہیں لگتی تھیں وہ پتا نہیں مجھے کیوں بری لگا کرتی تھیں۔ میرا کوئی دوست نہیں تھا۔ اگرچہ دوست بنانے کی شدید خواہش میرے دل میں موجود تھی مگر جس سے بھی دوستی کرنا چاہتا اسے میرے مزاج سے، میری عادتوں سے اکتاہٹ ہوتی، کوفت ہوتی اور وہ چند دنوں ہی میں مجھے چھوڑ جاتا۔ مجھ سے بڑی عمر کے بہت سے لڑکے طنزیہ انداز میں مجھے نواب صاحب اور شہزادہ عالم کہا کرتے۔

ایک یتیم خانے میں پرورش پانے والے کے یہ اونچے دماغ، یہ غرور، یہ انا، جو انہیں غرور، انا اور دماغ نظر آتا وہ سب میری عادتیں تھیں میری فطرت تھی میں اپنی فطرت کیونکر بدلتا۔ وہاں بہت سے بے اولاد امیر بچوں کو گود میں لینے کے لیے آتے تھے تو بہت سے امیر اور صاحب حیثیت افراد بچوں میں اپنے صدقات اور خیرات تقسیم کرنے کے لیے۔ میں ان دونوں طرح کے آنے والے لوگوں سے چھپا کرتا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کی طرح سج سنور کر اپنی نمائش کروانا، قطار میں لگ کر بڑی آس اور امید سے آنے والے میاں بیوی کی طرف دیکھنا، شاید میں گود لے لیا جاؤں شاید میں منتخب کر لیا جاؤں ہمیشہ ذلت آمیز لگتا۔

مجھے دوسرے بچوں کی طرح پھلوں، مٹھائیوں، جوتوں، کپڑوں، کھلونوں کو بانٹنے والے افراد کی طرف امید سے دیکھنا، اپنی باری کا انتظار کرنا ایسا لگتا جیسے میں ایک فقیر ہوں۔ میں ایسا کیوں تھا۔ جس جگہ پرورش پا رہا تھا اس جگہ سے الگ کیوں تھا شاید میرے مختلف ہونے کا سبب وہ دو افراد تھے جو مجھے اس دنیا میں لانے کے ذمہ دار تھے میرے ماں، باپ، شاید ان دونوں میں سے کوئی ایک ایسی ہی عادتوں کا مالک رہا ہوگا۔ عزت نفس اور خودداری کو دوسری ہر چیز پر فوقیت دینے والا۔

پھر وہاں وہ آئے۔ سعادت علی خان، میرے ابا میاں، مجھ بے سہارا کو انہوں نے سہارا دیا۔ مجھ بے گھر کو انہوں نے گھر دیا، مجھ یتیم کو انہوں نے باپ کا سا پیار دیا۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں صرف ان کی وجہ سے ہوں۔ آج جب میں محب یا اس جیسے کسی بھی بچے کو اپناتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے۔ جیسے میں ابا میاں کی محبت کا حق ادا کرنے کی حقیر سی کوشش کر رہا ہوں۔ زنیرہ جو تمہیں میری نیکی، میرا حسن سلوک اور خدمت خلق نظر آتا ہے یقین کرو وہ کچھ بھی نہیں، اس میں غیر معمولی کچھ بھی نہیں۔ غیر معمولی حسن سلوک غیر معمولی محبت، غیر معمولی اپنا پن وہ تھا جو ابا میاں نے مجھے دیا۔ مجھ پرائے کو انہوں نے اپنایا، اسے اپنا بنایا، کبھی غیر ہونے کا احساس تک نہ دلایا۔ ان کے احسانات اور ان کی محبتوں کا بدلہ میں کبھی نہیں چکا سکتا مگر کچھ بے سہاروں کو سہارا دے کر، کچھ اپنوں سے بچھڑوں کو اپنا بنا کے میں ان کی اچھائیوں کو آگے تو بڑھا سکتا ہوں۔

وہ بڑے قابل انسان تھے۔ بہت بڑے محقق اور نقاد۔ انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرنے کے علاوہ کئی برسوں تک وہاں پڑھایا بھی تھا۔ اردو، فارسی، انگریزی اور روسی ادب پر تحقیق اور تنقید ان کے خاص موضوعات تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے، وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ کتابوں سے انہیں عشق تھا۔ لکھنا اور پڑھنا ان کی زندگی کا محور و مقصد تھا۔ مختلف ملکی و غیر ملکی اخبارات و میگزینز میں ان کے علمی و تحقیقی مضامین و مقالے شائع ہوا کرتے تھے۔

وہ ان دنوں اندرون سندھ اپنی کسی کتاب کی ریسرچ ہی کی خاطر آئے ہوئے تھے۔ انہیں یقیناً یتیم اور لاوارث بچوں سے بہت ہمدردی تھی تب ہی تو اپنی ریسرچ کی مصروفیات سے وقت نکال کر وہ اکثر ہمارے یتیم خانے میں بھی آ جایا کرتے تھے۔ کسی دن وہ بچوں کے لیے پھل لے آتے تو کسی دن مٹھائیاں، کسی دن کہانیوں کی کتابیں تو کسی دن کھلونے، کسی دن جوتے تو کسی دن کپڑے۔

میں ہمیشہ کی طرح کہیں چھپ جایا کرتا تھا۔ مجھ سے چھوٹے، میرے ہم عمر اور مجھ سے بڑے تمام بچے چھین جھپٹ کر ایک دوسرے کو دھکے دے کر سب سے آگے بڑھ کر ان اشیاء کو حاصل کرنے کی کوششیں کرتے اور میں سب کی نگاہوں سے چھپے رہنے کی۔ میرے ساتھی للچائی اور

حریص نگاہوں سے ان چیزوں کو دیکھتے ایک دوسرے کو دھکیلتے آگے بھاگتے اور میں سب سے پیچھے ہٹتا، کسی کونے میں چھپ جاتا۔ مگر پھر ایک روز انہوں نے مجھے دیکھ لیا۔ بچے بے صبری اور ندیدے پن سے ان پر ٹوٹ پڑے...... تھے۔ اس چھینا جھپٹی اور شور وغل سے نمٹتے ان کی مجھ چھپ کر بیٹھے بچے پر نگاہ نہ جانے کس طرح پڑ گئی تھی...... مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ میں دیکھا جا چکا ہوں۔ انہوں نے سب بچوں کو فارغ کیا اور پھر یتیم کے اس درخت کے پاس آ گئے جس کے پیچھے میں اپنے تئیں چھپ کر بیٹھا تھا۔

"بیٹا! کیا نام ہے تمہارا؟" میرا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ سہمے اور گھبرائے ہوئے لہجے میں، میں بمشکل انہیں اپنا نام بتا پایا۔ مجھ میں جرأت کی، حوصلے کی، اعتماد کی شدید کمی تھی۔

"عمر بیٹا! کیا تمہیں کھلونے اچھے نہیں لگتے؟" انہوں نے میرے پاس بیٹھنے کے بعد شفقت اور محبت سے پوچھا۔ میں نہ گردن اقرار میں ہلا سکا اور نہ انکار میں۔ بس چپ چاپ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ انہوں نے اس شور ہنگامے اور افراتفری میں مجھے دیکھا نہیں ہوگا مگر وہ تو شروع وقت سے مجھے دیکھ چکے تھے بلکہ شاید اپنے یہاں آنے کے شروع دن سے انہوں نے مجھے اپنی نظروں کے احاطے میں رکھا ہوا تھا۔ جن چیزوں کو لینے سے بچنا چاہتا تھا وہ اب یقیناً وہ سب چیزیں مجھے دینے والے تھے۔

میں سر جھکا کر ڈرا سہما بیٹھا تھا۔ میں ان سے کیسے کہوں کہ میں یہ کھلونے نہیں لینا چاہتا۔ مجھے اس طرح کسی سے چیز لینا اچھا نہیں لگتا۔ اور اگر کہنے کی ہمت رکھتا ہوتا اور کہہ دیتا تو وہ یقیناً قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے۔ استہزائیہ اور تمسخرانہ انداز میں۔ یتیم خانے کا پروردہ ایک لاوارث بچہ یہ کہے کہ اسے صدقہ نہیں چاہیے، بھیک نہیں چاہیے؟ "عمر تم بہت پیارے بچے ہو۔" انہوں نے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے مجھ پر زور نہیں ڈالا اور خود ہی موضوع بدل دیا۔ میں ان کے منہ سے اپنی تعریف سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ میری نو سالہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی نے مجھے پیارا کہا تھا۔ مجھ سے پیار اور شفقت سے بات کی تھی۔ میں نے ہمدردی، ترس، رحم، نفرت، حقارت، تضحیک، تحقیر، ہمیشہ ان ہی طرح کی نگاہوں کو خود پر پڑتے دیکھا تھا۔ مگر یہ نگاہیں ان تمام تاثرات سے عاری تھیں۔ ان کی آنکھیں اور ان کا لہجہ اب تک ملے ہر انسان سے مختلف تھا۔ ان میں نہ ترس تھا نہ تحقیر ان میں صرف اور صرف محبت تھی۔ شفقت اور اپنا پن تھا۔ وہ مجھ سے لایعنی قسم کی غیر متعلقہ گفتگو کرنے لگے تھے۔ مثلاً آج کل موسم کیسا ہے، پاکستان کی ہاکی ٹیم کی کارکردگی، لاڑکانہ کے امرود، وہ مجھے جواب دینے کے لیے مجبور نہیں کر رہے تھے بس خود ہی بولے جا رہے تھے۔ میرا کانپنا اور سہمنا بتدریج کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا تھا۔

انہوں نے پھل، مٹھائی، کھلونے، اپنے پاس موجود کوئی سوغات مجھے نہیں دی تھی تو پھر آخر وہ میرے پاس آئے کیوں تھے۔ کیا موسم، ہاکی ٹیم اور امرودوں پر تبادلہ خیال کرنے؟ میری نہ اتنی عمر تھی نہ تجربہ کہ لوگوں کے رویوں کو پہچان سکوں مگر پھر بھی مجھے ایسا لگا جیسے وہ میری اندرونی کیفیات کو سمجھ گئے تھے، جیسے وہ جان گئے تھے کہ یتیم خانے میں پلنے بڑھنے والا ایک لاوارث بچہ بھی انا، عزت، نفس اور خودداری رکھ سکتا ہے۔ میں لوگوں کے سامنے آنے سے ہمیشہ بچتا اور چھپتا تھا۔ میں رد کر دیا جاؤں گا، ٹھکرا دیا جاؤں گا۔ رد ہونے کا خوف اتنا شدید ہوتا تھا کہ میں خود میں لوگوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پاتا ہی نہیں تھا۔ مگر انہیں نجانے میری کیا بات اچھی لگی تھی جو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ ایک گھنٹے

تک میرے ساتھ اکیلے ہی باتیں کرتے رہنے کے بعد انہوں نے بڑے پیار سے مجھ سے پوچھا۔

''عمر! تم میرے بیٹے بنو گے؟'' میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے، حیران پریشان ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں کراچی میں رہتا ہوں۔ تم میرے ساتھ گھر چلو گے میرے بیٹے بن کر؟''

اتنے سارے خوب صورت صحت منداور پیارے پیارے بچوں میں سے انہوں نے مجھ معمولی سے بچے کو چنا تھا۔ مجھ میں ایسا تو کچھ بھی نہیں تھا اور جو انہیں غیر معمولی لگا۔ یہاں آنے والے دوسرے لوگ سب سے خوب صورت، صحت منداور بہت چھوٹی عمر کے بچوں کو گود لینا پسند کرتے تھے جبکہ میں بالکل سوکھا کمزور سا تھا اور عمر بھی میری نو سال سے کچھ ہی کم تھی۔ میں کسی لحاظ سے پسند کیے جانے کے لائق نہیں تھا۔ میں ڈرا، سہا، خوفزدہ اور ہراساں ان کے برابر ان کی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ میرے ساتھی لڑکے مجھ پر رشک کر رہے تھے اور میں خوف و ہراس میں ڈوبا یہ سوچ رہا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں، یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں، میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے، تب خود نہیں جانتا تھا کہ اگر میں اپنے ساتھیوں سے مختلف پیدا کیا گیا ہوں تو اللہ مجھے وہ مختلف ماحول بھی فراہم کر دینے والا ہے جہاں میری بہترین نشوونما اور تربیت ہوگی۔ لاڑکانہ سے کراچی تک کا سفر میری نئی زندگی کا آغاز تھا۔ کتاب زیست کا یہ نیا باب میرے تصور سے بھی مختلف تھی۔ اس نے میری زندگی یکسر بدل کر رکھ دی تھی۔ دوران سفر وہ مجھے اپنے گھر کے افراد سے غائبانہ متعارف کروا چکے تھے۔ اسی لیے جب میں ان کے ساتھ ان کے عالیشان گھر میں داخل ہوا تو لان میں بیٹھ کر چائے پیتے خوبرو مرد اور حسین عورت کے متعلق یہ جانتا تھا کہ یہ ان کا بیٹا اور بہو ہیں اور نیلے رنگ کا فراک پہنے، بالوں کی دو پونیاں بنا کر ان میں نیلے ہی رنگ کے ربن لگائے وہ میری جیسی عمر کی لڑکی ان کی پوتی۔ وہ تیز تیز جھولا جھول رہی تھی اپنے دادا کو گاڑی اترتا دیکھ کر وہ جھولے سے اتری اور ''ابا میاں آ گئے'' کہہ کر بھاگتی ہوئی ہمارے قریب آ گئی تھی۔

''السلام علیکم ابا میاں۔''

''عمر بیٹا یہ ودیعہ ہے اور ودیعہ یہ عمر حسن ہے میرا بیٹا اور اب یہ ہمارے ہی ساتھ رہا کرے گا۔''

اس کے سلام کو جواب دینے کے بعد انہوں نے فوراً اس سے میرا تعارف کروایا۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی مگر اس نے مزید پوچھا کچھ بھی نہیں تھا۔ جس طرح انہوں نے اپنی پوتی سے میرا تعارف کروایا تھا اسی طرح بیٹے اور بہو سے بھی کروایا۔

''یہ میرا بیٹا ہے اور یہ اب ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔''

ان دونوں نے مجھے دیکھ کر نہ کسی خوشگواری کا اظہار کیا اور نہ ناگواری کا۔ میرا ہونا یا نہ ہونا جیسے ان کے لیے کسی اہمیت کا حامل نہیں تھا۔ اور اگر انہیں اپنے گھر میں میری آمد پر کسی قسم کی ناگواری محسوس ہوئی بھی تھی تب بھی وہ اعتراض کا حق نہیں رکھتے تھے۔ اس گھر کا سربراہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لایا تھا اور وہ ان کے بیٹے، بہو نے میرے سلام کا جواب دینے کے بعد مزید مجھ سے کچھ بات نہ کی تھی مگر وہ خود ہی انہیں میرے متعلق اچھی اچھی باتیں بتا رہے تھے۔

''عمر بڑا ذہین بچہ ہے۔ بہت سمجھدار، اب یہ یہیں رہے گا۔ میں اسے کسی اچھے سے اسکول میں داخل کراؤں گا۔''

کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ملازم سے میرے لیے کمرہ ٹھیک کروایا اور پھر خود لے کر مجھے میرے کمرے میں آ گئے۔

"خود کو کبھی غیر یا پرایا مت سمجھنا۔ میں نے تمہیں بیٹا بنایا ہے تو یہاں کی ہر چیز بالکل اسی طرح تمہاری ہے جیسی میری، کمال، نائلہ اور ودلیعہ کی۔"

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ جب آنکھ کھلے گی تو ہر منظر وہی پرانا منظر ہوگا۔ وہی ٹوٹی پھوٹی خستہ عمارت، وہی جھڑکیاں، وہی گالیاں، وہی لاوارثی، وہی اکیلا پن۔

ان کے اپنائیت کے احساس دلانے کے باوجود میرے لیے انہیں اپنا مان لینا مشکل ثابت ہو رہا تھا اور اس مشکل سے کہیں زیادہ مشکل اس گھر کو اپنا گھر سمجھنا تھا۔ خود اعتمادی سے محروم، ڈرا سہما، بزدل، عمر حسن اس گھر کے مالکوں کو تو کیا، ملازموں تک کو خود سے بالاتر کوئی اونچی مخلوق سمجھا کرتا تھا۔ کھانے کی میز پر بیٹھ کر میں چند لقمے لینے سے زیادہ کچھ اس لیے نہیں کھاتا تھا کہ وہ سب کیا سوچیں گے میں کتنا بھوکا اور ندیدہ ہوں۔ مجھے زندگی میں شاید کبھی اچھا کھانا ملا ہی نہیں۔ گو سچ یہی تھا مگر میں سر جھکا کر بیٹھا اپنے سامنے رکھے باؤل...... میں سے تھوڑا سا کھانا ڈالتا یہ دیکھے بغیر کہ یہ کون سی ڈش ہے اور میز پر اس کے علاوہ اور کیا کیا موجود ہے۔ وہ بڑے اصرار اور شفقت سے مختلف ڈشز میرے سامنے رکھتے مگر میں پھر کسی اور چیز کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔

انہوں نے اپنے ساتھ لے جا کر مجھے ڈھیر سارے کپڑے، جوتے اور ضرورت کا سارا سامان دلوایا تھا۔ مجھے ان سے وہ سب چیزیں لیتے شرم آ رہی تھی اور وہ "عمر بیٹا یہ بھی لے لو، عمر بیٹا وہ بھی لے لو" کہہ کہہ کر مجھے خریداری کروائے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر لانے کے اگلے ہی دن سے اسکول میں داخلے کے لیے مجھے تیاری کروانی شروع کر دی تھی۔ نیا تعلیمی سال شروع ہونے میں ابھی چند ماہ باقی تھے اور ان چند ماہ میں وہ مجھے اس قابل بنا دینا چاہتے تھے کہ جس اسکول میں وہ چاہتے ہیں وہاں میرا داخلہ ہو سکے۔ وہ لکھنے اور پڑھانے میں اپنا سارا وقت گزارا کرتے تھے ان کے میل ملاقاتی بے شمار تھے۔

دن بھر میں نجانے کتنے ہی لوگ ان سے ملنے آیا کرتے۔ ان آنے والوں میں اکثریت اہل قلم ہی کی ہوا کرتی۔ بعض ان کے ہم عصر، ان کے دوست تو بعض نو آموز ان سے اپنے کام پر اصلاح لیتے رائے مانگتے، مشورہ طلب کرتے، اردو، انگریزی، روسی اور فارسی ادب پر ان کی تحقیق اور تنقید کا ایک عالم معترف تھا سو تعریفوں اور ستائشوں کے شوقین بہت سے شعراء اور ادباء اپنی کتابوں کے دیباچے، پیش لفظ اور تبصرے ان سے لکھوانے کو باقاعدہ ان کی خوشامد کرنے آتے۔ بہت سے نامی گرامی مصنفین اپنے مسودے نظر ثانی کے لیے ان کے سپرد کر کے جاتے دن بھر ان کے ملاقاتیوں کی آمد جاری رہا کرتی۔ ان کے وہ تمام ملنے جلنے والے ان کے گھر میں ایک نئے فرد کے اضافے کی بابت استفسار کرتے تو وہ۔

"یہ عمر ہے۔ میرا بہت پیارا بیٹا۔"

اتنی قطعیت سے کہتے کہ پوچھنے والا مزید کوئی سوال کرنے کی جرأت کر ہی نہ پاتا۔ وہ کہتے تھے کہ تحقیق کرنا اور لکھنا ان کا عشق ہے اور پڑھنا ان کا جنون انہیں اپنے کام سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ عشق اور جنون کا یہ سلسلہ صرف انہی تک محدود نہ تھا ان کے بیٹے اور بہو جنہیں ان کی ہدایت پر میں انکل آنٹی کہنے لگا تھا وہ بھی اپنے کام سے عشق کرتے تھے۔ اگرچہ ان کا شعبہ بالکل مختلف تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی بہت قابل ڈاکٹرز

تھے بہت سنجیدہ پروفیشنلز اپنے پروفیشن سے ان دونوں کو جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ یہ پوری فیملی اپنے کام سے عشق کرنے والوں کی تھی۔ یہ لوگ اپنے کام کو اپنی زندگی سمجھتے تھے۔ اپنا پورا وقت اور ساری توانائیاں اس پر صرف کرتے تھے۔

ابامیاں کہتے تھے کہ ان میں اور ان کے بیٹے بہو میں یہ فرق ہے کہ اپنے کام سے عشق کے باوجود انہوں نے اولاد کی تعلیم و تربیت پر بھی بہت توجہ دی تھی۔ اپنی فیملی کو پورا وقت دیا تھا جبکہ وہ دونوں یہ دیکھ کر مطمئن ہوتے کہ قابل اور لائق فائق دادا تو موجود ہیں پوتی کی تعلیم و تربیت اچھی طرح کرلیں گے سو اپنی بیٹی کو اور گھر کو دیا جانے والا وقت بھی وہ دونوں اپنے کام کو دے دیا کرتے تھے۔ وہ دونوں گھر پر بہت کم رہتے تھے۔

ابامیاں کہتے تھے کہ ودیعہ کی پرورش ابتدا ہی سے انہوں نے کی ہے کہ اس کی پیدائش سے پہلے اور بعد میں آنٹی اپنی پوسٹ گریجویشن میں مصروف رہی تھیں، اور پھر اس کے بعد اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں میں، اسی لیے وہ اپنے ماں، باپ سے زیادہ اپنے دادا کے قریب تھی۔ وہ انہیں ابا میاں کہتی تھی وہ تو جیسے اس کے دوست تھے۔ ان سے اپنی ہر بات، ہر مسئلہ جب تک وہ شیئر نہ کرلیتی اسے چین نہ ملتا۔ وہ بھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ ان کی بہت لاڈلی تھی۔ اسے پالا ہی انہوں نے تھا۔ اپنے ماں، باپ سے اس کا تعلق اتنا گہرا نہیں تھا جتنا ان سے۔ تم میں اور اس میں ایک اور مشترک بات جس طرح تم اپنے نانا کو ابا میاں کہتی ہو انہیں اپنا بہترین دوست سمجھتی ہو ایسے ہی وہ بھی اپنے دادا سے بے انتہا قریب تھی۔ وہ بھی انہیں ابامیاں کہتی تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش سب انہی کی زیرنگرانی ہورہی تھی۔ وہ اسے دیا کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ان کے رکھے اتنے پیارے نام ودیعہ پر اختصار ودیعہ نے خود کیا تھا۔

دو ڈھائی سال کی عمر میں جب وہ صاف بول نہیں پاتی تھی تو اپنا نام ودیعہ کی بجائے دیا لیا کرتی۔ تب سے وہ بھی اسے دیا کہنے لگے تھے۔ آنٹی، انکل صبح کے گئے رات گئے گھر آتے اور آنے کے بعد سوائے سونے کے ان میں کسی چیز کی سکت نہ ہوتی۔ گھر پر سارا وقت ہم تین لوگ ہوا کرتے یا پھر ملازمین۔ جس وقت ابامیاں اپنی اسٹڈی میں لکھنے یا پڑھنے میں مصروف ہوتے، میری سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کروں۔ اسکول میں داخلے کی تیاری کے لیے جو کچھ وہ مجھے پڑھنے لکھنے اور یاد کرنے کو دیتے میں وہ سب یاد کرلیتا اور اس کے بعد اپنے کمرے کی دیواروں کو خاموشی سے تکا کرتا۔ ان کا کام چونکہ تحقیقی نوعیت کا تھا تو محنت اور توجہ بھی زیادہ درکار تھی۔ وہ نوجوانوں سے بھی زیادہ چاق و چوبند اور محنت کے شائق تھے مگر اپنی اس محنت اور کاموں کے دوران بھی وہ ودیعہ اور مجھ سے غافل نہیں رہتے تھے۔

اس روز جب میں اسٹڈی میں ان کے پاس سے پڑھ کر اٹھ رہا تھا تب ودیعہ ان سے کوئی بات کرنے آئی۔

''تمہاری بات کا جواب میں بعد میں دوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے ابھی تک عمر سے دوستی کیوں نہیں کی؟ ویسے تو بہت شکوے شکایت کیا کرتی تھیں کہ ابامیاں آپ اپنے کاموں میں بزی رہتے ہیں اور ممی پاپا اپنے کاموں میں۔ میں گھر پر اکیلی بور ہوجاتی ہوں۔ اور اب جب اکیلی نہیں ہو، عمر یہاں پر موجود ہے تو اسے اکیلا بور ہونے کے لیے چھوڑ رکھا ہے۔''

انہوں نے جیسے اسے سرزنش کی، اس کی کوتاہی کا احساس دلایا۔ ''عمر بات ہی نہیں کرتا۔ پھر میں کیا کروں؟'' اس نے جھٹ اپنی صفائی پیش کی۔

''یہ بات نہیں کرتا تو کیا تم نے بات کرنے کی کوشش کی؟''اس کی دلیل کے جواب میں ان کی حجت تیار تھی۔

اس بار وہ اپنی صفائی میں کچھ نہ بولی۔اس نے شرمندگی سے خاموش رہ کر گویا اپنی کوتاہی تسلیم کر لی تھی۔مگر میں جانتا تھا ودیعہ غلط نہیں۔غلط میں ہوں۔اب تک کی زندگی میں، میں کوئی ایک دوست بھی نہ بنا سکا تھا، کوئی ایک بھی۔اگر میں کسی سے دوستی نہیں کر پاتا تھا تو کوئی مجھ سے دوستی کرنے کا خواہش مند بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔قصور اس لڑکی کا نہیں میرا تھا۔ساری دنیا غلط نہیں ہو سکتی۔کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کمی تو مجھ ہی میں تھی۔مگر جب ہم دونوں آگے پیچھے اسٹڈی سے باہر نکلے تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئی۔

''آؤ عمر! میں تمہیں اپنا روم دکھاؤں۔''میں بغیر کسی خواہش و دلچسپی کے زبردستی اس کے کمرے میں آ گیا۔

اس کا کمرہ ہر سائز کی گڑیوں، ٹیڈی بیئرز اور دوسرے کھلونوں سے بھرا ہوا تھا۔رائٹنگ ٹیبل کے برابر میں ایک بک شیلف تھا اور وہ سنڈریلا اور سلیپنگ بیوٹی سے شروع ہو کر ہر طرح کی اسٹوری بکس سے بھرا ہوا تھا۔وہ تھوڑی دیر سوچتی رہی کہ میرے ساتھ کیا کھیلے۔وہ یقیناً یہی سوچ رہی تھی کہ ایک لڑکا اس کے ساتھ اس کی گڑیوں سے تو کھیل نہیں سکتا، پھر وہ اپنی الماری سے نکال کر چاکلیٹس کا ایک بھرا ہوا ڈبہ لے آئی۔ امپورٹڈ کیا میں نے لوکل چاکلیٹس بھی زندگی میں کبھی نہ کھائی تھیں مگر اس کے آگے بڑھائے ڈبے کی طرف میں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''ابا میاں بتا رہے تھے وہ تمہارا ایڈمشن میرے اسکول میں کروائیں گے ہم دونوں ساتھ اسکول جائیں گے۔کتنا مزا آئے گا ناں عمر؟''

وہ اپنی سمجھ کے مطابق اپنے دادا کی ہدایت پر عمل کرتی بات سے بات نکالنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں نظریں نیچے کیے صرف جواب طلب باتوں پر اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔یہاں آنے کے بعد میری کم اعتمادی اور احساس محرومی احساس کمتری میں تبدیل ہو گئی تھی۔وہ اب مجھ سے دوستی کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی مگر میں خود میں اتنا اعتماد پاتا ہی نہیں تھا کہ اس کا دوستی کا بڑھا ہاتھ تھام سکوں۔

میں داخلہ ٹیسٹ بہت اچھا تو نہیں دے سکا تھا مگر ابا میاں کی کوششوں سے مجھے ودیعہ ہی کے اسکول میں داخلہ مل گیا تھا۔ہم دونوں ایک ہی گریڈ میں تھے۔وہ سات سال کی تھی یعنی مجھ سے تقریباً دو سال چھوٹی وہ اپنی عمر کے لحاظ سے پڑھائی میں آگے تھی اور میں اپنی عمر کے لحاظ سے کچھ پیچھے۔آنٹی انکل کو یہ بات کتنی بری لگی ہو گی کہ کہیں سے اٹھا کر لایا ایک لاوارث اور یتیم لڑکا ان کی لاڈلی بیٹی کے برابری کرے، شہر کے اسی بہترین اسکول میں پڑھے جس میں وہ پڑھتی ہے، میں نہیں جانتا۔ان دونوں نے بظاہر کسی ناگواری یا ناپسندیدگی کا اظہار کیا بھی نہیں تھا۔

مگر میں جانتا تھا کہ آنٹی کو یہ بات زیادہ اچھی نہیں لگی تھی۔وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذب خاتون تھیں اپنی زبان یا رویے سے انہوں نے کچھ ظاہر نہ کیا مگر میں بہت کم عمری میں لوگوں کی آنکھیں پڑھ لیا کرتا تھا۔

☆☆☆

اسکول کا پہلا دن تھا۔ڈرائیور ہم دونوں کو اسکول چھوڑ گیا تھا۔سارے راستے خوف سے میری بری حالت رہی تھی۔گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ودیعہ کو اپنے کئی دوست نظر آنے لگے۔یہ اب کیا کہے گی اپنی دوستوں سے میرے بارے میں؟ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ میری ہتھیلیاں پسینے سے تر تھیں۔

''یہ عمر ہے، بھئی، میرا کزن۔'' اس نے اپنے دوستوں سے میرا یہ تعارف یقیناً ابا میاں کے سمجھانے پر کروایا تھا۔ انہوں نے ہی اسے یہ سمجھا کر بھیجا تھا کہ وہ مجھے کزن کہہ کر اپنے دوستوں سے ملوائے مگر وہ اسکول ہمارے ساتھ تو نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے دوستوں سے جو چاہتی کہہ کر میرا تعارف کرواسکتی تھی۔

''یہ عمر ہے، ابا میاں کی Orphanage سے اٹھا کر اسے ہمارے گھر لے آئے ہیں۔''

وہ جس طرح چاہتی اپنے دوستوں کے درمیان میری تضحیک کر سکتی تھی مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میرا خوف سے کانپتا، سہمتا دل اس تعارف کے بعد یکلخت ہی مطمئن ہوگیا تھا۔ اس کے سب دوستوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اپنا اپنا تعارف کروایا۔ مجھے لگا اب وہ مجھے چھوڑ کر اپنے دوستوں میں مگن ہو جائے گی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر ہماری کلاس میں آ گئی۔ ابھی اسکول لگنے میں کچھ دیر تھی اور اس دوران وہ مجھے ہمارے مختلف ٹیچرز اور کلاس فیلوز سے متعارف کروانے لگی۔ وہ کلاس کی ہر دل عزیز ترین طالبہ ہے اس کا اندازہ مجھے اس ایک دن ہی میں ہوگیا تھا۔

وہ پوری کلاس میں سب سے نمایاں اور تمام ٹیچرز کی فیورٹ تھی۔ کلاس کے ہر بچے سے اس کی دوستی تھی۔ اس پورے دن اس نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ لنچ بریک میں، میں اس کے اور اس کے خاص دوستوں کے ساتھ تھا۔ اس کا تین لڑکیوں اور دو لڑکوں پر مشتمل گروپ جس میں اس نے مجھے بھی شامل کرلیا تھا۔ میں نہ لنچ کر سکا تھا اور نہ ان سب کی باتوں میں کسی بھی انداز میں شریک ہو سکا تھا۔

''تمہارا کزن بہت چپ رہتا ہے ودلیعہ؟'' اس کی ایک دوست نے میرے متعلق تبصرہ کیا تھا۔

''آج اس کا اسکول میں پہلا دن ہے۔'' اس نے اپنی دوست کو مطمئن کیا مگر گھر واپس آتے ہوئے راستے میں اس نے مجھے ٹوکا۔

''تم اتنے چپ کیوں رہتے ہو؟''

میں چپ رہنے کی وجہ دریافت کیے جانے کے جواب میں بھی چپ ہی رہا۔ گھر واپس آنے کے بعد کھانے کی میز پر جب ابا میاں نے اسکول کے پہلے دن کے متعلق مجھ سے پوچھا تو مجھے لگا کہ مجھ سے پہلے وہ ہنستے ہوئے ان سے کہے گی۔

''ابا میاں! یہ اسکول میں اتنا گنوار اور جاہل لگ رہا تھا۔ کسی کی بھی بات پر اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔''

مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کہا وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔

''بہت اچھا دن گزرا ابا میاں۔'' میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ سات سال کی یہ لڑکی اپنی میچورٹی سے مجھے اس ایک دن میں دوسری مرتبہ حیران کر رہی تھی۔ میں اپنی عمر سے آگے سوچتا تھا تو اس کی وجہ میرے حالات تھے مگر وہ کیوں ایسی تھی؟ اتنی احتیاط، دوسرے کے احساسات کی فکر، اس کی عمر ابھی ان سب باتوں کی تو نہ تھی۔ ابا میاں کے سمجھانے پر اگر اس نے مجھے کزن کہہ کر ہمارے ٹیچرز اور ساتھی بچوں سے ملوایا تھا تب بھی وہ اپنے قریب ترین دوستوں سے تو راز داری میں میرے متعلق جو چاہے کہہ سکتی تھی۔

''ابا میاں کہیں سے اٹھا کر لے آئے ہیں اس کارٹون کو۔'' میں سارا دن اس کے ساتھ رہا تھا اور جانتا تھا کہ اس نے اپنے کسی دوست سے میرے متعلق کوئی بری بات نہیں کہی تھی۔

آنے والے دنوں میں مجھے اس لڑکی سے اپنائیت کا احساس کیونکر ہونے لگا اس میں میرا نہیں صرف اور صرف اس کا ہاتھ تھا۔

میں اسکول میں کسی سے کچھ بول نہیں سکتا تھا، کوئی ٹیچر کچھ پوچھ لیتا تو جواب دینے میں زبان لڑکھڑا جاتی تھی میں ہکلانے لگتا تھا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے تھے مگر وہ کبھی میرا مذاق نہیں اڑاتی تھی۔ نہ اسکول میں، نہ گھر میں، نہ اکیلے میں، نہ سب کے سامنے۔ وہ میری کمزوریوں کو اچھالنے کے بجائے میری حوصلہ افزائی کرتی۔ پڑھائی میں میری مدد کرتی۔ میں اسکول میں اس کے دوستوں میں بیٹھنے اٹھنے سے گریز کرتا اکیلے رہنے کو ترجیح دیتا تو وہ اپنے دوستوں سے ملے گلے کو چھوڑ کر بار بار میرے پاس آجاتی۔ میں سب کے سامنے تو نہیں مگر اکیلے میں اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔

ابا میاں تک سے میں ابھی بھی ہچکچاتا تھا مگر ودیعہ سے بات کرتے نہ میری زبان لڑکھڑاتی نہ دل تیز تیز دھڑکتا نہ ہاتھ پاؤں کانپتے۔ اسکول کے بعد گھر پر ہم دونوں سارا وقت ساتھ ہوتے تھے۔ ابا میاں ہم دونوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے جاتے۔ شام میں ان کے ملاقاتیوں کا ڈھیر لگ جاتا، یا وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے یا پھر ادبی حوالے سے وہ کسی نہ کسی تقریب میں مدعو ہوتے۔ یوں اس سارے وقت میں ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے۔ دوپہر میں سونا ودیعہ کو اچھا نہیں لگتا تھا اور مجھے تو اس کی عادت ہی نہیں تھی۔ سو دوپہر میں ہم اپنا اسکول کا کام لے کر بیٹھ جاتے، اور کام کرنے کے بعد ودیعہ کی فرمائش پر کھیلتے یا باتیں کرتے۔ وہ میری خاطر گڑیوں ٹائپ کے اپنے لڑکیوں والے کھیلوں کو ترک کر کے فٹ بال، بیڈمنٹن، ٹیبل ٹینس کھیلنے کا پروگرام بناتی۔

وہ ہر کھیل میں مجھ سے کہیں اچھی تھی۔ فٹ بال میں وہ مجھ سے کہیں تیز بھاگتی۔ میں لڑکا ہونے کے باوجود جلدی تھک جاتا۔ میں اس سے یہ نہیں کہتا تھا کہ اب بس کرو، میں تھک گیا ہوں مگر وہ میری رفتار ہلکی ہوتے دیکھ کر خود ہی کھیل ختم کر دیتی۔ پھر ہم دونوں لان میں ایک ساتھ جھولے پر بیٹھ جاتے۔ باتیں کرتے وہ زیادہ، میں کم، جھولا جھولتے اور بواجی جو شام کے وقت کے ہلکے پھلکے اسنیکس اور دودھ یا جوس کے گلاس ہمارے لیے لاتیں وہ کھاتے پیتے۔ مجھے وہاں رہتے ہوئے کافی مہینے ہو چکے تھے۔ ایک روز اسی طرح ہم دونوں جھولے پر ساتھ بیٹھے تھے جب وہ مجھ سے بولی۔

''پتا ہے عمر! میں نے ابا میاں سے اپنے لیے بہت ساری اسٹوری بکس منگوائی ہیں۔'' ابا میاں ان دنوں کسی ادبی کانفرنس میں شرکت کیلئے انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔

''میرے پاس جتنی بھی بکس ہیں میں نے ساری پڑھ لیں، اب بہت بوریت ہو رہی ہے۔ اللہ کرے ابا میاں جلدی سے آجائیں۔''

ابا میاں کا ادبی ذوق پورا کا پورا ان کی پوتی میں منتقل ہوا تھا۔ وہ اپنی عمر سے مطابقت رکھتی کتابیں تو بڑے ذوق وشوق سے پڑھا ہی کرتی تھی ساتھ ہی بڑوں کی کتابیں بھی پڑھنے کی کوشش کیا کرتی۔ سمجھ میں چاہے کچھ نہ آئے مگر وہ سنڈریلا، سنو وائٹ کو ڈسکس کرنے والی عمر میں ان ادیبوں اور کتابوں کے ناموں کو جانتی تھی جن کے نام ہمارے ہم عمر بچوں نے کبھی بھولے بھٹکے بھی نہ سنے ہوں۔

''عمر! تمہیں کوئی کہانی نہیں آتی؟''

کہانیوں کی کتابیں اس کے لیے ایسی تھیں جیسے نیند کی گولیاں، کوئی کہانی پڑھے گی تو نیند آئے گی ورنہ نہیں۔

میں بیڈ پر لیٹ چکا تھا جب ودیعہ دروازہ کھول کر اندر آئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ بھی میرے پاس بیٹھ گئی۔

''بتاؤ ناں عمر! تمہیں کوئی کہانی آتی ہے؟''

''کہانی، مجھے؟'' میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں ناں کہانی، کوئی سی بھی کہانی جو تمہیں آتی ہو مجھے سناؤ پلیز......''

''کیسی کہانی؟'' میں نے الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھا۔

''کوئی سی بھی کہانی، سناؤ ناں عمر۔''

اسے بس ہر حال میں کہانی سننی تھی چاہے وہ جیسی بھی ہو۔ وہ خود کو میری دوست کہتی ہے، وہ اتنی اچھی ہے، وہ میری کسی بات کا مذاق نہیں اڑاتی۔ میں کہانیاں سوچنے اور کہانیاں بنانے سے نفرت کرتا ہوں، شدید نفرت میرے دماغ کی اس تاویل کو میرے دل نے اس لڑکی کی خوبیاں گنوا کر ایک پل میں مسترد کر دیا تھا۔ وہ میرا اتنا خیال رکھتی ہے، اسکول میں میرے ساتھ ساتھ رہتی ہے، پڑھائی میں میری اس قدر مدد کرتی ہے، اپنی پسند کے کھیل چھوڑ کر میری خاطر دوسرے کھیل کھیلتی ہے تو کیا میں اسے خوش کرنے کے لیے کوئی کہانی نہیں سنا سکتا؟ میرے ذہن میں خود بخود ہی چند کردار ابھرنے لگے، کچھ سچوایشنز آنے لگیں۔

چند منٹوں میں ایک کہانی میرے ذہن میں آ چکی تھی۔ میں نے کہانی شروع کی، وہ نو سال کے ایک بچے کی مہم جوئی کی کہانی تھی۔ اس میں جادو بھی تھا، اڑنے والے قالین، اڑنے والے گھوڑے، جادوگر، دیو، بچوں کی پسند کے تمام کردار اس میں موجود تھے۔ وہ بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھی ہوئی تھی مگر جیسے جیسے میری کہانی آگے بڑھ رہی تھی اس کی دلچسپی اور محویت بھی بڑھتی جا رہی تھی اب وہ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر اس طرح جم کر بیٹھی تھی کہ جب تک کہانی ختم نہیں ہوتی وہ اٹھے گی نہیں۔

''پھر عمر، پھر کیا ہوا؟ وہ غار سے کس طرح نکلا؟'' میں بیچ میں پل دو پل کے لیے جہاں جہاں چپ ہوتا وہ بے صبری سے آگے کی کہانی جاننا چاہتی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ میرے تھوڑی تھوڑی دیر بعد چپ ہونے اور کچھ سوچنے کی وجہ یہ ہے کہ میں اپنے ذہن میں سسپنس اور ڈائیلاگز ساتھ ساتھ ترتیب دے رہا ہوتا ہوں۔ ''اور پھر علی اپنے دوستوں کو جادوگر کی قید سے چھڑا کر واپس لے آیا۔ اور سب لوگ ہنسی خوشی رہنے لگے۔'' میں نے کہانی ختم کی تو وہ بے ساختہ بولی۔

''بہت اچھی کہانی سنائی ہے تم نے عمر، اتنی اچھی کہانی تو میری کسی اسٹوری بک میں بھی نہیں ہے۔ تم نے اتنی اچھی کہانی کس بک میں پڑھی۔ مجھے اس کا نام بتا دو۔ میں ابا میاں سے اپنے لیے منگواؤں گی۔''

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اوٹ پٹانگ جو جو میرے ذہن میں آ رہا تھا میں بولے گیا تھا اور وہ اوٹ پٹانگ، من گھڑت فضول اسے اچھا لگا، اپنی کہانیوں کی ہر کتابوں سے زیادہ اچھا، پہلے میرے دل میں آئی کہ اس سے جھوٹ بول دوں کہہ دوں بہت پہلے کسی سے سنی تھی مگر پھر وہ لڑکی جو فخریہ مجھے اپنا دوست اور کزن کہہ کر سب سے متعارف کرواتی تھی اس سے جھوٹ بولنا مجھے اچھا نہ لگا۔ میرے سچ بولنے پر اب آنکھیں پھاڑنے کی باری اس کی تھی۔

''یہ تم نے کہیں نہیں پڑھی، خود بنائی ہے؟ ابھی ابھی میرے ساتھ بیٹھ کر؟ نہیں، واقعی تم مذاق کر رہے ہو؟''

وہ حیرت سے کنگ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس حیرت میں مجھے تعریف، ستائش اور پسندیدگی واضح نظر آ رہی تھی۔ ابھی وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ اچھی لگنے والی کس چیز کی تعریف کس طرح کی جاتی ہے مگر اس کی حیرت اور ایکسائٹمنٹ مجھے خود بخود ہی اس کی بے تحاشا پسندیدگی کا پتا دے رہی تھی۔

''تم نے کہانی خود کیسے بنالی عمر؟'' وہ اب جیسے کہانی بنائے جانے کی ترکیب مجھ سے جاننا چاہتی تھی۔

''پتا نہیں۔'' میں نے بے چارگی سے کندھے اچکائے۔ کہانی کیسے بنا کرتی تھی میں خود نہیں جانتا تھا اسے کیا بتاتا۔

''تم اس کے علاوہ اور کہانیاں بھی بنا سکتے ہو؟''

''ہاں.....''

''پھر جب میں کہوں گی تم مجھے کہانی سنایا کرو گے؟''

میرے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اس طرح خوش ہوئی جیسے میں نے اسے کوئی بہت خاص چیز دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ جو کچھ میں نے اسے اپنے دل سے گھڑ گھڑ کر سنایا اس میں اچھا کچھ نہیں میں جانتا تھا لیکن اگر وہ اسے اچھا لگا تھا تو میں ایسی کہانیاں گھڑ کر اسے ہر روز سنا سکتا تھا۔ اگلی رات جب میں کمرے میں آیا تو وہ بھی میرے پیچھے پیچھے آ گئی۔

''عمر! کہانی۔'' اس نے بڑے حق سے کہانی سنائے جانے کا مطالبہ کیا۔

''ودیعہ! تمہیں واقعی میری کہانی اچھی لگی تھی؟'' آج میں پھر بے یقین ہو رہا تھا۔ اس میں اچھا لگنے والا ایسا کیا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں۔

''ہاں نا بہت اچھی لگی تھی۔ عمر پلیز کل کی طرح کوئی اچھی سی کہانی سناؤ۔''

وہ میرے برابر بیٹھ کر منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اپنی کہانی کے اچھے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں بے یقینی کے باوجود میں آج سارا دن ایک کہانی اور اس کے کردار ذہن میں ترتیب دیتا رہا تھا۔ اگر وہ آج کہانی سننے نہ آتی تو یقیناً میں بہت دکھی ہوتا، بہت ہرٹ ہوتا۔ جب کہانی سوچی ہوئی تھی تو اسے کہنا تو کچھ دشوار نہ تھا۔ کہانی میں اس کی دلچسپی اور انہماک میری خود کی دلچسپی کو بھی کہانی میں بہت بڑھا رہے تھے اسے کہانی سننے میں مزا آ رہا تھا تو مجھے سنانے میں۔ ابھی ہماری کہانی آدھی ہی ہوئی تھی کہ بوا جی کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے ودیعہ اور مجھے دونوں کو ناراضگی سے گھورا۔ کل رات وہ سوتی رہ گئی تھیں انہیں یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ ہم دونوں بارہ بجے تک جاگے ہیں مگر آج ساڑھے دس بجے ہی چھاپہ پڑ چکا تھا۔

''آنے دو ڈاکٹر صاحب کو، کروں گی تو تم دونوں کی شکایت۔ کیا کہا ہے ڈاکٹر صاحب نے دس بجے کے بعد مجھے دونوں بچوں میں سے کوئی جاگتا نظر نہ آئے۔ صبح دونوں کو سویرے اٹھنا ہوتا ہے پھر دن میں بھی نہیں لیٹتے، ارے بچوں کو بڑوں سے زیادہ سونا چاہیے۔''

انہوں نے ودیعہ کو ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرتے ہوئے ڈانٹ بھی پلائی۔ وہ اس گھر کی سب سے پرانی ملازمہ تھیں ابا میاں نے انہیں بہت اختیارات دے رکھے تھے۔ گھر میں سب ان کا گھر کے کسی فرد کی طرح ہی احترام کیا کرتے تھے۔ ودیعہ بوا جی کے ساتھ جا تو رہی تھی مگر اس کے چہرے پر کہانی پوری نہ سن سکنے کا افسوس اور آگے کیا ہوا ہوگا کا تجسس پوری طرح پھیلا ہوا تھا۔ اگلے روز اسکول جاتے ہوئے وہ میرے کانوں میں

سرگوشیاں کرتی مجھے راستے میں کہانی سنانے کے لیے اکسا رہی تھی مگر میں ڈرائیور کی موجودگی میں اس کے بہت اصرار کے باوجود بھی ایک لفظ تک نہیں بولا تھا۔ اسکول سے گھر واپس آ کر دوپہر کا کھانا کھاتے ہی وہ میرے پاس آئی اور کہانی کا مطالبہ کیا۔ میں نے اسے کہانی پوری سنا دی اس کے بعد ہی پھر ہم دونوں اپنا اپنا ہوم ورک لے کر بیٹھے۔

"عمر! تمہاری کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ بالکل میری پسند کی۔ اچھا اب کل تم مجھے کسی جنگل کی کہانی سنانا۔"

اور یوں میری زندگی کے دسویں سال میں کہانیاں سننے اور سنانے کا گویا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ رات دیر تک ہمیں جاگنے کی اجازت نہ تھی اس لیے کہانیوں کے لیے دوپہر کا وقت طے ہوا تھا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں اپنا اسکول کا کام نمٹاتے اور پھر کبھی میرے کمرے میں کبھی ودیعہ کے کمرے میں، کبھی لان میں، جھولے پر، کبھی گھاس پر، کبھی سیڑھیوں پر ساتھ بیٹھ کر کہانیاں سنی اور سنائی جانے لگیں۔ جس طرح کی کہانیاں سننے کا اس کا موڈ ہوتا وہ فرمائش کر دیتی۔ کبھی کبھی میری مرضی پر بھی چھوڑ دیتی۔

"جو کہانی تمہیں اچھی لگے وہ سناؤ۔"

کہانی اس کی پسند کی ہو یا میری، میرے لیے اسے تخلیق کرنا بالکل مشکل نہ ہوتا۔ بعض کہانیاں ایک دن میں ختم نہ ہو پاتیں تو ہم باقاعدہ انہیں قسط وار چلاتے۔ میں روز اسے آگے کی کہانی سناتا اور وہ دلچسپی اور تجسس سے اسے سنتی پھر اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار کرتی۔ میں اسے کہانی سنانے میں اور وہ سننے میں اس طرح محو ہوتے کہ ہمیں گردوپیش کی کوئی خبر نہ رہتی۔

بواجی ٹرے میں اسنیکس اور جوس وغیرہ لیکر ایک دم ہمارے پاس آتیں تو ہم دونوں ٹھٹک جاتے۔ میں انہیں دیکھتے ہی گڑبڑا کر فوراً خاموش ہو جاتا۔ ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر ہم دونوں سرگوشیوں میں کیا باتیں کیا کرتے اس بارے میں بواجی متجسس ہوئی تھیں۔

انہوں نے باقاعدہ تفتیشی انداز میں ہم دونوں سے پوچھا۔ میرے بتانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مگر ودیعہ بھی ان کی تفتیش پر کچھ بول کر نہ دی تو وہ ابا میاں کے حضور ہماری شکایت لے کر پہنچ گئیں۔

"بہت مہینوں سے دیکھ رہی ہوں، جیسے ہی پاس جاؤں گی دونوں چپ ہو جائیں گے۔" پوچھو تو "ہم اسکول کی باتیں کر رہے ہیں، کہیں گے۔ ڈاکٹر صاحب! آپ پوچھیں تو ان دونوں سے یہ کون سی اہم باتیں ہیں جن کی وجہ سے دونوں نے کھیلنا تک کم کر دیا ہے۔"

ہم دونوں ابا میاں کے روبرو مجرموں کی طرح کھڑے کئے گئے تھے۔ بواجی کو اصل فکر اس بات کی تھی کہ ان کی لاڈلی ودیعہ نے کھیلنا کیوں کم کر دیا ہے۔ ابا میاں ان کی شکایت پر خوب کھل کر ہنس رہے تھے۔

"جنت بی بی! بچوں کی بھی اپنے کچھ پرسنل باتیں ہو سکتی ہیں جنہیں وہ ہم بڑوں سے ڈسکس نہ کرنا چاہتے ہوں۔ جب ہم بڑے اپنی باتوں اور اپنی مجلسوں میں بچوں کو "تم ابھی بچے ہو" کہہ کر بیٹھنے نہیں دیتے تو بے چارے بچوں کو بھی اتنا حق تو ملنا چاہیے کہ وہ ہمیں اپنی باتوں میں "آپ بہت بڑے ہیں" کہہ کر شریک کرنے سے انکار کر دیں۔"

ابا میاں کے سمجھانے پر بواجی نے ہم بچوں کو ہماری باتوں کے دوران ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔ ودیعہ کو میری کہانیاں بے تحاشا پسند تھیں اور مجھے

اسے کہانیاں سنانا۔ مجھے کہانیاں سوچنے میں ذرا سی بھی دشواری نہ ہوتی تھی۔ کہانیوں کا جیسے خود بخود ہی مجھ پر نزول ہوا کرتا تھا۔ کہانیاں، کردار، واقعات، مکالمے سب میرے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ وقت کے ساتھ ہماری کہانیوں کے موضوعات آہستہ آہستہ تبدیل ہو رہے تھے۔ کہانیوں میں سے جنوں، پریوں اور جادوگروں کا ذکر کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ہم ایک ساتھ بڑے ہو رہے تھے اور ہماری پسند نہ پسند میں مطابقت ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ ہر معاملے میں ہماری پسند اور ناپسند جس حد تک ایک جیسی تھی کہ اسے کوئی کرشمہ یا کوئی معجزہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس سے کتراتے، ہچکچاتے، جھجکتے، اس کی دوستی سے خائف ہوتے، اسے خود سے بہت اعلیٰ بہت ارفع سمجھتے کب میں اسے اپنی دوست سمجھنے لگا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

یہ سب اتنے غیر محسوس انداز میں ہوا تھا کہ میں کچھ سوچ سمجھ نہ پایا تھا۔ یہاں آنے کے ابتدائی دنوں میں جب وہ مجھ سے باتیں کرتی، اپنے ساتھ کھیلنے کو کہتی تو میں یہ سوچ کر اپنی مرضی کے خلاف اس کی بات مان لیتا کہ میں اس کے گھر میں رہ رہا ہوں۔ مجھے اپنی مرضیاں چلانے اور انکار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ مگر میری کہانیوں نے مجھے اس سے قریب کر دیا تھا۔ بہت زیادہ قریب، میں نے اسے خود سے ارفع اور بلند سمجھنا کب کا چھوڑ دیا تھا۔ ہم برابری کی سطح پر ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ابا میاں ہماری دوستی اور ذہنی ہم آہنگی سے بہت خوش ہوتے تھے۔

یہ ان کی محبت، ان کی شفقت، ان کی بڑائی اور ان کی اچھائی تھی۔ جو انہوں نے مجھ میں اور ودیعہ میں کبھی کوئی فرق نہ سمجھا تھا۔ اگر وہ مجھے اپنا بنا کر اس گھر میں لائے تھے تو اپنے پن کا مان بھی انہوں نے مجھے دیا تھا مگر یہ کیسی بات تھی شاید میری کم ظرفی کہ ان کی بے تحاشا محبتوں اور شفقتوں کے باوجود بھی میں خود کو ان کا زیر بار اور احسان مند محسوس کرتا تھا۔ جو کچھ انہوں نے مجھے دیا اور جو کچھ وہ مجھے دے رہے تھے میں وہ اپنے حق کی طرح نہیں احسان کی طرح وصول کر رہا تھا۔ یہ شفقتیں، یہ عنایتیں، یہ محبتیں میرا حق نہیں، ان کی مہربانی تھی۔ ان کی اچھائی تھی، ان کی بڑائی تھی ان کا مجھ پر احسان تھا۔ احسان مندی اور ممنونیت کے اس احساس کو میں دل کے بہت اندر کہیں چھپا کر رکھتا تھا کہ کہیں ابا میاں کو اس کی خبر ہو گئی تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ وہ یہی سوچیں گے کہ ان کی محبت میں ضرور کوئی کمی رہ گئی ہے جو میں ان کی چاہت اور شفقت کو احسان سمجھتا ہوں۔

ابا میاں، ان کا یہ گھر، میرا اسکول، مجھے مہیا ہر آسائش مجھ پر احسان تھا۔ اگر مجھے میسر کوئی چیز احسان نہیں تھی تو وہ ودیعہ کمال کی دوستی تھی۔ میری تعلیمی کارکردگی اطمینان بخش تھی۔ اگر میں ودیعہ کی طرح آؤٹ اسٹینڈنگ اسٹوڈنٹ نہیں تھا تو محض ایک اوسط درجے کا طالب علم بھی نہیں۔ میں ہر امتحان اچھے گریڈز کے ساتھ پاس کر رہا تھا۔ اچھے گریڈ حاصل کر لینے کے باوجود میں اپنے ٹیچرز کی نگاہوں میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ہر پیرنٹس میٹنگ میں میرے ٹیچرز ابا میاں سے میرے متعلق یہی شکایت کرتے کہ مجھ میں اعتماد کی شدید کمی ہے، شرمیلا پن اور جھجک ہے۔ میں امتحان میں اچھا رزلٹ لے آتا ہوں مگر کلاس میں کبھی کوئی کارکردگی نہیں دکھاتا۔ انہیں حسرت ہے کہ کبھی ان کے پوچھے کسی سوال کا جواب دینے کے لیے میرا بھی ہاتھ اٹھے یا کوئی سوال پوچھنے کے لیے اٹھے۔

ابا میاں مجھے پیار سے سمجھاتے، مجھ میں کسی چیز کی کمی نہیں جو میں خود کو دوسروں سے کمتر سمجھوں یہ یقین دلاتے وہ میرا شرمیلا پن اور لوگوں سے بات چیت کرتے وقت ہونے والی جھجک دور کروانے کی بہت کوشش کرتے۔ مگر میری شخصیت میں جو کمزوریاں تھیں وہ ختم نہ ہو پاتی تھیں۔

سوائے ودیعہ کے میں کسی کے ساتھ اعتماد سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ جس وقت اس کے ساتھ اکیلا ہوتا مجھے ایسا لگتا میں ایک بالکل مختلف انسان بن گیا ہوں۔ پُراعتماد، ہنس مکھ، بذلہ سنج، شوخ، حاضر جواب۔

''ابا میاں! جو مجھ پر پیسہ خرچ کر رہے ہیں میں اسے برباد نہیں کر رہا۔ اچھے رزلٹس لا رہا ہوں میرے اپنے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے۔ مجھے نمایاں ہونے کا، غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا نہ تو کوئی شوق ہے اور نہ ہی مجھ میں کوئی صلاحیت ہے۔'' ابا میاں کے سمجھانے پر ٹیچرز کے ٹوکنے پر میں یہی سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا کرتا۔ میوزک، فائن آرٹس، اسپورٹس میں پڑھائی سے ہٹ کر ہونے والی ہر سرگرمی سے دور رہا کرتا تھا۔ جبکہ ودیعہ اس معاملے میں مجھ سے بالکل مختلف تھی وہ ہر غیر نصابی سرگرمی میں سب سے آگے تھی۔ پرائمری کلاسز سے نکل کر ہم سیکنڈری کلاسز میں آئے تو ودیعہ بتدریج اسکول کے نمایاں ترین اسٹوڈنٹس میں شامل ہوتی چلی گئی۔

اسکول میں ہر سال ٹاپ اگر ودیعہ کمال کرتی تھی تو ہر تقریری مقابلے میں اول انعام بھی اسی کو ملا کرتا۔ ٹیبل ٹینس، والی بال اور بیڈمنٹن میں اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا تھا کسی ڈرامہ میں کوئی مشکل کردار ہے تو اسے ودیعہ سے اچھا کوئی پرفارم نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیچرز تو ٹیچرز وہ پرنسپل تک کی پسندیدہ تھی۔ ہمارے کلاس فیلوز کے ساتھ ساتھ جونیئرز اور سینئرز میں بھی یکساں مقبول، اس کی اس مقبولیت اور ہر دل عزیز ہونے میں اس کی ذہانت اور غیر معمولی نمایاں کارکردگی سے بھی بڑا ہاتھ اس کی خوش اخلاقی، مروت اور خلوص کا تھا۔ وہ ابا میاں کی پوتی تھی ناں بالکل ان جیسی۔ انہیں کی طرح ہر کسی کے کام آنے والی، سب سے اچھی طرح بات کرنے والی، میں نے اسے کبھی کسی کے ساتھ روڈ ہوتے، لڑتے یا بلند آواز سے بولتے سنا ہی نہیں تھا۔ اس کے غصے کی انتہا یہ ہوتی کہ وہ خاموشی اختیار کر لیتی۔ وہ کسی کو برا نہیں کہتی تھی۔ وہ بُروں میں بھی اچھائیاں ڈھونڈا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کلاس کے اور اسکول کے ہر اسٹوڈنٹ سے بنتی تھی۔

جیسے جیسے ہم بڑے ہو رہے تھے اس کی تمام خوبیاں اور اچھائیاں بہت نمایاں انداز میں سامنے آنے لگی تھیں۔ کلاس کے نکمے سے نکمے اور بدتمیز سے بدتمیز اسٹوڈنٹ کی مدد کرنے سے بھی وہ نہیں ہچکچاتی تھی۔ وہ کبھی کسی کی مدد کرنے سے انکار نہیں کرتی تھی۔ کوئی بھی اس کی نوٹ بکس، جنرلز یا اسائمنٹس مانگتا وہ یہ سوچے بغیر کہ وہ اس کا اتنی محنت سے کیا ہوا کام نقل کر لے گا خوشی خوشی اسے وہ بس دے دیا کرتی۔ اس کے اسائمنٹس، اس کی نوٹ بکس اس کے جرنلز اس کے پاس کم اور دوسرے کلاس فیلوز کے پاس زیادہ پائے جاتے تھے۔ وہ کسی کی بھی مدد کر کے بعد میں احسان نہیں جتاتی تھی اس لیے وہ نکمے، نالائق مگر اونچی ناک رکھنے والے اسٹوڈنٹس کی بے انتہا چہیتی تھی۔

میں اس کی اس عادت سے بہت چڑتا تھا۔ اسکول میں اس سے اس طرح بات نہیں کرتا تھا جس طرح گھر پر، اس لیے جیسے ہی ہم گھر پہنچتے میں اس سے لڑنا شروع ہو جاتا۔

''تمہاری یہ 'حاضر ہوں مدد کو دل و جان سے' والی ادا مجھے زہر لگتی ہے، کلاس کے سارے ڈفر تمہاری محنت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔'' وہ میرے خفا ہونے پر تحمل سے مجھے سمجھاتی۔

''ابا میاں کہتے ہیں دوسروں کو خوشی دو تو بدلے میں خود میں بھی ڈھیر ساری خوشی ملتی ہے۔ دوسروں کو خوشی دینے سے خوشی ملتی ہے عمر۔'' وہ

بہت چھوٹی تھی تب نانی، دادی بنا کرتی تھی پھر اب تو ہم 7th گریڈ میں تھے۔

''ابا میں یہ نہیں کہتے کہ نکموں، نالائقوں کی بے جا مدد کر کے ان کو اور نکما اور نالائق بنا دو۔ ہونہہ خوشی ملتی ہے۔ تمہارا دماغ خراب ہے دیا۔'' میں اس پر بگڑتا تھا۔

''عمر! اس میں میرا کیا نقصان ہے اگر میں اپنی چیزیں کسی کو دے دوں۔ وہ سب میرے کلاس فیلوز ہیں۔ مجھ سے اتنا پیار کرتے ہیں، وہ سب اتنے اچھے ہیں۔''

''اچھے ہیں۔ ہاں تمہارا کیا ہے تمہیں تو دنیا کا ہر فضول سے فضول آدمی بھی اچھا لگتا ہے۔''

میں اس کی بات کاٹ کر ناراضگی سے بولتا تھا۔ وہ پڑھائی میں اتنی اچھی تھی کہ اسے کبھی کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کے برعکس کلاس کے ذہین سے ذہین اسٹوڈنٹس کو بھی کبھی نہ کبھی اس سے مدد لینی پڑ جاتی تھی۔ کلاس کا کوئی ایک اسٹوڈنٹ بھی ایسا نہیں تھا بشمول میرے، جو یہ کہہ سکے کہ اس نے ودیعہ سے کبھی پڑھائی میں مدد نہیں لی اور کلاس کا کوئی ایک اسٹوڈنٹ بشمول میرے ایسا بھی نہیں تھا جو یہ کہہ سکے کہ ودیعہ نے کبھی کسی بھی حوالے سے اس سے مدد لی ہے۔ اگر کبھی بیماری یا کسی بھی وجہ سے اسے اسکول کی چھٹی کرنی پڑ جاتی تو میرے، بہت اصرار پر بھی وہ میری نوٹ بکس، جنرلز اور رجسٹرز سے کام نقل نہیں کرتی تھی۔ ''پہلے یہ سوال خود کرنے کی کوشش کر لیتی ہوں، اگر مجھ سے نہیں ہوا تو تمہاری نوٹ بک سے اتار لوں گی' اور وہ اتنی ذہین تھی کہ اسے کبھی بھی میرا کام اتارنے دیکھنے یا نقل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ جبکہ میں اسکول کی چھٹی ہو جانے اور کام مس ہو جانے پر بڑے آرام سے اس کی نوٹس بکس اور جرنلز سے استفادہ...... کر لیا کرتا تھا۔

اس کی ہمدردی، ایثار، خلوص اور مروت صرف کلاس فیلوز یا جان پہچان کے لوگوں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ہر کسی کے ساتھ یہاں تک کہ راہ چلتے اجنبیوں تک کے ساتھ برتی جاتی تھی۔ راستے میں آتے جاتے کسی غریب بچے پر ترس آ گیا تو اپنی پاکٹ منی سے اس کی مدد کر دی۔ یونہی ترس کھاتے کھاتے وہ اپنی ساری کی ساری پاکٹ منی خرچ کر دیا کرتی تھی۔ میں حسب عادت اسے ٹوکتا اس پر خفا ہوتا مگر وہ میرے ٹوکنے اور خفا ہونے سے وہ اپنی فطرت تو نہیں بدل سکتی تھی۔ عادتیں بدلی جا سکتی ہیں مگر فطرت نہیں، ہمدردی، خلوص، ایثار، مروت، محبت یہ سب اس کی فطرت میں شامل تھا۔ کیا اس کے سمجھانے سے میں اپنی فطرت بدل سکا تھا جو اس کی فطرت بدلنا چاہتا تھا۔ میں بزدل، کم ہمت اور کمزور تھا تو تھا۔ جب میں خود کو نہیں بدل سکتا تو اس سے بدلنے پر اصرار کیوں کرتا ہوں؟

ہر بار اسے ٹوکنے یا اس پر خفا ہونے کے بعد اسے خاموشی اور اداس ہوتا دیکھ کر میں خود اپنے آپ پر خفا ہوتا، خود کو لعنت ملامت کرتا، میں نے ایسی برہمی اور خفگی دکھائی کیوں جو وہ اداس اور رنجیدہ ہو گئی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ہم دونوں میں ایک عجیب سی، ایک ناقابل یقین اور بہت مختلف سی کمیونیکیشن ڈیولپ ہوتی جا رہی تھی۔ لفظ کہے نہ جائیں یہ بات سمجھ لی جائے۔ ہم سارا دن ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے، ہم سارا دن ایک دوسرے سے بے انتہا باتیں کرتے تھے۔ پورا دن ساتھ گزارنے کے ساتھ ہم ایک دوسرے سے یہ تک شیئر کرتے تھے کہ دن بھر میں ہم نے کس کس کی بات پر کیا سوچا اور کس واقعہ پر کیسا محسوس کیا۔

ہمارے بیچ کوئی کمیونیکیشن گیپ نہیں تھا۔ لفظوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کی ہر فیلنگ کو سمجھ سکتے تھے۔ ہمارے بیچ لفظ غیر اہم تھے، بالکل غیر اہم۔ ودیعہ اگر خاموش ہے تو میں صرف اس کا چہرہ دیکھ کر اس کی خاموشی کی وجہ جان لیتا تھا، جو وہ بول نہیں رہی صرف سوچ رہی ہے، میں اسے بھی سمجھ لیتا تھا۔ اسی طرح وہ میری آنکھوں سے میرے دل کا حال جان لیتی تھی۔ میں کیا سوچ رہا ہوں، میں کیا محسوس کر رہا ہوں، کس وقت میرا موڈ کیسا ہے اسے میرے کہے بغیر سب پتا ہوتا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے کچھ چھپا ہی نہیں سکتے تھے۔ ہم ایک دوسرے کو اندر تک جانتے تھے۔ بالکل اندر تک، دل کے چھپے ہوئے رازوں تک۔

ہمارے بیچ کچھ تھا جو عام نہیں تھا جو الہامی لگتا، اللہ کا ودیعت کردہ لگتا۔ ایسا کس طرح ہو جاتا تھا کہ جب ہم ایک دوسرے کے پاس نہ ہوتے تب بھی کوئی ایک کسی مشکل میں پڑتا تو دوسرے کے دور ہونے کے باوجود خود بخود کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگتا۔ دل اداس ہونے لگتا، بے چینی اور پریشانی لاحق ہونے لگتی۔

ایک بار جب اسکول کے ساتھ پکنک پر جانے پر ودیعہ سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے بچی تو میں جو پکنکس اور پارٹیز سے کترانے کے سبب گھر پر تھا بری طرح بے چین اور پریشان ہو گیا۔ سارا وقت میں لان میں، پورچ میں، اور گھر کے گیٹ کے اندر باہر بے قراری کے عالم میں پھرتا رہا تھا۔

ایسے ہی جب ایک مرتبہ اسکول میں میری طبیعت خراب ہوئی اور ودیعہ کسی تقریری مقابلے میں شرکت کے لیے کسی دوسرے اسکول گئی ہوئی تھی تب وہاں سے واپس آتے ہی وہ گھبرائی ہوئی اور پریشان فوراً میرے پاس آئی۔

''تم ٹھیک ہو عمر؟'' اس نے تشویش اور فکرمندی سے مجھے دیکھا تھا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا دیا! میری طبیعت خراب ہوئی تھی؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''تمہاری طبیعت خراب ہوئی تھی، کب، کیا ہوا تھا؟ تم گھر کیوں نہیں گئے؟ ڈرائیور کو بلوا لیتے۔''

وہ پریشانی میں بے ربط سے انداز میں نجانے کیا کیا کہے گئی اور میں یہ دیکھتا رہ گیا کہ اسے میری طبیعت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ صرف اس کا دل تھا، اس کا دل جس نے اسے کسی خطرے سے آگاہ کیا تھا۔

ناشتے اور کھانے کے دوران اگر میز پر صرف ہم دونوں ہوتے اور گھر کا کوئی اور فرد وہاں موجود نہ ہوتا تب ہمارے درمیان بڑی دلچسپ حرکتیں ہوا کرتیں۔ مثلاً ابا میاں کی خاص تاکید تھی کہ دونوں بچے روزانہ دودھ کا ایک گلاس ضرور پئیں اور انڈا ضرور کھائیں۔ مجھے ابلے انڈے کی زردی اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں اپنی پلیٹ سے زردی اٹھا کر چپکے سے ودیعہ کو دے دیتا اور وہ بوا جی کی نظروں سے بچ کر جلدی سے وہ منہ میں ڈال لیتی۔

شام میں ہمارے لیے اسنیکس کے ساتھ اگر بوا جی ٹماٹر کا جوس لے آتیں جو ودیعہ کو بالکل پسند نہیں تھا تو اپنے جوس کے گلاس کے ساتھ میں اس کا جوس کا گلاس بھی پی لیا کرتا تھا۔

مجھے نہاری اور پائے میں گودے کی ہڈیاں بہت اچھی لگتی تھیں وہ اپنی پلیٹ اور سالن کے پیالے میں سے ساری نلیاں میری پلیٹ میں ڈال دیتی تھی۔ اسے پنیر بہت پسند تھا، اس حد تک کہ وہ چیز سادی تک کھانے سے گریز نہ کرتی تھی۔

''کھانے کی ہر وہ چیز جس میں پنیر ہو، میری فیوریٹ ہے۔''

یہ اس کا مخصوص جملہ تھا، وہ یہ جملہ بہت کثرت سے بولتی تھی۔ بوا جی نے چیز سینڈوچز بنائے ہیں یا برگر میں چیز ڈالی ہے تو میں اپنے اور اس کے دونوں سینڈوچز اور برگرز کے کنارے کھالیتا اور درمیان کا پنیر والا سارا حصہ اسے دے دیتا۔ تمام سبزیاں وغیرہ مکس کر کے سلاد بنائی گئی ہے تو سلاد کے پیالے میں سے اس کے پسندیدہ سلاد کے پتے چن چن کر اس کی پلیٹ میں رکھنے کا کام ہمیشہ میں کرتا تھا۔

کہانی کہنا اگر مجھے قدرتی طور پر آتا تھا تو مجھ میں کتابوں سے محبت اور مطالعہ کا شوق پیدا کروانے والی ودیعہ تھی۔ اسے مطالعہ کا بے پناہ شوق بچپن ہی سے تھا اور اس کی دیکھا دیکھی یہ شوق مجھ میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔ کتابوں کی ہماری گھر میں کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ ایک صاحب علم اور صاحب کتاب شخص کا گھر تھا۔ یہاں کئی سو بلکہ ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ ابا میاں کی اسٹڈی ایک کمرہ نہیں بلکہ ہمارے گھر کا پورا فرسٹ فلور تھی۔ اسے بجا طور پر ایک بہترین ذخیرے والی شاندار لائبریری کہا جا سکتا تھا۔ وہاں ہر جا بے شمار موضوعات پر بے شمار کتابیں ہی کتابیں تھیں۔

ودیعہ وہاں سے اٹھا، اٹھا کر کتابیں لے آتی۔ اسے کتابیں اس ذوق وشوق سے پڑھتا دیکھ کر میں بھی کتابیں پڑھنے لگا تھا۔ کتابیں پڑھنے میں مجھے بھی ودیعہ کی طرح مزا آنے لگا تھا۔ کھیل کود میں پہلے ہی مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی، دوسرا میرا ودیعہ کے علاوہ کوئی تھا نہیں، سو کتابیں پڑھنے سے اچھا مشغلہ فارغ وقت کا اور کیا ہو سکتا تھا۔ بہت سا اچھا اردو اور انگریزی کلاسیکی ادب ہم دونوں نے بہت کم عمری میں پڑھ لیا تھا۔ ابا میاں کے پاس فراغت ہوتی تو وہ ودیعہ کی فرمائش پر مثنوی مولانا روم بڑے پراثر انداز میں پڑھ کر پھر ہمیں اردو میں اس کی تشریح بھی بتاتے، یا پھر اقبال کا کلام بڑی خوب صورتی سے ہمیں سناتے اور سمجھاتے بعد میں ہم دونوں اس کلام کی گہرائی، معنی ومفہوم پر گھنٹوں آپس میں بحث ومباحثہ کرتے۔ 8th گریڈ میں ہم دونوں ان شاعروں اور ان ادیبوں کے کام پر آپس میں تبادلہ خیال کرتے جن پر اردو، انگریزی، فارسی یا یورپین لٹریچر میں ماسٹرز کرنے والے طالب علم تبادلہ خیال کرتے ہوں گے۔

میں چونکہ اسکول میں کچھ بولتا نہیں تھا، اس لیے میرے بارے میں تو کسی کو کچھ پتا نہیں تھا مگر ودیعہ کے وسیع مطالعے سے تمام ٹیچرز آگاہ تھے۔ 6th گریڈ میں ایک بار اس نے اردو کی ٹیچر کو اقبال کا شعر غلط سنانے پر فوراً ٹوکا تھا۔ پوری کلاس کے سروں کے کئی فٹ اوپر سے وہ فارسی شعر گزر گیا تھا اور ہماری ٹیچر ایک نو، ساڑھے نو سال کی بچی کے منہ سے اقبال کا ایک مشکل شعر سن کر ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھیں۔ 6th گریڈ ہی سے ودیعہ نے ہمارے اسکول میگزین میں لکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اس کا سب سے پہلا مضمون......

''بچے آئس کریم کیوں پسند کرتے ہیں۔''

کے موضوع پر تھا، اور اپنے اس مضمون میں اس نے دنیا میں سب سے پہلے آئس کریم کس ملک میں بنائی اور کھائی گئی تک کی تاریخ لکھ ڈالی تھی۔ اس کے مضامین ایک بچی کے بچوں ہی کے لیے لکھے جانے والے بچکانہ مضامین ہوا کرتے تھے۔ مگر بات کہنے کا ڈھنگ، الفاظ کا درست استعمال اور ہر بات کے لکھنے سے پہلے مکمل تحقیق اس کی عمر کے لحاظ سے بے مثال بلکہ ناقابل یقین تھی۔ وہ لکھنے سے پہلے ہر بات کی مکمل تصدیق اور تحقیق یا تو کتابوں میں ڈھونڈ کر یا پھر ابا میاں سے پوچھ کر کرتی اور پھر اس کے بعد لکھتی، ابا میاں اپنا علمی، ادبی اور تحقیقی سارا شوق پوتی میں موجود پا کر

خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ جبکہ بوا جی اسے کتابوں میں گم دیکھ دیکھ کر ہولتیں۔

''ارے میں کہتی ہوں ڈاکٹر صاحب! یہ لڑکی اپنے وزن سے بھی وزنی کتابیں، لیے گھومتی ہے۔ کچھ کریں، باؤلی ہو جائے گی اتنی سی عمر میں۔'' ''میری پوتی میرا نام روشن کرے گی جنت بی بی، میرا ادبی ذوق وشوق میرے بیٹے میں تو نہیں البتہ میری پوتی میں ضرور منتقل ہو گیا ہے۔''

وہ اسکول میگزین کے لیے متواتر دو ڈھائی سالوں سے لکھ رہی تھی اور 8th گریڈ میں آ کر وہ میگزین کے ادارتی ارکان میں بھی شامل ہو گئی تھی۔ ودیعہ کی ہر کامیابی مجھے اپنے کامیابی لگتی۔ تعریفیں اس کے ہوتیں دل میرا خوشی سے جھوم جاتا۔ مطالعہ کی کثرت نے اسے بہت کم عمری میں بہت آگے پہنچا دیا تھا۔

جبکہ میرے لیے اتنا بے تحاشا پڑھنے کا فائدہ صرف اور صرف یہ تھا کہ ودیعہ کو کہانیاں سنانے کا میرا انداز پہلے سے کہیں زیادہ اچھا ہو گیا تھا۔

اس کا میری کہانیوں کو سننے کا ذوق وشوق بالکل پہلے جیسا تھا اور میرا اسے سنانے کا۔ دوپہر کا جو وقت ہمارا کہانی کا تھا اس وقت کوئی اور کام نکل آتا تو ودیعہ کا موڈ آف ہو جاتا۔ وہ بھی کہانی سنے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ پہلے اسے تعریفیں کرنے کے لئے لفظ نہیں ملا کرتے تھے اب وہ ہر کہانی سننے کے بعد باقاعدہ بڑی سنجیدگی سے اس پر تبصرہ اور تعریفیں کرتی۔ وہ جو بات آٹھ سال کی عمر میں کہتی تھی وہی اب بھی۔

''عمر! کسی کتاب کو پڑھنے میں اتنا مزا نہیں آتا جتنا تمہاری کہانی سننے میں۔ تمہاری کہانیاں اتنی اچھی ہوتی ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا تم انہیں سوچتے کیسے ہو؟ تم زندگی میں کبھی کسی جنگل میں نہیں گئے پہاڑوں پر نہیں چڑھے، جزیروں پر نہیں رہے۔ پھر بھی تم وہاں کا نقشہ ایسا زبردست کھینچتے ہو کہ تمہارے ساتھ میں بھی خود کو اسی جگہ پر پہنچا ہوا محسوس کرنے لگتی ہوں۔''

اس کی یہ تعریفیں ہی تو تھیں جو مجھ سے کہانیاں کہلوایا کرتی تھیں۔ اتنے سالوں میں ہر روز سنا سنا کر میں اسے کل کتنی کہانیاں سنا چکا تھا مجھے خود صحیح تعداد یاد نہیں تھی۔ کچھ ایک ہی دن میں ختم ہو جاتیں، کچھ دس یا پندرہ دن میں اور کچھ ایک مہینے میں۔ اسے لمبی کہانیاں جو زیادہ دنوں تک چلتیں زیادہ پسند آتی تھیں۔

وہ اسکول آتے جاتے بھی کرید کرید کر کے میں کہانی کا کیا اختتام کروں گا پوچھا کرتی اور میں کسی بہت بڑے کہانی کار کی طرح تھوڑا اکڑ کر اختتام چھپائے رکھتا۔ ودیعہ کی تیرہویں سالگرہ پر آنٹی اور انکل دونوں پاکستان میں نہیں تھے۔ انکل تیمور سرجنز کی کسی کانفرنس میں شرکت کرنے نیویارک گئے ہوئے تھے اور آنٹی پاکستان کے دیہی علاقوں میں طبی سہولتوں کی فراہمی کے حوالے سے ہونے والے ایک پروگرام کے تحت سندھ اور بلوچستان کے پسماندہ علاقوں کے دورے پر، وہ دونوں جاتے وقت وعدہ کر کے گئے تھے کہ ودیعہ کی سالگرہ سے پہلے ہی واپس آ جائیں گے مگر سالگرہ سے پہلے تو کیا، وہ دونوں سالگرہ کے دن بھی واپس نہیں آئے۔

ابا میاں نے اس کی سالگرہ کا ہر سال کی طرح بھرپور اہتمام کیا تھا۔ میں خود ودیعہ سے چھپ کران کے ساتھ انتظام و اہتمام میں شریک رہا تھا۔ ہم نے دو کیکس کا آرڈر کیا۔ ایک وہ جو ودیعہ گھر پر کاٹے گی اور ایک وہ جو اسکول لے کر جائے گی۔ اسکول میں سالگرہ کے دن جو وہ دوستوں کو ٹریٹ دے گی اس کے لیے لنچ بوکسز جن میں پیزا، ڈونٹس، پیٹیز اور سموسے وغیرہ تھے کا آرڈر کیا۔ گھر پر ابو جی نے لنچ کا شاندار اہتمام کرنے کو کہا جبکہ

ڈنر تو اس روز ابامیاں نے ہمیں کسی اچھے سے ہوٹل میں کرانا تھا۔ اسے خوش کرنے کے لیے اس روز کا سارا پروگرام اس کی پسند کے مطابق ترتیب دیا گیا تھا مگر سالگرہ کے دن جب میں صبح صبح اسے وش کرنے اس کے کمرے میں گیا تو اس کا چہرہ دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ آج وہ کسی بات سے خوش ہونے والی نہیں اس کی زندگی کے اس اہم ترین دن انکل اور آنٹی کی کمی کوئی مادی شے پوری نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے ممی پاپا اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے، وہ انہیں ان کی جان سے بھی بڑھ کر پیاری ہے وہ یہ سب جانتی تھی مگر محبت اظہار چاہتی ہے۔ جبکہ آنٹی انکل بار بار تو کیا کبھی کبھار بھی اسے شدت سے گلے لگا کر ماتھے پر بوسہ دے کر، گال چوم کر پیار کا اظہار نہیں کر پاتے تھے۔ وہ اپنے کام کو عبادت سمجھتے تھے اور اس سے عشق کرتے تھے اور ان سے اکثر اوقات اپنی اکلوتی بیٹی نظر انداز ہو جاتی تھی۔

ودلیعہ نے زبان سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ آنٹی انکل کی عدم توجہی کو بہت شدت سے محسوس کرتی ہے۔ اس کے پاس چوبیس گھنٹے ابامیاں موجود تھے، میں تھا، بواجی تھیں پھر بھی ہم سب مل کر بھی اس کے ماں باپ کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے تھے۔

وہ بہت اداس تھی۔ مگر یہ کیا؟ وہ اپنی اداسی مجھ سے چھپا رہی تھی، میں نے اسے سالگرہ کی مبارک باد دی تو اس نے خوشگوار انداز میں میری مبارک باد قبول کی، مجھ سے تحفے کا مطالبہ کیا۔ وہ خود کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہی ہے، کیا وہ جانتی نہیں کہ ہم ایک دوسرے سے خود کو کبھی بھی چھپا نہیں سکتے۔

مجھے لگا تھا وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر روئے گی، آنٹی انکل کے رویے پر ناراضی کا اظہار کرے گی اور پھر میں اسے اس کی طرح پیار سے سمجھاؤں گا، حوصلہ دوں گا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ مجھے سمجھاتی اور حوصلہ دیتی تھی...... اسکول میں ہر بار جب کہیں مجھے اپنے ماں باپ کا ذکر کرنا پڑتا، عزت قائم رکھنے کو یہ کہنا پڑتا کہ، وہ دونوں مر چکے ہیں تب ہی تو میں اپنے رشتے داروں کے گھر رہ رہا ہوں۔'' تو گھر آ کر میں ودلیعہ کے پاس بیٹھ کر بہت دیر تک روتا تھا۔

تب وہ مجھے بہت پیار سے سمجھاتی، دلاسہ دیتی، حوصلہ دیتی، یہ کہتی کہ کیا پتا واقعی میرے امی، ابو مر ہی گئے ہوں، مجھے کوئی اور بری بات سوچنے کے بجائے بس یہی سوچنا چاہیے کہ وہ دونوں کئی برسوں پہلے مر چکے تھے اور پھر ودلیعہ کی فیملی ہی تو میری بھی فیملی ہے۔ میں اکیلا تو نہیں جو یوں اداس و دل گرفتہ ہوتا ہوں۔

جب وہ میرے درد کو اپنا درد سمجھ کر میرے اداس لمحوں کو دور کر دیتی تھی تو مجھے یہ حق کیوں نہیں دے رہی تھی کہ میں اس کی اداسی اور اس کا غم دور کر سکوں۔ رونا دور کی بات وہ تو مجھ سے اپنا اداس ہونا ہی چھپا رہی تھی۔

میں نے ودلیعہ کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھنے چاہے تھے، میں اسے روتا ہوا، دکھی ہوتا دیکھنا چاہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ کبھی نہ روئے، اس کی زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہ آئے یہ شدید ترین خواہش رکھنے کے باوجود میں اسے خود سے آنسو چھپاتا دیکھ کر ہرٹ ہوا۔ میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ میری گہری نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ سارا دن بلاوجہ قہقہے لگا لگا کر خود کو خوش ظاہر کرتی مجھے اور ابامیاں کو دھوکا دیتی رہی۔

''تمہیں لگتا ہے، تم ہنس ہنس کر مجھ سے اپنی فیلنگز چھپا لو گی؟'' شام میں، میں پھٹ پڑا تھا۔ وہ میری طرف ایسے دیکھنے لگی جیسے اسے کچھ

ہی نہ آیا ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں۔

''تم آنٹی، انکل کے نہ آنے پر اداس ہو۔ انہوں نے تمہاری سالگرہ کے دن کو اہمیت نہیں دی یہ بات تمہارے دل کو بہت دکھا رہی ہے۔ لیکن تم زبردستی ہنس ہنس کر مجھے بے وقوف بناؤ گی میرے سامنے روتے ہوئے تمہاری انسلٹ جو ہوتی ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے عمر۔'' وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ ''ابا میاں نے میری سالگرہ کے لیے اتنا اہتمام کیا ہے اگر انہوں نے مجھے اداس دیکھ لیا تو انہیں بہت دکھ ہوگا۔ ہاں مجھے ممی پاپا کے نہ آنے کا بہت دکھ ہے۔ میں اداس ہو کر اور رو کر تم لوگوں کا موڈ کیوں خراب کروں؟ تمہارے سامنے رونے سے میری کوئی انسلٹ نہیں ہوتی مگر میرے رونے سے پھر تم جو اداس ہو جاؤ گے۔ آج کے دن تمہارا غبارے کی طرح پھولا منہ نہیں دیکھنا چاہتی۔'' اس نے باقاعدہ اپنا منہ پھلا کر مجھے میرے منہ کی حالت بتائی۔ غصے کے باوجود میں بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

''ٹھیک تو کہہ رہی ہے دیا۔ اگر وہ روئی یا اداس ہوئی تو ابا میاں کا دل کتنا برا ہوگا۔ میں ہر بات کو جذباتی انداز میں سوچتا ہوں۔'' ودیعہ سے شاکی ہونے پر مجھے خود اپنے آپ پر شدید غصہ آیا۔ ''پتا نہیں ودیعہ مجھ جیسے جذباتی اور احمق لڑکے کو برداشت کیونکر کرتی ہے؟''

ایک روز اسکول میں میرے ساتھ کافی ساری بڑی بڑی باتیں ایک ساتھ ہو گئی تھیں ان دنوں ہم 9th گریڈ میں تھے۔ اس روز انگلش کی کلاس میں ٹیچر ہمیں ''مرچنٹ آف وینس'' پڑھا چکنے کے بعد اس سے متعلق سوال جواب کر رہی تھیں۔ مختلف اسٹوڈنٹس سے سوالات کرتے کرتے انہوں نے اچانک ہی مجھ سے بھی ایک سوال کر ڈالا۔ ایسے ہر موقع پر جب پوری کلاس کے سامنے مجھے بولنا پڑتا تو جواب معلوم ہونے کے باوجود میں ایک جملے میں کئی کئی بار اٹکتا تھا۔ زبان لڑکھڑا جاتی اس میں لکنت سی آ جاتی، بغیر ہکلائے اور اٹکے منہ سے ایک لفظ نہ نکلتا۔ وہ نئی ٹیچر تھیں، پرانے ٹیچرز تو ٹوک ٹوک کر اور سمجھا سمجھا کر مجھے ناقابل اصلاح قرار دے کر میرے حال پر چھوڑ چکے تھے جبکہ وہ نئی ہونے کی وجہ سے ابھی کسی بھی اسٹوڈنٹ کے متعلق زیادہ کچھ جانتی نہیں تھیں۔ میرے گھبرانے اور اٹکنے کا انہوں نے یہ مطلب نکالا کہ میں نے کچھ بھی سمجھا نہیں ہے اور اب جواب نہ آنے کی وجہ سے گھبرا رہا ہوں۔ انہوں نے کافی سخت الفاظ میں مجھے ڈانٹا۔ مجھے کلاس کا سب سے نکما اور نالائق اسٹوڈنٹ قرار دیا۔ سب کی نظریں مجھ پر تھیں اور میں سر جھکا کر کھڑا ان کی ڈانٹ کھا رہا تھا۔

''یہ ہکلا تو ودیعہ کا کزن لگتا ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں اس بونگے میں ایسی کیا خوبی ہے جو ودیعہ اسے ہر جگہ اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتی ہے۔''

لائبریری میں، میں اور ودیعہ ساتھ داخل ہوئے تھے اور سامنے ہی کی میز پر ہماری کلاس کے پانچ لڑکے اور تین لڑکیاں ساتھ بیٹھے مجھ ہی کو تمسخرانہ انداز میں ڈسکس کر رہے تھے۔ آصف ہمدانی جس نے یہ جملہ بولا تھا وہ اب میری ہی طرح ہکلا کر اپنے دوستوں کو ہنسا رہا تھا اور اس کے دوست ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے تھے۔ ''میم...... میم...... شش...... شش...... شیکسپیئر...... ک...... کک...... کے...... اس ڈر...... ڈرامہ...... مم...... میں......''

ودیعہ مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر ایک دم ہی ان ساتوں کے سر پر پہنچ گئی۔ ''وہ جھگڑے گی۔ وہ میری خاطر لڑے گی۔'' میں اسے روکنے کے لیے فوراً اس کے پیچھے آیا۔

''جس کا تم مذاق اڑا رہے ہو وہ ہر سال انگلش کمپوزیشن، انگلش لٹریچر اور انگلش گرامر میں ساری کلاس میں سب سے زیادہ مارکس لیتا ہے۔

مرچنٹ آف وینس تم نے آج پڑھا ہے وہ کئی سال پہلے پڑھ چکا تھا Sassanio, Portia, Antonio اور Shylock سے تم اب واقف ہوئے ہو وہ کئی سال سے واقف ہے۔ تم سے اگر شیکسپیئر کے کل لکھے گئے Plays اور پوئٹری پر سوال کروں تو تم یہ تک نہیں جانتے ہو گے کہ اس نے کل کتنے Plays اور کتنے Sonnets لکھے اور Plays کامیڈی کے زمرے میں کون سے Plays آتے ہیں ہسٹری اور ٹریجڈی کے خانے میں کون کون سے آتے ہیں اور ان کے نام کیا کیا ہیں جبکہ وہ شیکسپیئر کو پورا کا پورا کب کا پڑھ چکا ہے۔" وہ لائبریری میں کھڑی، اس کا لحاظ کیے بغیر چلائی۔

"دیا پلیز...... جانے دو...... ختم کرو......" میں نے اسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچنا چاہا۔ وہ آٹھوں کے آٹھوں ہم دونوں خاص طور پر ودیعہ کو دیکھ کر خاصے گھبرا گئے تھے۔

"اور آصف ہمدانی! عمر حسن اردو اور انگلش میں بہترین مارکس تمہاری طرح میرے نوٹس اور اسائمنٹس رٹ کر یا چیٹنگ کر کے نہیں، اپنی محنت اور قابلیت سے لاتا ہے۔"

"ودیعہ سوری، ہم لوگ تو بس یونہی۔" ان میں سے چند ایک نے معذرتی اور وضاحتی جملے بولنے کی کوشش کی، مگر وہ پیر پٹختی انہیں وضاحت کا موقع دیے بغیر لائبریری سے باہر نکل آئی۔

"تم کیوں لڑیں دیا۔" میں اس کے پیچھے پیچھے آ گیا تھا۔ وہ کبھی کسی سے لڑتی نہیں تھی، کبھی کسی پر اپنے نوٹس اور اسائمنٹس دینے کا احسان جتاتی نہیں تھی، اس کا میری خاطر لڑنا مجھے اس لیے برا لگا کہ بلاوجہ وہ میری وجہ سے کلاس فیلوز سے اپنے تعلقات بگاڑ رہی تھی۔

"مرضی میری، میں لڑوں یا جو بھی کروں۔" اس کا موڈ بے انتہا خراب تھا۔

جس طرح اس کی کامیابیوں پر میں اس سے زیادہ خوش ہوتا تھا اسی طرح میری انسلٹ پر اسے مجھ سے زیادہ دکھ ہوتا اور غصہ آتا تھا۔ میں آج کے تمام واقعات پر کتنا ہرٹ ہوا ہوں، اپنی فیلنگز پر توجہ دینے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔ میں بس کسی بھی طرح ودیعہ کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔

"دیا پلیز اپنا موڈ ٹھیک کرو ناں۔" وہ گھر آ کر کھانا کھانے کے بجائے اپنے کمرے میں...... چلی گئی تھی۔ ابا میاں آج کہیں لنچ پر مدعو تھے اس لیے لنچ پر صرف ہم ہی دونوں تھے۔ وہ غصے میں بھری منہ پھلا کر بیٹھی تھی۔

"آصف ہمدانی اور اس کا گروپ آئندہ مجھ سے میرے نوٹس اور اسائمنٹس مانگ کر دیکھے۔"

"دیا! وہ لوگ غلط تو نہیں کہہ رہے تھے۔ تمہیں اس لیے برا لگ رہا ہے کیوں کہ میں تمہارا دوست ہوں، ورنہ میم اور آصف ہمدانی سب لوگ میرے بارے میں ٹھیک کہہ رہے تھے۔" میں نے رسانیت سے اسے سمجھانا چاہا۔

"کیا ٹھیک کہہ رہے تھے؟ اتنا انگلش اور اردو لٹریچر تو خود میم نے ابھی تک نہیں پڑھا ہو گا جتنا تم پڑھ چکے ہو۔ وہ سمجھتی ہیں مرچنٹ آف وینس ان سے سن کر تم نے سمجھا ہے۔ اگر میں انہیں اور آصف ہمدانی کو یہ بتا دوں کہ تم کتنا کچھ پڑھ چکے ہو تو وہ......"

"دیا! کیوں اپنا خون جلا رہی ہو۔ میم غلط نہیں تھیں آصف بھی غلط نہیں تھا۔ وہ لوگ ٹھیک کہتے ہیں میں ڈفر ہوں۔ کتابیں پڑھ لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

''اور جو تم اتنی اچھی کہانیاں سناتے ہو وہ؟'' اس نے مجھے گھورا۔

''ان لوگوں کو کہانیوں کا کیا پتا؟ اور ویسے بھی وہ کہانیاں بھی کوئی خاص نہیں ہوتیں اور پلیز اب تم اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ بوا جی نے اتنے مزے کا کھانا پکایا ہوا ہے چلو ناں بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا کھا کر ہم جلدی سے اسکول کا کام کر لیں گے اور پھر میں تمہیں ایک بہت زبردست کہانی سناؤں گا۔ بالکل تمہاری پسند کی۔''

میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر زبردستی کھڑا کیا اور ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ سلاد کے باؤل میں سے سلاد کے پتے چن چن کر میں اس کی پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔ ہمیشہ یہ کام اس کے کہنے پر کرتا تھا جبکہ آج اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی خاطر از خود کر رہا تھا۔

''بکریوں کا چارہ کھایئے میڈم۔''

میں سلاد کے پتوں کے متعلق یہی کہہ کر اسے چڑاتا تھا۔ میں اپنی پلیٹ صاف کر چکا تھا، اٹھ کر فریج میں سے بالائی نکال کر لے آیا۔ میٹھے کے ہم دونوں شوقین تھے اور ٹھنڈی ملائی پر چینی ڈال کر پراٹھے یا روٹی کے ساتھ ہم بڑے شوق سے کھاتے تھے۔ ایک ہی پلیٹ میں ساتھ مل کر ٹھنڈی ملائی کھانے کے بعد اس کا موڈ بہتر ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد ہم دونوں نے اگلے روز ہونے والے ٹیسٹوں کی تیاری کی، دوسرا سارا کام نمٹایا اور پھر ہم دونوں سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ودیعہ مجھ سے تین اسٹیپس اوپر بیٹھی تھی۔

''عمر! آج کوئی بہت اچھی سی کہانی سناؤ تھوڑی ہنسی مذاق والی ایسی جو آج ہی ختم ہو جائے اور کہانی انگلش میں سناؤ۔''

میں کہانیاں ہمیشہ اسی کے فرمائشی پروگرام کے تحت سناتا تھا۔ ان تمام فرمائشوں میں سے کوئی فرمائش نئی نہیں تھی۔ اس کے لیے مجھ سے کہانی سننا ایسا تھا جیسے کوئی کہانی کی کتاب پڑھنا۔ کسی دن اس کا موڈ اردو کی کتاب پڑھنے کا ہوتا اور کسی دن انگلش کی۔ میں جو کہانی سنانے والا تھا وہ خاصی طویل تھی اسی لیے اسے کینسل کر کے جلدی سے ایک دوسری کہانی سوچی جو آج ہی شروع ہو کر آج ہی ختم ہو سکے۔

''تم یہ کیا لے کر بیٹھی ہو؟'' میں اس کے ہاتھ میں کیمسٹری کا جنرل اور پین دیکھ کر خاصی حیرت سے بولا۔

''تھوڑا سا کام رہ گیا تھا کیمسٹری کا۔ بس لکھنے کا کام ہے۔ تم کہانی سناؤ میں یہ لکھتی بھی جاؤں گی اور کہانی سنتی بھی جاؤں گی۔'' وہ میری کہانیاں ہمیشہ پوری توجہ سے سنتی تھی اس دوران دوسرا کام نہیں کرتی تھی اسی لیے یہ بات مجھے بہت بری لگی مگر چونکہ اس کا موڈ دوبارہ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کچھ کہے بغیر کہانی سنانی شروع کر دی۔ یہ کہانی کیونکہ ابھی ابھی سوچی تھی اس لیے سنانے کی رفتار سست اور ڈائیلاگز ساتھ ساتھ ذہن میں ترتیب دینے کی وجہ سے خاصی سست تھی۔

وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھ تک نہیں رہی تھی تیزی سے کیمسٹری کے جنرل پر لکھے چلے جا رہی تھی۔ مگر چونکہ وہ ہنسنے اور قہقہہ لگانے والے جملے پر کھل کر ہنس رہی تھی اس لیے میں یہ بدگمانی نہیں پیدا کر رہا تھا کہ وہ توجہ سے کہانی سن نہیں رہی۔ میں کہانی سنا چکا تو وہ جنرل بند کر کے فوراً سیڑھی پر سے اٹھ گئی۔ ''دم کہانی کیسی تھی ودیا؟''

''تمہاری کہانی ہمیشہ اچھی ہوتی ہے عمر۔'' وہ مختصر سا جملہ بول کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''اس کا موڈ ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔'' رات میں کھانا کھاتے ہی جب وہ فوراً اپنے کمرے میں سونے چلی گئی تب میں نے بھی سوچا۔ شکر تھا کہ اگلی صبح اس کا موڈ بالکل ٹھیک تھا۔

''تم رات دیر تک جاگی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں کی سرخی اور بوجھل پن کو محسوس کیا تھا۔

''ہاں کمرے میں جا کر نیند بھاگ گئی تو ایک بک پڑھنے لگی تھی۔'' اس نے لاپروائی سے کہا تھا۔

یہ اس روز سے دس یا پندرہ دن بعد کی بات تھی جب میں نے ودیعہ کے چہرے پر کچھ غیر معمولی خوشی دیکھی۔

''تم کس بات پر خوش ہو؟'' میں نے کئی بار اس سے پوچھا اور وہ مجھے ٹال گئی۔ میں وجہ نہیں جانتا تھا مگر یہ معلوم تھا کہ وہ کسی بات پر بہت خوش ہے۔

''تمہیں بتا دوں گی خوشی کی وجہ، تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔ بھئی یہ سرپرائز ہے۔'' میں خفا ہونے لگا تو اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

اور یہ پورے ایک مہینے کی بات تھی جب میں ایک دن کی چھٹی کے بعد اسکول گیا تو وہاں کافی کچھ بدلا ہوا نظر آیا گزشتہ روز مجھے بخار ہو گیا تھا اس لیے میں اسکول نہیں آیا تھا۔

''میں ایک دن بعد آیا ہوں یا ایک سال بعد جو سب مجھے اتنی حیرت سے اور اس قدر بغور گردنیں گھما گھما کر دیکھ رہے ہیں۔''

اپنی کلاس میں آتے ہی میں خود کو تمام کلاس فیلوز کی نگاہوں کے حصار میں دیکھ کر پریشان ہوا۔

''انگلش کا پیریڈ ختم ہو جائے پھر میں دیا سے پوچھوں گا کہ سب مجھے اتنا گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔''

میں سب کی نگاہوں سے کنفیوز ہو رہا تھا۔ کئی بار سر سے پاؤں تک اپنا جائزہ لے چکا تھا۔ میرے کپڑے، جوتے، بال اور منہ ہر چیز بالکل ٹھیک تھی پھر مسئلہ کیا تھا۔ انگلش کی ٹیچر کلاس میں آئیں تو انہوں نے میرے تمام کلاس فیلوز سے بھی زیادہ غور سے مجھے دیکھا۔

''تمہاری کہانی بہت زبردست ہے عمر...... بظاہر لگتا نہیں کہ تم اس طرح کوئی Creative کام بھی کر سکتے ہو۔'' انہوں نے مجھے مخاطب کیا۔

''کہانی؟'' میں ہونق نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''دیا! یہ ابھی میم کیا کہہ رہی تھیں اور سارے کلاس فیلوز مجھے اتنا گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہیں۔'' پیریڈ ختم ہوتے ہی میں ودیعہ کے پاس آیا۔ وہ جواب میں کچھ کہے بغیر مسکرائی اور پھر اپنے بیگ سے کچھ نکالنے لگی۔

''یہ دیکھ لو۔ تمہیں سب کے گھورنے کی وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔'' وہ ہمارے اسکول میگزین کا تازہ شمارہ تھا۔ میگزین کھول کر اس نے فہرست والا صفحہ کھولا اور ایک جگہ انگلی رکھی۔

''Colours of Life'' نام کی کہانی کے آگے عمر حسن لکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک دم ہی میگزین اس کے ہاتھ سے جھپٹا، اور فہرست میں دیا صفحہ نمبر دیکھ کر مطلوبہ جگہ پہنچا۔ پہلی سطر پر نظر پڑتے ہی میں پورا کا پورا اہل گیا۔ وہ میری کہانی تھی۔ میری کہانی جو اس شام میں نے ودیعہ کو سنائی تھی۔

''تھوڑا سا کام رہ گیا تھا کیمسٹری کا تم کہانی سناؤ۔ میں نے لکھتی بھی جاؤں گی اور کہانی سنتی بھی جاؤں گی۔'' میں نے بے یقینی سے ودیعہ کو

دیکھا۔ زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا جب مجھے ودیعہ پر غصہ آیا ہو۔ میں اس پر چلایا ہوں، اس سے لڑا ہوں مگر اس پر میرا دل چاہا میں اس کے منہ پر کھینچ کر ایک تھپڑ ماردوں۔ اس نے مجھے دھوکہ دیا۔ میں اس پر اندھا بھروسہ کرتا ہوں۔ اپنا ہر احساس اس سے شیئر کرتا ہوں اور وہ میرے احساسات کا تماشا بنوا رہی ہے۔ میں اسے کیا سناتا ہوں یہ کسی اور کو کبھی معلوم نہیں ہونا چاہیے ابا میاں تک کو نہیں۔ ہمارے بیچ پر ایک ان کہا اور ان لکھا معاہدہ تھا۔ پھر اس نے اسے توڑا کیوں؟

میں مزید ایک پل بھی اس کے پاس ٹھہرتا تو اپنا ضبط کھو بیٹھتا نجانے ساری کلاس کے سامنے اسے کیا کہہ دیتا اس لیے میگزین اس کی ڈیسک پر پھینک کر میں فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ غم و غصے میں پاگل سا ہو گیا، میں کلاس سے باہر نکل آیا تھا۔

''عمر میری بات سنو پلیز۔'' وہ میرے پیچھے آرہی تھی۔

''اوہ عمر تم.....'' ہمارے میگزین کی انچارج میڈم سلمٰی جو سامنے سے آرہی تھیں مجھے مخاطب کیا۔ وہ کسی کلاس سے باہر نکلی تھیں۔

''بھئی بہت اچھا لکھتے ہو تم عمر۔ اگر یہ تمہاری پہلی تحریر ہے تو میں واقعی بہت حیران ہوں۔ اور حیرت تو مجھے تمہاری میچورٹی پر بھی ہے، اس عمر میں یہ پختگی اور روانی، تمہارے کئی جملوں پر تو میں باقاعدہ حیرت سے گنگ رہ گئی تھی۔ یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ تمہاری ایج کا کوئی لڑکا اتنا میچور انداز میں تحریر لکھ سکتا ہے۔ زبردست، بھئی زبردست۔

Keep it up young boy''

میں اس تعریف پر خوش نہیں بلکہ مزید غصے میں آگیا تھا۔ میرے برابر میں کھڑی ودیعہ کچھ ڈر کر اور کچھ آس سے میری طرف یوں دیکھ رہی تھی کہ شاید اس تعریف پر میرا غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔

''عمر پلیز مجھ سے ناراض مت ہو۔ اس روز جب امبر میم، آصف ہمدانی اور اس کے گروپ نے تمہارے بارے میں برے کمنٹس دیے تو مجھے بہت غصہ آیا تھا میرا دل چاہا تھا کہ میں انہیں اور ساری دنیا کو یہ بتاؤں کہ تم کتنے جینئس ہو، کتنے ایکسٹرا اورڈنری ہو، کتنے زیادہ ٹیلنٹڈ ہو۔''

''اس لیے تم نے مجھے بتائے بغیر، میری اجازت لیے بغیر، میری کہانی لکھ کر میگزین میں دے دی۔'' میں ان کی بات کاٹ کر چلایا۔ ہم دونوں اسکول سے گھر آچکے تھے اور اب پورچ ہی میں کھڑے یہ جھگڑا ہو رہا تھا۔

''میری کہانیاں صرف تمہارے لیے تھیں وہ کسی اور کے لیے ہرگز ہرگز نہیں تھیں۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا تھا ودیعہ کمال کہ تم مجھے جینئس اور ایکسٹرا آرڈنری ثابت کرو؟ میں نے تو نہیں دیا۔ نہیں ہے شوق مجھے لوگوں پر اپنی قابلیت ثابت کرنے کا۔ نہیں ہے شوق مجھے لوگوں کو اپنی صلاحیتیں دکھانے کا۔

تم نے میرا بھروسا توڑا ہے ودیعہ میں اب کبھی تمہیں کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ میں اب کبھی تم پر اعتبار نہیں کروں گا۔ تم اس قابل ہی نہیں ہو کہ تم پر اعتبار کیا جائے۔''

میرے الفاظ اسے کتنی تکلیف پہنچا رہے ہیں اس کی پروا کیے بنا میں بولے چلا گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ میں اسے

وہیں کھڑا چھوڑ کر سیدھا اپنے کمرے میں آ گیا۔ یونیفارم اور جوتے اتارے بغیر میں بیڈ پر اوندھا لیٹ گیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے کمرے میں رو رہی ہے۔ بے تحاشا رو رہی ہے۔ کوئی اور اسے رلائے میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تو خود کس طرح رلا سکتا ہوں؟ میں ایک دم ہی بیڈ سے اٹھا اور سیدھا اس کے کمرے تک پہنچا۔ میرے ناک کرنے پر اس نے دو، تین سیکنڈ کی دیر لگا کر دروازہ کھولا۔ جس طرح اپنے کمرے میں لیٹے میں اس کا رونا جانتا تھا اس طرح یہ بھی کہ اس نے دستک سن کر جلدی جلدی اپنے آنسو صاف کیے ہیں اور یہ دو تین سیکنڈ اسی لیے لگے ہیں۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ اسے جیسے امید نہیں تھی کہ اتنے چیخنے اور اس قدر لڑنے اور غصہ کرنے کے بعد اس کے پاس آ بھی سکتا ہوں۔

''آئم سوری دیا، میں نے تم پر اتنا غصہ کیا۔ مجھے اس طرح سے چلانا نہیں چاہیے تھا۔''

میں اس کے کمرے کے اندر آ چکا تھا۔

''لیکن تم اب بھی مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے، کبھی مجھے کوئی کہانی نہیں سناؤ گے؟''

اس نے میرے ہی الفاظ سوالیہ لہجے میں دہرائے۔ اس کی آنکھوں میں پھر سے آنسو جھلملانے لگے تھے یوں جیسے اگر میں نے ان سوالوں میں سے کسی ایک کا بھی اثبات میں جواب دے دیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گی۔

''کروں گا، ہمیشہ تم پر اعتبار کروں گا اور میری کہانیاں تو تمھیں ہی صرف تمہارے لیے۔ تب ہی تو مجھے غصہ آیا تھا۔''

''جب تمہاری کہانیاں میرے لیے ہیں تو پھر وہ کہیں چھپیں گی یا پھینکیں گی، یہ فیصلہ کرنے کا حق بھی صرف مجھے ہے۔ میں جو چاہے ان کہانیوں کے ساتھ کروں۔ میری مرضی۔''

وہ روٹھے لہجے میں ضدی پن سے بولی۔

''تم کہانیاں میرے لیے بناتے ہو مگر انہیں آئندہ سنا سب کریں گے عمر حسن۔''...... ''لیکن دیا''

''کوئی لیکن نہیں......'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''کوئی تمہیں برا سمجھے، تمہاری برائی کرے تو میرا دل چاہتا ہے اس کا منہ نوچ لوں۔ ٹھیک ہے تم آصف ہمدانی کی طرح اسپورٹس میں اچھے نہیں ہو، اس کی طرح کلاس میں ہر وقت بک بک کر کے خود کو نمایاں بھی نہیں کر سکتے مگر عمر! ابا میاں کہتے ہیں ہر آدمی ہر کام نہیں کر سکتا۔ جو تم کر سکتے ہو وہ ہماری پوری کلاس میں تو کیا پورے اسکول میں کوئی نہیں کر سکتا۔ آصف سے اگر میں کہوں کہ مجھے ایک کہانی لکھ دو تو کیا وہ لکھ پائے گا؟ وہ چند سطریں بھی نہیں لکھ سکے گا۔''

میں اب کچھ بھی کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ پہلی بار ضدی لہجے میں مجھ سے کچھ منوانا چاہتی تھی اور دو یہ کمال کو نہ کہنا مجھے آتا نہیں تھا۔ وہ اب مجھے یہ بتا رہی تھی کہ کہانی مجھ سے سننے اور اسے ساتھ ساتھ تیز رفتاری سے لکھنے کے بعد اس نے اس رات کافی دیر تک جاگ کر میری کہانی کو فیئر کیا تھا۔ بولنے اور لکھنے میں بات تھوڑی سی مختلف ہو جاتی ہے۔ بولتے وقت میں نے بعض جملے گھڑی گھڑی دہرائے تھے۔ اس نے ان دہرائے جانے والے سب لفظوں اور جملوں کو درست کیا تھا۔ میرے جملوں کی قطع برید کرنے اور نوک پلک سنوارنے کے بعد اس نے اس کہانی کا اچھا سا عنوان تجویز کر کے اگلے ہی روز اسے میڈم سلمیٰ کے حوالے کیا تھا۔

"پتا ہے عمر! میڈم سلمٰی نے مجھ سے تمہاری کہانی کے بارے میں کیا کہا تھا؟ وہ کہہ رہی تھیں یقین نہیں آ رہا کہ چودہ، پندرہ سال کے کسی لڑکے نے اسے لکھا ہے۔"

وہ مجھے مختلف ٹیچرز اور کلاس فیلوز کے تعریفی تبصرے سنا رہی تھی۔ میری تعریف اور خوشی کے جو رنگ اس کی آنکھوں میں تھے انہیں میں نظر انداز کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں کہانیاں لکھوں تو میں اس کی خواہش پوری کرنے پر خود کو مجبور پاتا تھا اور اب کہانیاں لکھنے کے سوا میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ کیسی چاہ تھی یہ، اس لڑکی کی آنکھوں میں سدا خوشیاں دیکھنے کی۔

☆☆☆

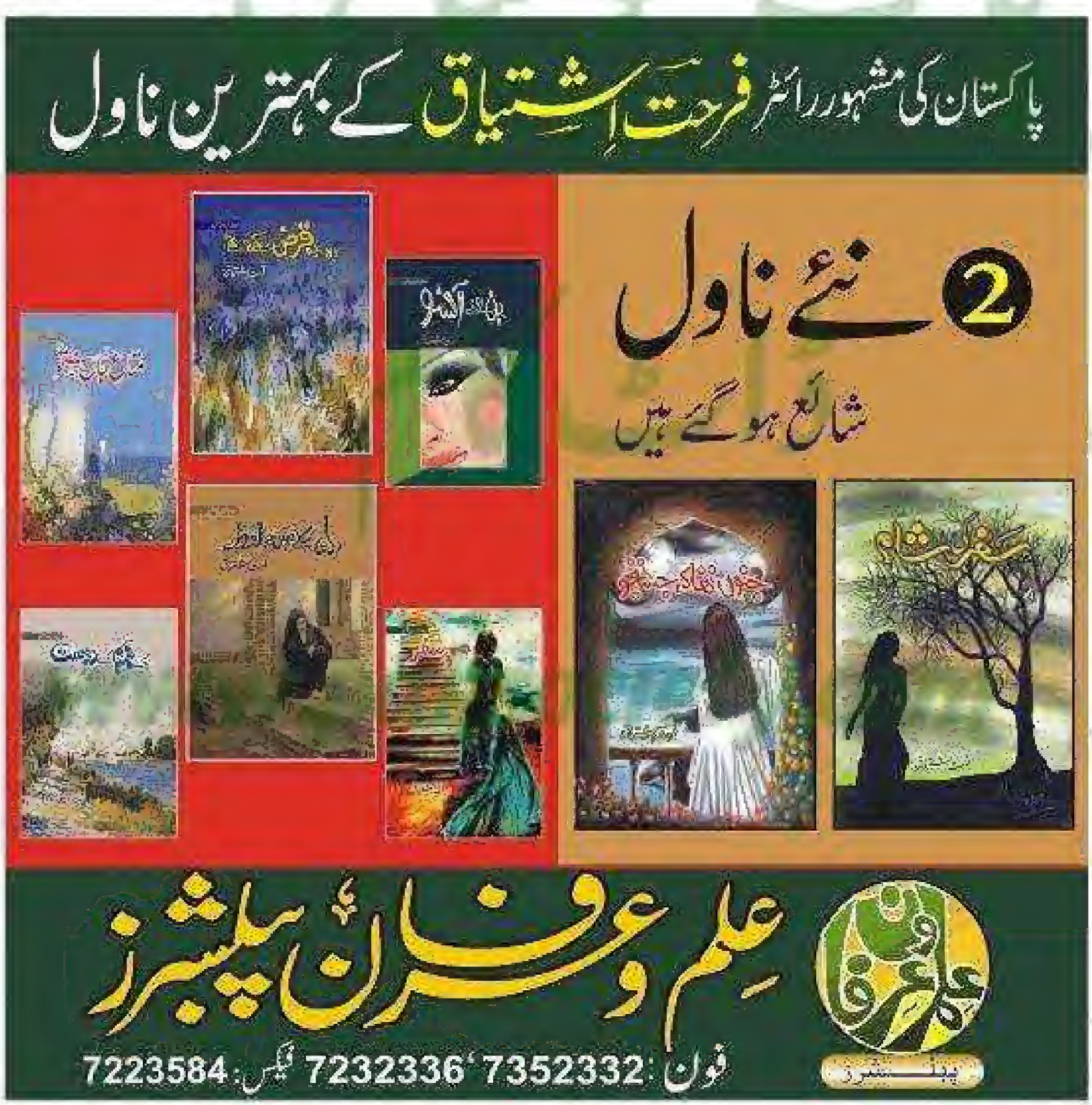

اور پھر یوں زندگی کے چودھویں سال میں، میں نے کہانیاں سوچنے کے ساتھ انہیں لکھنا شروع کیا۔ ودیعہ بہت منع کرنے کے باوجود میگزین ابا میاں، انکل اور آنٹی کو دکھانے لے گئی تھی۔ ابا میاں، انکل، آنٹی تینوں مجھے ایک شرمیلا اور معصوم سمجھتے تھے۔ مجھے ان کے سامنے اپنے احساسات کو بے پردہ کرواتے جھجک ہو رہی تھی مگر ودیعہ نے میری ایک نہ سنی تھی۔ اسے جیسے سارے جگ میں میری اس اولین کامیابی کا ڈھنڈورا پیٹ دینا تھا۔ وہ کامیابی جس کے حصول کے لیے میں نے کوئی جدوجہد کی بھی نہیں تھی۔

''ابا میاں! دیکھیں عمر کی کہانی چھپی ہے۔'' ابا میاں، آنٹی، انکل تینوں حیران ہوئے تھے۔ انہیں جیسے مجھ جیسے کم آمیز اور کم سخن سے اس طرح کے کسی کام کی توقع ہی نہیں تھی۔ آنٹی، انکل نے تو مجھے شاباشی دے کر اور خوشی کا اظہار کر کے موضوع تبدیل کر دیا تھا مگر ابا میاں نے وہ کہانی پوری پڑھی تھی۔ کہانی پڑھ چکنے کے بعد انہوں نے ستائش بھری حیرت سے مجھے دیکھا اور سب کی طرح انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ ''یقین نہیں آتا یہ کہانی تم نے لکھی ہے۔'' تعریف میں چھپا در پردہ یہ شک کہ ضرور یہ میں نے کہیں سے نقل کی ہے مگر یہ ضرور بولے۔

''عمر! میں حیران بھی ہوں اور خوش بھی۔ تمہاری عمر کا کوئی لڑکا انسانی جذبات و احساسات کا اتنا گہرا مشاہدہ بھی رکھ سکتا ہے؟ تم لکھنا جاری رکھو عمر! میں تم میں ایک رائٹر دیکھ رہا ہوں۔ ایک بہت بڑا رائٹر۔''

ابا میاں کی تعریف پر ودیعہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی اور میں صرف مسکرا رہا تھا۔ میں اسے حوصلہ افزائی ہی سمجھتا تھا، اسے میں نے سچ نہیں مان لیا تھا۔ ودیعہ کے لیے ابا میاں کی تعریف سند کا درجہ رکھتی تھی۔ ایک بہت بڑے نقاد کا کسی نوآموز لکھنے والے کے کام پر تعریفی تبصرہ، میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ابا میاں نے میری تحریر کو ایک نقاد کی نہیں، ایک باپ کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

یہ ہماری تعلیمی زندگی کا بہت اہم دور تھا۔ میں اس وقت اپنی تمام تر توجہ پڑھائی پر رکھنا چاہتا تھا اور ودیعہ چاہتی تھی کہ پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں لکھوں بھی۔

پہلی کہانی کے فوراً بعد اس نے زور دے کر مجھ سے دوسری کہانی لکھوائی۔ ''سہ پہر اور شام میں روزانہ جس وقت تم مجھے کہانی سناتے تھے، بس اس وقت لکھو۔''

ہمارا کہانیاں سننے اور سنانے کا ایک لمبا دورانیوں ختم ہو چلا تھا کہ اب اسے کہانیاں سنانے کے بجائے میں کہانیاں لکھتا تھا۔ پہلی مرتبہ لکھنے بیٹھا تو عجیب سی الجھن ہوئی۔ کیسے لکھوں گا؟ مجھے تو لکھنا نہیں آتا۔ کہانی ذہن میں ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ سنانا اور بات ہے، لکھنا اور، ودیعہ اس بات کو سمجھتی کیوں نہیں ہے۔ میں بڑا کہیں کا رائٹر ہوں۔ الجھتے الجھتے میں نے قلم ہاتھ میں لیا۔ کاغذ اپنے سامنے کیے پھر کیا ہوا؟ مجھے ایک پل کے لئے بھی سوچنا نہیں پڑا جو میرے ذہن میں تھا، اسے میں بڑے آرام سے، روانی سے لکھے چلا جا رہا تھا۔ ارے یہ کام تو بالکل مشکل نہیں۔ رات دیر تک جاگ کر میں نے کہانی مکمل کر لی تھی اور صبح ودیعہ کو دکھائی تھی۔ کہانی کا خلاصہ زبانی میں اسے لکھنے سے پہلے ہی سنا چکا تھا۔

اس نے کہانی پڑھی اور حسب عادت واہ واہ اور تعریفیں کرنا شروع ہو گئی۔ میری وہ کہانی بھی فوراً شائع ہو گئی تھی اور اس بار ودیعہ نے مجھ سے چھپ کر نہیں بلکہ میں نے خود جا کر میڈم سلمٰی کو اپنا مسودہ دیا تھا۔ تیسری کہانی ودیعہ کے اصرار پر میں نے بچوں کے ایک میگزین میں بھیجی۔ میں

بھیجتے ہوئے گھبرا رہا تھا، کہانی شائع نہیں ہوئی تو ودیعہ کو دکھ ہوگا اور وہ بضد تھی کہ بھیجو۔ میں نے یہ یقین رکھتے کے ساتھ کہ میری کہانی بچوں کے اس میگزین میں جگہ نہیں پاسکے گی، اسے پوسٹ کردیا۔ وہ کہانی شائع ہوئی تھی اور بغیر کسی طویل انتظار کے شائع ہوئی تھی۔

اب تو جیسے ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ اسکول میگزین، بچوں کے میگزین۔

''تم اس روز جو آئیڈیا مجھ سے ڈسکس کررہے تھے، اس پر کہانی لکھو۔ ایک تو آئیڈیا منفرد ہے، اس پر تمہارے لکھنے کا زبردست انداز۔ دیکھنا سب کو کتنی پسند آئے گی۔ تمہاری کہانی۔''

وہ مجھ سے اصرار کرکے، مجبور کرکے، دھمکیاں دے کے، ناراض ہو کے، حق جتا کے، کسی نہ کسی طرح لکھوا لیا کرتی تھی۔ میں اپنا ہر آئیڈیا اس سے ڈسکس کرنے کے بعد اس پر کہانی لکھتا، میرے لکھنے کے بعد وہ اسے پڑھتی۔ اس پر تعریف اور تنقید دونوں کرتی اور پھر میں اسے پروڈاک کرتا۔ میں نے خود کو رائٹر سمجھنا شروع نہیں کردیا تھا۔ یہ سب تو بس یونہی تفریحاً تھا مگر پھر بھی میں ودیعہ کی تنقید کو بہت توجہ سے سنتا۔ میری جس بات پر اس نے اعتراض کیا ہوتا، اگلی بار اسے بالکل نہ دہرایا۔ اسکول میں، میں ایک دم سے مشہور ہوگیا تھا۔ میرے کئی کلاس فیلوز اور بہت سے جونیئر، بچوں کا وہ منتقل میگزین ذوق وشوق سے پڑھتے تھے جس میں میری کہانیاں شائع ہورہی تھی۔ وہ سب مجھے اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ سب مجھ سے میری کہانیوں کے متعلق باتیں کرنا پسند کرتے تھے۔ میں ابھی بھی کم گو تھا۔ جب بولنے کی بات آئی تو کسی کے لمبے لمبے فقروں کے جواب میں چند لفظ ہی بول پاتا۔

کراچی کے مختلف اسکولز کے بچوں کے درمیان Story writing competition ہوا تھا۔ اس مقابلے میں ہمارے اسکول سے میری کہانی منتخب ہوئی تھی اور جب مقابلے کا نتیجہ آیا تو اس میں میری کہانی کو اول انعام ملا تھا۔ ودیعہ خوشی سے پاگل ہورہی تھی اور میں حیران ہورہا تھا۔

''تو کیا واقعی دیا ٹھیک کہتی ہے، میں کیا واقعی اچھا لکھتا ہوں؟'' میں بہت خوش تھا۔ غلط کہتا تھا میں ودیعہ سے کہ مجھے لوگوں پر اپنی قابلیت جتانے کا شوق نہیں تھا مگر جب ہمارے اسکول کے پرنسپل نے مجھے اپنے آفس میں بلا کر تعریفی سرٹیفکیٹ، شاباش اور مبارک باد دینے کے بعد یہ پوچھا کہ میرے والد کیا کرتے ہیں تو میں ایک حسین خواب سے جاگا۔ آسمان سے اتر کر واپس زمین کی گہرائیوں پر آیا۔ ان کا انتقال ہوچکا ہے کہ بعد بھی مزید سوالات تھے۔ جب وہ زندہ تھے تو کچھ تو کرتے ہوں گے۔

''اس عمر میں اتنا پختہ انداز تحریر رکھنے والا لڑکا شاید کسی بڑے رائٹر ہی کا بیٹا ہے۔''

وہ محض اس وجہ سے یہ سوال پوچھ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کیا جھوٹ بولوں۔

''وہ رائٹر تھے، وہ ڈاکٹر تھے، وہ انجینئر تھے، وہ وکیل تھے، وہ پائلٹ تھے۔''

مور ناچتا ناچتا اپنے پیروں کو دیکھ کر رو پڑتا ہے نا۔ میرے ساتھ بھی زندگی بھر ایسا ہی رہا۔ جب کبھی میں نے پورے دل سے خوش ہونا چاہا، قہقہے لگانے چاہے میری ذات سے وابستہ ایک کڑوی سچائی میرے روبرو آکر کھڑی ہوگئی۔ کہیں خوشی سے سرشار ہوتے کسی لمحے میں باپ کا فرضی نام لکھتے یا بولتے رو پڑا تو کبھی کسی نے ماں اور باپ کے بارے میں کوئی سوال کرکے ہر بھولی سچائی یاد دلا کے قہقہوں کو آنسوؤں میں بدل دیا۔ میں اپنے پاؤں مضبوطی سے زمین پر جما کر کبھی کھڑا ہو ہی نہیں سکا۔

ایک بات ہے جو مجھے لوگوں سے ہر حال میں چھپائے رکھنی ہے، ورنہ وہ مجھے کبھی برابری کا درجہ نہیں دیں گے۔ اس خوف اور اس ڈر نے مجھے زندگی میں کبھی سر اٹھا کر کھڑا نہیں ہونے دیا۔ کسی بھی انسان کا اپنی پیدائش پر اختیار نہیں۔ میرا بھی نہیں تھا۔ میں اگر کسی گمنام ماں باپ کی اولاد تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا مگر کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی میں نے ساری زندگی اس قصور کی سزا کاٹی۔ میں ان دو لوگوں سے اکثر نفرت نہیں کرتا تھا تو کبھی محبت بھی نہیں کر سکا تھا۔ وہ دو لوگ جو میرے لیے زندگی کو اس قدر مشکل بنا گئے تھے جو میرے لیے صرف اور صرف ذلتیں اور رسوائیاں چھوڑ کر گئے تھے۔

☆☆☆

10th گریڈ میں آ کر میں نے بچوں کے لیے لکھنا ترک کر کے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ہی اسکول کے چند بچوں کو ٹیوشنز پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ میں جو کہانیاں ودیعہ کو سناتا ہوں، وہ کبھی لکھوں گا بھی۔ یہ میں نے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ ایسی سوچ کبھی میرے خواب و خیال میں بھی نہ آئی تھی مگر جب ودیعہ کے کہنے پر اسی کی خاطر لکھنا شروع کیا تو کچھ مختلف پایا یا مشکل محسوس نہیں ہوا۔

میرے لیے کہانی لکھنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں وہ ودیعہ کو سنا رہا ہوں۔ اپنی زبان سے بول کر نہیں تو ہاتھوں سے لکھ کر۔ سنانا بھی اس کے لیے تھا اور لکھنا بھی، فرق صرف اتنا تھا کہ سنتی وہ اکیلی تھی اور لکھا ہوا اس کے علاوہ دوسرے لوگ بھی پڑھتے تھے۔ اپنا لکھا ہوا چھپتا دیکھنا اور اس پر تعریفیں وصول کرنا مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔

بچوں کی کہانیاں لکھتے لکھتے بڑوں کے لیے لکھنا شروع کیا تو ودیعہ ہی کے مشورے سے ایک میگزین میں تحریریں بھیجنی شروع کر دیں، اپنے اصلی نام سے نہیں بلکہ قلمی نام سے۔ پہلی مرتبہ ادبی حوالے سے اچھی شہرت کے حامل اس بڑے میگزین میں اپنی تحریر بھیجتے وقت میں بہت گھبرا رہا تھا، جھجک ہو رہی تھی۔ قلمی نام سے بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ میں خود کو چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اگر ودیعہ کی تعریفیں سچی ثابت ہوئیں اور میرا افسانہ شائع ہو گیا تو ابا میاں اور تمام ملنے والوں کے سامنے مجھے کتنی شرمندگی ہوگی۔ وہ افسانہ ایک پندرہ سال کے لڑکے کا نہیں بلکہ ایک تیس بتیس سال کے میچور مرد کا لکھا ہوا لگتا تھا۔ اسے ایک پندرہ سال کے بچے نے لکھا ہے اس ایک بات کے سوا اس میں کچھ بچوں والا نہیں تھا۔ ابا میاں اور دوسرے سب لوگ کیا سوچیں گے، میں اس عمر میں ایسی باتیں سوچتا ہوں؟ اتنی بڑی بڑی؟ اور پھر اس میگزین کے ایڈیٹر جو ایک سے بڑھ کر ایک عالم فاضل اور قابل مصنفین کے ادبی شاہکار اپنے میگزین میں شائع کرتے ہیں، کیا اسکول کے ایک بچے کی تحریر شائع کریں گے؟

میرے لیے بہتر یہی تھا کہ میں خود کو ایک قلمی نام اور فرضی تعارف کے پیچھے چھپا لوں۔ میرا لکھا کبھی کسی ایڈیٹر نے رد نہیں کیا تھا۔ میں خود کو چھپائے رکھنا پسند کرتا ہوں، میرے متعلق یہ رائے قائم کر لی گئی اس کے باوجود میری ہر تحریر کی اشاعت کے بعد ایڈیٹرز مجھے تعریفی خط لکھتے جس میں اپنے میگزین کے لیے مجھ سے مزید لکھنے کو کہا جاتا۔ میرے نام آنے والا کسی بھی ایڈیٹر کا تعریفی و فرمائشی خط ودیعہ کا سیروں خون بڑھا دیتا۔

میرے ذہن میں آنے والی خرافات اور من گھڑت قصے کہانیاں جنہیں میں صرف ودیعہ کو خوش کرنے کی خاطر تخلیق کیا کرتا تھا، کے ذریعہ کبھی میں روپے بھی کما سکوں گا ایسا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ میرے لکھے لفظ پیسہ کما کر دے سکتے ہیں۔ پہلا اعزازیہ وصول کرتے وقت میں نے

حیرت سے سوچا۔ بہت کم سہی پر وہ قلیل رقم میں نے اپنی محنت سے کمائی تھی اور اپنی پہلی کمائی مجھ کم اعتماد میں خاصا اعتماد پیدا کر گئی تھی۔

اپنے پہلے اعزازیہ کے تمام پیسے میں نے ودیعہ کو آئس کریم کھلانے اور کتابوں کا تحفہ دینے میں خرچ کر دیئے تھے۔ وہ مجھے بہت تحفے دیتی تھی اور میں بہت کم۔ اسی کے دادا کے پیسوں سے اسے تحفہ دینا مجھے بہت برا محسوس ہوتا تھا۔ اس پہلے اعزازیہ کے بعد ہی میں نے یہ سوچا تھا۔

''عمر حسن! تم بچے بہت بن چکے، کب تک ابا میاں پر بوجھ بنو گے؟ کب تک ان سے وہ سب لیتے رہو گے جو لینا تمہارا حق نہ تھا اور نہ ہے۔''

ذرا کوشش کرنے پر مجھے اپنے ہی اسکول کے چند بچوں کو جو اردو یا انگلش میں کمزور تھے، ان کے گھروں پر جا کر ٹیوشنز پڑھانے کا کام مل گیا۔ میں انہیں گھر پر جا کر پڑھا رہا تھا، اس لیے مجھے پیسے بھی زیادہ مل رہے تھے۔ یہ پہلا کام تھا جو میں ودیعہ کے کہنے پر نہیں بلکہ اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے کیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ وجہ سے خود آگاہ ہے، تب ہی تو اس نے مجھے ایسا کرنے سے روکا نہیں تھا۔

ابا میاں نے البتہ یہ بات سنتے ہی کافی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

''تمہیں پیسوں کی مزید ضرورت پڑتی ہے تو مجھ سے کہتے۔ اپنے اسکول کے اس آخری سال کو جو تمہارے کیرئیر کے لیے انتہائی اہم ہے۔ دوسرے کاموں میں کیوں ضائع کر رہے ہو۔''

وہ مجھ پر خفا ہو رہے تھے اور میں انہیں یقین دلا رہا تھا کہ میرے رزلٹ کے حوالے سے انہیں کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ میں انہیں ان کی مرضی کا رزلٹ لا کر دکھاؤں گا۔

''ابا میاں! خود کماؤں گا تو پیسے کا درد بھی ہوگا۔ پیسے کس طرح کمائے جاتے ہیں، یہ بھی پتا چلے گا۔''

وہ مجھے اس کام کے لیے بضد دیکھ کر بحالت مجبوری خاموش ہوئے تھے۔ ان کی خاموشی کو ان کی رضامندی جان کر میں نے ٹیوشنز شروع کر دی تھیں۔ میں یہ سب کیوں کر رہا تھا شعوری طور پر میں اس کی جو بھی توجیہات پیش کرتا لاشعوری طور پر اس کی صرف اور صرف ایک وجہ تھی۔ میں خود کو ودیعہ کمال کے قابل بنانا چاہتا تھا۔ کسی اور سے تو کیا میں خود اپنے آپ سے اس سچائی کا اعتراف نہیں کرتا تھا۔

کیا یہ لطیفہ نہیں تھا ایک بے نام و نشان اور لاوارث لڑکا ڈاکٹر سعادت علی خان کی پوتی اور سرجن کمال علی خان کی بیٹی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ڈر ڈر کر، خود سے بھی چھپا کر، لاشعوری طور پر مگر دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کالج آ کر میرے لکھنے کی رفتار خاصی کم ہو گئی تھی۔ میں کبھی کبھار مہینوں میں کوئی ایک افسانہ لکھتا۔ اب مجھ سے لکھنے کی فرمائش کرنے والوں میں ودیعہ کے علاوہ بھی بہت سے لوگ شامل ہو چکے تھے۔ مختلف میگزینز کے ایڈیٹرز میرے بے شمار قارئین جو زین العابدین کی تحریروں کا بے قراری سے انتظار کیا کرتے تھے۔ میرے انداز تحریر کی اتنی تعریفیں اور اس قدر پذیرائیاں تھیں کہ میں حیران رہ جاتا تھا۔ کہنے والے کہتے تھے کہ میری تحریریں ہر گزرتے دن کے ساتھ مزید خوب صورت ہوتی جا رہی ہیں۔ میرے لفظ پڑھنے والوں کے دل پر اثر کرتے تھے۔

اپنی کسی بھی تحریر کی اشاعت کے بعد اگلے ماہ میں لوگوں کے تبصرے دیکھتا تو میرے لیے تعریفوں اور ستائشوں کا ڈھیر ہوتا۔ مجھ سے ملنے

کی۔ مجھے دیکھنے کی، میرے متعلق جاننے کی شدید ترین خواہش کا اظہار کیا جاتا۔

اتنی تعریفوں کے بعد تو جی چاہتا تھا کہ بس اب ہر وقت لکھوں، لکھنے کے سوا دوسرا کوئی کام کروں ہی نہیں۔ پر زنیرہ! تم جانتی ہو اور میں بھی، تعریفیں شاعروں اور ادیبوں کو خوش تو بہت کر سکتی ہیں مگر ان کے گھروں کے چولہے نہیں جلا سکتیں۔ ان کی ضروریات زندگی نہیں پوری کر سکتیں۔

پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں شاعر اور ادیب اپنی اس تخلیقی صلاحیت کو پروفیشن کے طور پر اختیار نہیں کر سکتے کہ اس کے عوض انہیں اتنا بھی نہیں مل پاتا کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی پوری کر سکیں۔ یہ ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے کہ وہاں شاعروں اور ادیبوں کو ان کے کام کے عوض تعریف، ستائش، عزت اور شہرت کے ساتھ پیسہ بھی خوب ملتا ہے۔ وہاں ایسی کتنی مثالیں بکھری پڑی ہیں کہ لوگوں نے اپنے اچھے بھلے پروفیشنز کو چھوڑ کر رائٹنگ کو بطور پروفیشن اپنا لیا۔

تخلیق کار بھی تو نارمل انسان ہوتے ہیں۔ انہیں لباس، خوراک، مکان ہر اس بنیادی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کی دوسرے نارمل انسانوں کو ضرورت ہوتی ہے۔ لکھنا ایک بہت مشکل بہت صبر آزما اور بہت دقت طلب کام ہے۔ جن تحریروں کو پڑھ کر ہم ایک سیکنڈ میں اچھی تھی، بری تھی، بکواس تھی، کہہ دیتے ہیں انہیں کسی نے بہت محبت سے، بہت وقت صرف کر کے اپنے خون جگر سے تخلیق کیا ہوتا ہے۔

میری زندگی کا وہ وقت شروع ہو چکا تھا جب مجھے سنجیدگی سے اپنے کیریئر کے متعلق سوچنا تھا اور میرا یہ کیریئر، رائٹنگ ظاہر ہے نہیں بن سکتی تھی۔ اچھی تعلیم، اچھی جاب، معقول آمدنی، مناسب رہائش یہ سب تو وہ بنیادی چیزیں تھیں جن کے لیے مجھے ابھی سے کوششیں کرنی تھیں اور اپنے بل بوتے پر کرنی تھیں۔ ابا میاں سے میں پہلے ہی بغیر کسی حق کے بہت کچھ لے چکا تھا۔ وہ مجھے میری طلب اور میری اوقات سے بہت زیادہ دے چکے تھے۔ ان کا دست شفقت، ان کی دعائیں، ان کی محبتیں تو میں زندگی بھر اپنے ساتھ چاہتا تھا مگر ان کا پیسہ اب اور نہیں۔

”تمہیں کسی چیز کی کمی ہے عمر؟ کیا میری محبت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟ میرا خدا گواہ ہے میں نے تم میں اور دیا میں کبھی کوئی فرق نہیں سمجھا“ مجھے ٹیوشنز کے ساتھ گاڑیوں کے ایک شوروم میں بہت معمولی حیثیت کی ملازمت اختیار کرتا دیکھ کر ابا میاں نے رنجیدگی سے کہا تھا۔ میرا یہ فعل انہیں دکھی کر رہا ہے۔ میں جانتا تھا اسی لیے اٹھ کر ان کے پیروں کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔

”آپ کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہے ابا میاں! آپ کی محبت تو بہت زیادہ ہے، میرے سگے ماں باپ اگر ہوتے تو مجھے اس طرح نہ چاہتے جیسے آپ چاہتے ہیں مگر پھر بھی پلیز ابا میاں مجھے روکیں مت، میرا خود اپنی ذات پر اعتماد قائم کرنے کے لیے یہ سب بہت ضروری ہے۔ ابھی خود کو سنبھال نہ پایا، خود میں اعتماد پیدا نہ کر پایا تو ساری زندگی سہارے ڈھونڈوں گا۔“

پھر انہوں نے مجھے روکا نہیں تھا، وہ جیسے مجھے سمجھ گئے تھے۔ کالج، ٹیوشنز پھر شوروم۔ اتنی بے تحاشا مصروفیت کے بعد لکھنے کا وقت ملنا بہت مشکل تھا۔ ودیعہ کو میری مصروفیت سے بہت شکوے تھے۔

”تم اتنا تر ساتر سا کر کیوں لکھتے ہو؟“ وہ مجھ پر بگڑتی۔

”تمہیں مجھ سے لکھوانے کا اتنا شوق کیوں ہے مس ودیعہ کمال؟ اور ویسے یہ تو بتاؤ تم خود کیوں کوئی افسانے وفسانے نہیں لکھتیں؟ جب

اتنے اچھے آرٹیکلز لکھ سکتی ہو تو کہانیاں کیوں نہیں؟''

ان دنوں ہم سیکنڈ ائیر میں تھے اور ودیعہ اب بچوں کے مختلف رسائل میں مضامین لکھنے کے ساتھ بعض اخبارات کے نوجوانوں کے صفحات پر بھی آرٹیکلز لکھنے لگی تھی۔ کہانیاں سننے اور پڑھنے کا اسے بہت شوق تھا مگر خود کبھی کہانی لکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''کاش لکھ سکتی، پر عمر حسن کے جیسا احساس دل جو چھوٹی چھوٹی غیر اہم چیزوں کو بھی اتنی حساسیت اور گہرائی سے دیکھتا، محسوس کرتا اور لکھتا ہے۔ کہاں سے لاؤں؟ تمہارا لکھا کچھ بھی پڑھوں تو بے ساختہ سوچتی ہوں۔'' ہاں بالکل ایسا ہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔ اس بات کو میں بھی یونہی محسوس کرتی ہوں، مگر وہ لفظ کہاں سے لاؤں جو عمر حسن کے سامنے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے مودب کھڑے رہتے ہیں اور میری طرف پھٹکتے بھی نہیں۔ آرٹیکلز لکھنے اور کہانیاں لکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہے عمر! آرٹیکلز لکھنے کے لیے ذہانت، فصاحت، بلاغت، قابلیت، حالات حاضرہ سے مکمل باخبری، بہترین اور مستند معلومات کافی ہیں مگر افسانے اور کہانیاں لکھنے کے کیلئے کچھ اور بھی چاہیئے۔ ایک خاص صلاحیت جو اللہ ہر کسی کو نہیں صرف کسی کسی کو دیتا ہے۔ اللہ نے تمہیں یہ خاص صلاحیت عطا کی ہے۔ تم کو صرف لکھنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ لکھنے میں تمہیں بہت محنت کرنی پڑتی ہے مگر وہ محنت تمہیں خوشی دیتی ہے جبکہ دوسرے سارے کاموں کی محنت تمہارے چہرے پر تھکن بکھیر دیتی ہے۔ تمہارے دل کو بوجھل کر دیتی ہے۔''

وہ واقعی مجھے جانتی تھی، مجھ سے بھی زیادہ اچھی طرح وہ مجھے جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کون سا کام ہے جسے کر کے مجھے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے جسے میں پورے دل کے ساتھ کرتا ہوں مگر زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے اپنی خوشی سے نظریں چرا کر خود کو دوسرے کاموں میں مصروف کر رہا ہوں۔

''تم کبھی لکھنا مت چھوڑنا عمر!''

اس ایک جملے میں وہ تاثیر تھی کہ اکثر دن بھر کی شدید ترین تھکاوٹ کے بعد رات میں یہی ایک جملہ مجھ سے کچھ نہ کچھ لکھوا لیتا۔ ہم ایک دوسرے کو اندر تک جانتے تھے، ہم ایک دوسرے کی آنکھیں پڑھ لیا کرتے تھے۔

یہ کس طرح ممکن تھا کہ ودیعہ مجھے میرے کیرئیر اور مستقبل کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی وجہ نہ جانتی ہو۔ وہ جانتی ہے، یہ میں جانتا تھا پھر بھی نہ میں کچھ ظاہر کرتا، نہ وہ۔ یہ وہ واحد احساس تھا جو ہم ایک دوسرے سے چھپاتے تھے Soul mate کا لفظ ہم بہت پڑھتے اور بہت لکھتے ہیں اور اندر سے یہ بھی سوچتے ہیں کہ یہ محض ایک کتابی اصلاح ہے مگر ہم دونوں کے لیے یہ ایک کتابی لفظ نہیں بلکہ ایک ایک حقیقت تھی۔ ہم واقعی Soul mates تھے۔ وہ جیسے میرے وجود کا ایک گم شدہ حصہ تھی۔ اس کے قریب ہونے پر ہی میرے وجود کی تکمیل ہوتی تھی۔ ایسے ہی وہ بھی خود کو اسی وقت مکمل محسوس کرتی تھی جب میں اس کے پاس ہوتا۔ ہم ایک دوسرے کے پاس نہ ہوتے تو ادھورے ہوتے تھے۔ ہمارے دل اور ہماری روحیں ایک تھیں۔ ہم الگ الگ جسم مگر ایک روح رکھتے تھے اور ہم یہ بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کے سوا کبھی کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔

☆☆☆

پھر یہ ہمارے سیکنڈ ائیر کے بالکل آخری دنوں کی بات تھی جب میرے ذہن میں ایک کہانی آئی۔ یہ وہی کہانی تھی زنیرہ! جسے تم نے پڑھا اور بہت پسند کیا ہے۔ ابتدا میں مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا طویل ناول بنے گا بلکہ ناول لکھنے کا کوئی خیال میرے ذہن میں تھا ہی نہیں۔ مجھے بس اتنا اندازہ فوراً ہو گیا تھا کہ میری کہانی میں زندگی کے اتنے پہلو، اتنے رنگ، اتنے اتار چڑھاؤ، اتنے کردار اور اتنے زیادہ واقعات ہیں کہ وہ مختصر لکھی نہیں جاسکتی۔ یہ کہانی بہت زیادہ تفصیل کی متقاضی تھی۔

ہمیشہ کی طرح میں نے اسے ودیعہ کے ساتھ ڈسکس کیا۔ اسے میری تھیم بہت پسند آئی تھی۔

''یہ تو بہت زبردست ہے عمر! فوراً اسے لکھو۔''

وہ فوراً ہی مجھ سے لکھوانے کے لیے بضد ہو گئی تھی مگر جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا، اس کے لیے کافی ساری ریسرچ، کافی ساری محنت اور کافی سارا وقت درکار تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے کے پس منظر میں لکھے جانے والے حالات و واقعات یونہی کھیلتے کودتے تو نہیں لکھے جاسکتے تھے، اس کے لیے بہت ساری ریسرچ اور بے تحاشا محنت درکار تھی۔ کہانی تب ہی اچھی لکھی جاسکتی تھی جب اس دور کے ماحول کی صحیح عکاسی کی گئی ہو۔ محنت سے میں نہیں گھبراتا تھا مگر اس محنت کے لیے وقت کہاں سے لاتا؟ میرے پاس ان دنوں نوکری اور ٹیوشنز سے ہٹ کر جو بھی فاضل وقت بچتا اسے میں پورا کا پورا اپنی پڑھائی میں صرف کر دیا کرتا تھا۔ میری تعلیم اور میرا کیریئر، کسی کہانی کو لکھنے سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ سو ودیعہ کو یہ کہہ کر کہ ایگزامز کے بعد لکھوں گا۔ اس خیال کو ذہن کی کسی کال کوٹھری میں اٹھا پھینک دیا جس طرح کی میری مصروفیات تھیں ان میں، میں چھوٹے موٹے افسانے مہینوں میں لکھ پاتا تھا تو کوئی طویل چیز، کوئی ناول لکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، نہ ابھی اور نہ ہی ایگزامز کے بعد۔

پھر یہ ہمارے ایگزامز سے ایک دن پہلے ہی کی بات تھی جب ودیعہ نے میرا بہت بری طرح موڈ خراب کیا۔ میں اس روز دوپہر کا کھانا ایک ریڑھی والے کے پاس سے آلو چھولے کھا کر واپس اپنے شوروم جا رہا تھا۔ میں ان دنوں کسی بھی ریڑھی پر سے کچھ بھی سستا سا کھا کر لنچ کر لیا کرتا تھا۔ لوگوں کی چیزیں لینی تو بہت آتی ہیں مگر لوٹانی نہیں۔ میرے نوٹس واپس لا دو۔'' تمہاری یہ نام نہاد دوستیں جن کی مدد کرنے سے تم باز نہیں آتیں۔ اگر اس لڑکی میں اتنی انسانیت نہیں تھی کہ جس کی چیز لی ہے، اسے استعمال کرنے کے بعد اس کی ضرورت کے وقت واپس پہنچا بھی دے۔ تم مجھ سے تو کہہ سکتی تھیں۔''

''میں نے تم سے اس لیے نہیں کہا عمر! کہ تم پہلے ہی اتنے مصروف ہو، اتنے تھک جاتے ہو۔ تمہارے پاس خود اپنے کام کرنے کے لیے وقت نہیں بچتا پھر میں اپنا کام بھی تمہیں کرنے کو کہوں تو کیا یہ بری بات نہیں؟''

اس وجہ کے بیان کیے جانے کے بعد میرا غصہ یک دم ہی کہیں غائب ہو گیا تھا۔ میرے اشتعال، طیش اور غصے کی جگہ دکھ نے لے لی تھی۔ میں چلانا بھول کر دکھ سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میرا کام؟ تمہارا کام؟ کتنی آسانی سے دیا! تم نے مجھے غیر بنا دیا۔ جب رات دس بجے میں گھر آتا ہوں اور تم مجھے کھانا گرم کر کے چائے بنا کر دیتی ہو، جب صبح اپنے یونیفارم کے ساتھ میرے کپڑے بھی استری کر دیتی ہو، جب مجھے رات میں لکھتا یا پڑھتا دیکھ کر رات کے دو دو، تین تین بجے بھی میرے لیے کافی بنا کر لے آتی ہو۔ تب میں تو کبھی نہیں کہتا کہ تم دن بھر کی تھکی ہوئی ہو، تم سے اپنے کام کرانا مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن تمہیں مجھ

سے کوئی کام کہنا برا لگتا ہے۔ میں غیر جو ہوں، میں تمہارا لگتا کیا ہوں۔ اچھی بات ہے، ٹھیک ہے۔'' میں فوراً ہی واپس مڑا۔

''عمر! پلیز، ناراض ہو کر مت جاؤ۔ اچھا میری غلطی ہے۔ آئم سوری۔ آئندہ میں اپنا ہر کام تم سے کہوں گی۔ شہر کے دوسرے کونے سے بھی کچھ لانا ہو گا تم سے ہی کہوں گی کہ مجھے لا کر دو۔''

اس نے منت کرنے والے انداز میں میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا۔ میں رک گیا تھا، میں نے فوراً ہی اس کی معذرت بھی قبول کر لی تھی مگر سچ یہ تھا کہ مجھے ودیعہ کے رویے سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ حالانکہ برسوں ہوئے میں اس کی شخصیت کی اس خوبی یا خامی سے آگاہ تھا کہ وہ اپنے دکھ، اپنے درد، اپنی پریشانیاں اور اپنی ضرورتیں کبھی کسی سے نہیں کہتی۔ وہ سب کے دکھ درد اور پریشانیاں اپنے دامن میں سمیٹنے کو تیار رہی ہے، وہ سب کے کام آنے کو ہر پل راضی رہتی ہے۔ ان کے بھی جنہیں وہ جانتی ہے اور ان کے بھی جنہیں وہ نہیں جانتی مگر خود اپنے دکھ کسی سے نہیں کہنا چاہتی۔ اپنی پریشانیاں کسی سے شیئر نہیں کرنا چاہتی۔ اپنے کام کسی سے نہیں کرانا چاہتی، مجھ سے بھی نہیں۔ وہ اپنے دکھ، اپنی پریشانیاں اور اپنی ضرورتیں مجھ سے بھی چھپاتی تھی۔ گو میں انہیں از خود جان لیتا تھا مگر وہ خود اپنی زبان سے کبھی اپنی تکلیف مجھ سے شیئر نہ کرتی۔ میرا دل چاہتا جس طرح میں اپنی ہر پریشانی اس سے شیئر کرتا ہوں۔ ایسے ہی وہ بھی کرے مگر وہ ایسا کبھی بھی نہیں کرتی تھی۔

اس کی اس عادت کا ادراک رکھنے کے باوجود ہر بار جب وہ ایسا کرتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے اس نے ایک ہی پل میں مجھے خود سے بالکل دور کر دیا ہے۔ بالکل اجنبی اور غیر بنا دیا ہے۔ تب ہی تو ہر بار اس کے اس رویے کو اس کی عادت جان کر اسے نظر انداز کرنے کے باوجود بھی اندر سے میں بہت دکھی ہو جاتا تھا۔

''سنو ودیا! ایک ہی پل میں مجھے پرایا مت کر دیا کرو۔ یہ میرا، تمہارا، مناسب، نامناسب، اچھا، برا، مدد، احسان ہمارے رشتے میں یہ سطحی لفظ کہاں سے آ گئے؟ ہمارا رشتہ ان تمام سطحی باتوں سے بہت بلند ہے۔ بہت خاص، بہت الگ، یہ گھٹیا لفظ بول کر ہمارے رشتے کو بے توقیر مت کیا کرو۔''

میں اس بات پر ودیعہ سے مزید کچھ نہیں بولا تھا مگر رات کی تنہائی میں اپنے کمرے میں لیٹا اس رویے پر خود کو دکھی ہونے سے روک بھی نہیں پایا تھا جس سے محبت ہوتی ہے پھر انسان ان کی خامیاں نہیں تلاش کرتا۔ میں بھی ودیعہ کی اس عادت کو صرف نظر انداز کر جاتا تھا مگر ہر نئی بار اس رویے کا شکار ہونے پر خود کو رنج میں مبتلا ہونے سے روک بھی نہیں پاتا تھا، تب ہی تو اس روز کی ودیعہ کی معذرت قبول کر لینے کے محض چند ماہ بعد پھر اسی جیسے ایک رویے پر دکھی ہو رہا تھا۔

☆☆☆

ہمارا رزلٹ آ چکا تھا۔ ودیعہ نے اپنے کالج میں پہلی پوزیشن لی تھی۔ کالج میں تقسیم انعامات کی تقریب تھی۔ آنٹی اور انکل دونوں ودیعہ سے وعدہ کرنے کے باوجود اس تقریب میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ وہاں ابا میاں اور میں موجود تھے مگر ودیعہ اپنے ممی پاپا کو تقریب میں شریک نہ پا کر حد درجہ رنجیدہ تھی۔ ایک مرتبہ پھر انہوں نے اپنی بیٹی کو پیشہ ورانہ مصروفیت کے آگے نظر انداز کر دیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اپنے کام کو بیٹی پر فوقیت دے کر انہوں نے اسے ہرٹ کیا تھا۔ انکل، آنٹی کی پیشہ ورانہ مصروفیات کی زندگی میں جہاں جہاں ان کی بیٹی کو نظر انداز کروایا، وہیں اس نے اپنے آنسو اپنے اندر

چھپا کر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائی۔

میں اس کے پوزیشن لانے پر بے پناہ خوش تھا۔ میں نے مہینوں پہلے سے اسے اچھا سا تحفہ دینے کے لیے الگ سے پیسے جمع کر رکھے تھے۔ میں نے اس کے لیے سونے کی بالیاں خریدی تھیں، اگرچہ وہ بہت وزنی نہیں تھیں مگر میں اسے پہلی مرتبہ کوئی اتنا قیمتی تحفہ دینے والا تھا، اس لیے بہت خوش تھا۔ ایک دن ایسا بھی ضرور آئے گا میری زندگی میں جب میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ اس کے لیے جو جو کچھ خریدنا چاہتا ہوں، سب خرید پاؤں گا۔ میں نے زیورات کی دکان میں سجے بے شمار قیمتی، زیورات کو دیکھتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

مگر جب ودیعہ مصنوعی قہقہے لگا کر مجھے اور ابا میاں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرنے لگی، تب میرا دل ایک دم ہی بجھ گیا۔ ''کیا میں وہ ایک شخص نہیں ہوں دیا! کہ جب کبھی تم دکھی ہو، جب کبھی تم ہرٹ ہو، جب کبھی تم سب سے چھپ کر کسی ایک شخص کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہانا چاہو تو وہ ایک شخص میں ہوں۔ کیا وہ ایک شخص میں نہیں ہوں دیا؟''

اس کی آنکھوں میں چھپا درد مجھ سے چھپا ہوا نہیں تھا اور اس کا اس درد کو چھپانا مجھے اندر تک درد پہنچا رہا تھا جو میں نے سوچا، وہ اس سے کہہ نہیں سکا تھا۔ میں اس کا بھرم رکھنا چاہتا تھا۔ اس کا وقار، اس کی آن، اس کی انا مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز تھی۔ اس کی انا کو عزیز تر رکھنے کے باوجود میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔

''میں بھی وہ ایک شخص نہیں، میں بھی وہ ایک شخص نہیں۔'' سونے کی بالیاں، میرا جوش، ولولہ، ترنگ ہنسی...... خوشی کا ہر رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کے اندر رونے کی شدید ترین خواہش ہے، وہ بہت بری طرح ہرٹ ہوئی ہے مگر وہ روئے گی وہاں جا کر جہاں کوئی بھی نہ ہو، میں بھی نہیں۔ جہاں وہ بالکل اکیلی ہو۔ ودیعہ کی اس عادت سے سمجھوتہ کر لینے کے باوجود ہر بار کی طرح نئے سرے سے اپنے پل بھر میں اجنبی بنائے جانے کی اذیت سہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا تھا اور اگلے روز ہر بار کی طرح خود بھی بالکل نارمل ہو چکا تھا۔

ہر بار کی طرح میں نے ودیعہ کے رویے کی توجیہ تلاش کر لی تھی۔ اپنی خامی ڈھونڈ لی تھی۔ وہ مچیور ہے، سمجھدار ہے۔ میں جذباتی ہوں، بے وقوفی اور پاگل پن کی حد تک جذباتی۔ یہ میری انتہاؤں کو چھوتی ہوئی حساسیت ہے جو ذرا ذرا سی باتیں بھی مجھے اتنی بڑی نظر آتی ہیں۔ میں اپنی جذباتی اور حساس طبیعت کو ہمیشہ کی طرح مورد الزام ٹھہرا چکا تھا۔

☆☆☆

ودیعہ کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں آنرز کر رہی تھی جبکہ میں گریجویشن پرائیویٹ کر رہا تھا۔ اب میں دو ملازمتیں کر رہا تھا۔ ایک صبح میں، ایک شام میں اور پڑھائی رات میں۔ اب کوئی کالج، کوئی لیکچرارز کوئی پروفیسرز اور ان کے کوئی لیکچرز مجھے میسر نہیں تھے۔ مجھے اپنی مدد آپ کرنی تھی۔ ابا میاں نے میرے اس اقدام پر اس بار کہا تو کچھ نہیں مگر میں ان کے چہرے پر ناخوشی اور ناراضی کے تاثر پڑھ سکتا تھا۔ مجھے باقاعدہ کسی اچھے کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ نہ لیتا دیکھ کر ناخوش تھے۔

''ابا میاں! آپ سے وعدہ کرتا ہوں، بالکل سچا وعدہ آپ کو زندگی میں کبھی مایوس نہیں کروں گا۔ میری تعلیم کی طرف سے آپ بالکل فکرمند

نہ ہوں۔ میری تعلیم کے حوالے سے آپ نے جو خواب دیکھے ہیں، مجھے آپ جہاں پہنچا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، میں وہ سب کچھ کروں گا۔ میں آپ کے ہر خواب کو سچ کر کے دکھاؤں گا۔ بس ابھی مجھ سے خفا مت ہوں۔''

احسان ہے، نیکی ہے، ہمدردی ہے، ترس ہے، بھلائی ہے، خدا ترسی ہے، رحم دلی ہے۔ کہتے کہتے نجانے کب ان سے دل کا رشتہ جڑ گیا تھا۔ میں ان سے محبت کرتا تھا، اس لیے نہیں کہ انہوں نے مجھ پر احسان بہت کیے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ میرا دل انہیں اپنا مانتا ہے۔ ان کی آنکھوں سے جھانکتی ہلکی سی اداسی بھی مجھے پہروں اداس رکھتی تھی۔ ابا میاں اور ان کا یہ گھر نجانے کب مجھے بالکل اپنے لگنے لگے تھے۔ یہ میرا گھر ہے، یہ میرے ابا میاں ہیں۔ ابا میاں، آنٹی، انکل ودود، بوا جی یہ میرے اپنے ہیں۔ یہ سب میرے سب کچھ ہیں میں دل سے اس گھر اور اس گھر سے وابستہ ہر فرد کو پورا پورا اپنا مانتا تھا۔ یہاں تک کہ آنٹی اور انکل جن سے اتنے برسوں ساتھ رہنے کے باوجود بھی جھجک، دوری اور فاصلہ برقرار تھا۔ مجھے بہت اچھے لگتے تھے، میں ان سے بھی محبت کرتا تھا۔

☆☆☆

خواتین کے مقبول ترین ناول

فاصلے اور چاہتیں
شگفتہ بھٹی
قیمت: 400

روشنی مرا استعارہ
زمر نعیم
قیمت: 400

اپنے قریبی بکسٹال یا ھاکر سے طلب فرمائیں

براہ راست منگوانے کا پتہ
ناشر
علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔
Ph: 7247414

اسٹاکسٹ
علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔

میری محنت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دو، دو جگہ ملازمتیں اور وہ بھی بے تحاشا ذہنی و جسمانی محنت والی کر کے میں دن، رات پیسے جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میرا ارادہ گریجویشن کے بعد امریکہ یا انگلینڈ جا کر پڑھنے کا تھا۔ صرف امیروں کے بچے تو باہر جا کر نہیں پڑھتے۔ میرے جیسے معمولی اور غریب لوگ بھی تو یہ خواب دیکھ سکتے ہیں اور ان کی تعبیریں بھی پا سکتے ہیں۔ میں اپنے جیسے معمولی حیثیت کے بہت سے لڑکوں کو باہر جاتا دیکھ رہا تھا۔ کسی کی ماں نے اپنا سارا زیور بیچ کر بیٹے کو پڑھنے باہر بھیجا تھا تو کسی کے باپ نے اپنی جمع پونجی بیٹے کا مستقبل سنوارنے پر لگا دی تھی۔ مجھے بیرون ملک یونیورسٹی میں داخلے کے لیے درکار پیسے، ویزا، ٹکٹ اور پھر وہاں پہنچنے کے بعد اپنے ابتدائی چند ماہ کے اخراجات کے لیے رقم جمع کرنی تھی۔ باقی پھر بعد میں تو میں نے بھی دوسرے پاکستانی طلبہ کی طرح چھوٹی موٹی ملازمتیں کر کے اپنی پڑھائی اور رہائش کے اخراجات پورے کر لینے تھے۔

میں پیسے جمع کرنے کے لیے رات دن محنت کر رہا تھا۔ ایسے میں لکھنے کے بارے میں سوچنے کی تو مجھے فرصت بھی نہیں تھی مگر ودیعہ میری اس کہانی کو جس کا میں نے اسے خلاصہ و مرکزی خیال سنایا تھا، نہیں بھولی تھی۔ اس رات میں گیارہ بجے کے بھی بعد میں گھر واپس آ کر کھانا کھا رہا تھا، تب اس نے مجھے یاد دلایا۔

"تم نے کہا تھا ایگزامز کے بعد لکھوں گا۔ ایگزامز اور رزلٹ تو آ گیا اب تو نئی کلاسز کو شروع ہوئے بھی کئی مہینے ہو چکے ہیں پھر کب شروع کرو گے اسے لکھنا؟"

"بہت مشکل ہے دیا! اسے لکھ پانا۔ جو میں نے تم سے ڈسکس کیا تھا، وہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک ناول بنے گا۔"

میں روز رات میں تقریباً اسی وقت گھر آتا تھا اور ودیعہ جو سب کے ساتھ کھانا کھا چکی ہوتی تھی، قصداً بھوک روک کر کھاتی تھی تا کہ بعد میں میرا بھی ساتھ دے سکے۔ تھوڑا بہت میرے ساتھ بھی کھا سکے۔ اس وقت بھی وہ مجھے کمپنی دینے کی خاطر کچن میں میز پر میرے سامنے بیٹھی سلاد کھا رہی تھی۔

"تو لکھو ناول، تمہیں ناول لکھنے سے کس نے منع کیا ہے؟" اس نے سلاد کا پتا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"وقت نے، وقت نے مجھے منع کیا ہے۔ میرے پاس اس کام کے لیے وقت نہیں ہے۔ اس ناول کا اتنا مشکل سبجیکٹ ہے، اس پر ریسرچ بے تحاشا کرنی پڑے گی۔ جس دور کی بات لکھنی ہے، وہ یونہی اندازے سے نہیں لکھ دوں گا پھر میری کہانی۔ اس میں اتنے رنگ ہیں، اتنے کردار، اتنی چوائسز، اتنے گمبھیر ان کرداروں کے مسائل ان کے حالات پیچ در پیچ الجھتے واقعات۔ نہیں بھئی، میں اب یہ کام نہیں کر سکتا۔ ایسا کرتے ہیں، بچپن کی طرح میں تمہیں کہانیاں پھر سے زبانی سنانی شروع کر دیتا ہوں۔ روزانہ تھوڑی تھوڑی۔"

لکھنے سے مجھے خوشی ملتی ہے، سکون ملتا ہے، میں یہ سب جانتا تھا مگر بعض دفعہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے خوشی اور سکون سے نظریں چرانی بھی تو پڑتی ہیں۔

"عمر! تم ناول لکھو نا پلیز...... تمہاری کہانی بہت پاورفل ہے پھر تمہارا لکھنے کا منفرد اور خوب صورت انداز اس کہانی کو چار چاند لگا دے گا۔ مجھے ایسا لگتا ہے تمہارا ناول تمہارے افسانوں سے بھی زیادہ اچھا ہو گا۔ بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری طویل کہانیاں، ایک دن میں ختم ہو جانے والی مختصر کہانیوں سے زیادہ اچھی ہوتی تھیں۔"

وہ جوش و ولولے سے مجھے قائل کرنے میں کوشاں تھی۔ میں نے نظریں اٹھا کر پیار سے اسے دیکھا پھر بہت پیار اور رسانیت سے اسے یہ سمجھانے لگا کہ لکھنا اب میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ زندگی میں آئندہ کبھی فرصت ملی تو دوبارہ لکھنا شروع کر دوں گا مگر فی الحال میں اس کام سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر رہا ہوں۔

''تم لکھنا چھوڑ رہے ہو؟'' اسے میری اس بات نے سخت صدمہ پہنچایا تھا۔ مجھے کچھ بھی لکھے پانچ چھ ماہ ہو چکے تھے مگر آئندہ نہ لکھنے کا آج بھی باضابطہ اعلان کر رہا تھا۔ میں نے سر اثبات میں ہلایا۔

''فی الحال چند سالوں کے لیے، جب تک میرا کیریئر۔'' اس کی آنکھوں میں گہرا دکھ اور ملال دیکھ کر میں اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔

''دیا!'' میں نے بے چین ہو کر اسے پکارا۔

''تم لکھنا مت چھوڑو عمر، تم لکھو، پلیز لکھو۔ کسی اور کے لیے نہ سہی تم میرے لیے لکھو۔ میں تمہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔ تم میرے لیے لکھو۔'' وہ مجھے قائل کرنے کے لیے اور بھی نجانے کیا کیا کہہ رہی تھی مگر اب مجھے کسی اور لفظ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

''تم میرے لیے لکھو۔''

اس ایک جملے کے بعد مجھے مزید کسی بھی لفظ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کہانیاں ہمیشہ اسی کے لیے سوچی تھیں۔ ہمیشہ اس کے لیے لکھی تھیں پھر اب کیوں نہیں؟ کیا اس لڑکی سے میری محبت کم ہو گئی تھی، کمزور پڑ گئی تھی جو وقت اور مصروفیات اس کے بیچ حائل ہو رہے تھے۔

''میں نے پہلے بھی ہمیشہ صرف تمہارے لیے لکھا ہے۔ اب بھی تمہارے لیے لکھ رہا ہوں اور آئندہ بھی ہمیشہ صرف تمہارے لیے لکھوں گا۔ میرے پاس میرے لکھنے کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں کی ودیعہ کمال ایسا چاہتی ہے۔'' میری تھیسم کتنی پیچیدہ تھی، میرا سبجیکٹ کتنا مشکل تھا اور اس پر ریسرچ کتنی محنت طلب۔ میں یہ سب بھول گیا تھا۔ وہ جابز، پڑھائی، امتحان کی تیاری اور ساتھ میں ناول کی ریسرچ۔ پورے چھ ماہ تو مجھے میری ریسرچ میں لگے تھے۔

میرے بی اے پارٹ ون کے ایگزامز میں محض دو ماہ باقی تھے۔ جب میں نے ریسرچ مکمل کر کے اپنا ناول لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے تو بس ایک لگن تھی، میں اس کے لیے لکھ رہا ہوں جو یہ چاہتی ہے کہ میں لکھوں۔

دن اور رات میں بھی مجھے لکھنے کا مناسب وقت نہ مل پاتا تھا، اس لیے میں صبح ساڑھے چار بجے اٹھ جاتا۔ اس وقت سے لے کر اپنے آفس جانے کے وقت تک مسلسل اور متواتر لکھتا۔ اٹھ کر جاؤں گا سب کے ساتھ ناشتا کروں گا۔ باتیں واتیں ہوں گی تو وقت ضائع ہوگا۔ اس لیے ناشتے تک کے لیے اپنے کمرے سے نہیں نکلتا تھا۔

ابا میاں سمجھتے تھے میں پڑھائی میں بے انتہا مصروف ہوں۔ ''میں کوئی ناول لکھ رہا ہوں۔'' میرے اور ودیعہ کے سوا اس بات کی کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں تھی۔

روز صبح ودیعہ میرا ناشتا میرے کمرے میں لے آتی۔ مجھ سے باتیں کر کے مجھے ڈسٹرب نہ کرتی بلکہ ٹرے رکھ کر خاموشی سے پلٹ جاتی۔

میں لکھنے کے دوران ناشتا بھی کر لیتا اور پھر اپنے اس روز لکھے تمام صفحات پیپر ویٹ کے نیچے دبا کر ودیعہ کے پڑھنے کے لیے رائٹنگ ٹیبل پر ہی چھوڑ کر آفس چلا جاتا۔

میرے جانے کے بعد وہ ان صفحات کو پڑھتی تھی۔ میں ہر روز جو لکھتا وہ اسے ہر روز ساتھ ساتھ پڑھتی جا رہی تھی۔ ان دنوں یہ حال تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں جو بھی وقت فارغ مل جاتا، میں اسے لکھنے میں صرف کرتا۔ کسی دن آفس میں لنچ ٹائم کے دوران موقع مل جاتا تو تھوڑا بہت تب لکھ لیتا۔ گھر سے میرے آفس تک کا راستہ جو بس میں پینتالیس منٹ بنتا تھا میں اسے بھی اگر بیٹھنے کی مناسب سیٹ مل جاتی تو لکھنے میں گزارتا۔

جس روز میرے لکھے صفحات کی تعداد روزانہ سے زیادہ ہوتی اس روز ودیعہ زیادہ خوش ہوتی، اسے ناول کے جلد از جلد مکمل ہونے کی بے قراری تھی۔ وہ ہر روز میرے لکھے کو پابندی سے پڑھنے کے بعد اس پر تبصرہ ضرور کرتی۔ اس کا تبصرہ کرنے کا انداز یوں ہوتا گویا ایک بڑا نقاد اور تجزیہ نگار کسی نامور مصنف کی تحریر پر رائے دے رہا ہو۔ اس تبصرے میں تعریف، تنقید، ستائش، اختلاف اور اعتراض سب شامل ہوتے۔ جس جگہ اسے مجھ سے اختلاف ہو رہا ہوتا، وہ مجھے بتاتی پھر ہم طویل بحث کرتے۔

کبھی میں اس کے اعتراض و اختلاف کو تسلیم کر لیتا اور کبھی ''رائٹر میں ہوں یا تم؟'' کہہ کر اکڑ جاتا۔ کبھی وہ مجھے قائل کر لیتی اور کبھی میں اسے۔

ایگزامز شروع ہونے کے وقت تک میں ناول کا پہلا چیپٹر مکمل کر کے دوسرا شروع کر چکا تھا۔ ایگزامز کے دوران بھی موقع نکال نکال کر میں لکھتا رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ناول پر بے انتہا محنت کر رہا تھا۔ اس کے پیچھے میں نے اپنا آرام، اپنا سکون اور اپنی نیند سب کچھ قربان کر دیا تھا پھر بھی اکثر مجھ پر منفی خیالات حملہ آور ہو جاتے۔

''جس ناول کے پیچھے میں اتنی محنت کر رہا ہوں، اسے پبلش کون کرے گا......

مجھے اچھا لگ رہا ہے، ودیعہ کو اچھا لگ رہا ہے مگر کیا یہ کسی پبلشر کو بھی اچھا لگے گا؟''

اپنی ہر بات جس سے کرنے کی عادت تھی، اسی سے یہ منفی اور مایوسی بھرے خیالات بھی شیئر کیے۔

''کیوں اچھا نہیں لگے گا؟ بالکل اچھا لگے گا۔ اسے برا کوئی ادب سے بے بہرہ اور بد ذوق شخص ہی قرار دے سکتا ہے یا پھر وہ جسے تم سے کوئی ذاتی پرخاش ہو۔''

میں اس کے جوشیلے انداز پر ہنس پڑا تھا۔ ''تم تو یہی کہو گی ودیعہ کمال! اس لیے کہ تمہیں میرا لکھا کچھ بھی کبھی برا نہیں لگتا مگر یہاں بات پبلشرز اور ایڈیٹرز کی ہو رہی ہے۔ بچوں کے میگزین میں چھپ جانا، آٹھ دس صفحات پر مشتمل افسانے جن کی کل تعداد دس بارہ سے زیادہ نہیں چند ماہناموں میں شائع کروا لینا اور ایک پورا ناول کسی ناشر سے شائع کروانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کون پبلش کرے گا ایک غیر معروف اور نو آموز رائٹرز کا ناول؟''

اسے میرا ''تم یہ کہو گی'' کہنے والا انداز بہت برا لگا اور یہ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

''ایک اچھے ایڈیٹر میں کیا خوبی ہونی چاہیے عمر حسن؟'' میں اس سوال پر تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

''نہیں پتا؟ اچھا میں تمہیں بتاتی ہوں۔ ایک اچھے ایڈیٹر میں صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی تحریر کی صرف ایک سطر پڑھ کر ہی اس کی اچھائی یا برائی جانچ لے۔

کسی بھی رائٹر کی صرف ایک تحریر کے ذریعہ اس کے اندر کی تخلیقی صلاحیتوں کو evaluate اور assess کر سکے۔ اس رائٹر میں کتنا دم ہے، کتنا آگے جائے گا۔ رائٹر کو خود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بارے میں جو کچھ نہ پتا ہو، وہ اس سے آگاہ کرے۔ اس میں یہ تمام صلاحیتیں ہیں۔ تمہارے اندر کے رائٹر کو دریافت کس نے کیا تھا؟ میں نے۔ تمہیں سب سے پہلے یہ بات کس نے بتائی تھی کہ تم لکھ سکتے ہو؟ میں نے۔ جب تمہاری تخلیقی صلاحیتوں کے متعلق میری ججمنٹ غلط ثابت نہیں ہوئی تو تمہارے ناول کے متعلق کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ایڈیٹر ودیعہ کمال کا دعوا ہے کہ تمہارا ناول بہترین ہے۔ مجھے تمہاری پوری کہانی پتا ہے پھر بھی آگے پڑھنے کی اتنی بے قراری اور دلچسپی ہے۔ تم جلدی جلدی لکھو اور میں جلدی جلدی پڑھوں۔''

وہ سنجیدگی سے بول رہی تھی اور میں قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔ ''ایڈیٹر ودیعہ کمال کا دعوا! میں ہنس ہنس کر اسے اور چڑا رہا تھا۔

''مت کرو میرا یقین، ایک وقت آئے گا جب اپنے ہنسنے پر شرمندہ ہو گے اور تمہاری اتنی بتیسی کیوں نکل رہی ہے۔ میں کیا ایڈیٹر نہیں ہو سکتی؟ آنے والے وقت کا کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی روز میں کسی بڑے اخبار یا میگزین کے ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھی ہوں۔ تمہاری طرح منفی باتیں نہیں سوچتی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی روز میں کسی بہت بڑے میگزین کی مشہور و معروف ایڈیٹر بن جاؤں۔'' وہ چڑ چڑے پن سے بولتی رہی اور میں ہنستا رہا۔

ہماری اس دن کی بحث و تکرار کو ایک ماہ ہی ہوا ہو گا جب اس روز مجھے ودیعہ اور ابا میاں کے ساتھ ایک ادبی کانفرنس میں شرکت کے لیے ایک مقامی ہوٹل میں آنا پڑا۔ وہ تین یا چار روزہ کانفرنس تھی اور اس میں دنیا کے کئی ممالک سے شاعر، ادیب، نقاد، دانشور، محقق، مدیر اور ناشر شرکت کر رہے تھے۔ مجھے لکھنے کا جتنا شوق تھا، ایسی محفلوں میں شرکت سے اتنی ہی بیزاری۔ میری کم اعتمادی اور شرمیلا پن اب ختم ہو چکا تھا مگر کم گو، تنہائی پسند اور لیا دیا رہنے والا میں ابھی بھی تھا۔ بڑی بڑی محفلیں اور ان کی گہما گہمی سے مجھے ابھی بھی تنہائی زیادہ محبوب تھی۔

میں یہاں صرف ودیعہ کی خاطر آیا تھا، اسے اس کانفرنس میں شرکت کا بہت شوق ہو رہا تھا۔ کن کن ممالک سے مندوبین شرکت کر رہے ہیں، کیسی کیسی دانش ورانہ اور ادبی باتیں یہاں ہونے والی ہیں، وہ اس کے لیے پرجوش تھی۔ ابا میاں اس کانفرنس کے منتظمین میں شامل تھے۔ اس کانفرنس کا کراچی میں انعقاد ان کے اور ان کے ساتھیوں کی بے مثال کاوشوں اور محنتوں کا نتیجہ تھا۔ میزبانوں میں شامل ہونے کے ناطے آج کی ادبی نشست مکمل طور پر ختم ہونے سے پہلے ان کی گھر واپسی ناممکن تھی اور ڈرائیور کو بھی ان کے ساتھ لازمی طور پر یہیں رکے رہنا تھا، اسی لیے مجھے ودیعہ کے ساتھ آنا پڑا تھا۔ رات کے وقت یہاں سے گھر واپس وہ اکیلے تو نہیں جا سکتی تھی۔

میں تو بور ہونے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا مگر وہ جو بہت ذوق و شوق سے یہاں آئی تھی، گاڑھے فلسفیانہ، خشک اور طوالت مضامین سن سن کر اپنا سارا جوش بھول بیٹھی۔ جو دانش ور آ کر بولنا شروع ہوتے تو پھر واپس جانے کا نام ہی نہ لیتے۔ اس پر مزید ستم یہ کہ ان میں سے اکثریت، حاضرین محفل پر اپنی قابلیت کا ٹھیک ٹھاک رعب بٹھانے کی خاطر مشکل ترین الفاظ و اصطلاحات کا غیر ضروری استعمال کر رہے تھے۔ ایک تو طوالت اس پر مشکل الفاظ کی بھرمار۔

مجھے اور ودیعہ ہم دونوں کو زبان و بیان میں سادگی اچھی لگا کرتی تھی۔ تصنع، بناوٹ، مشکل الفاظ کا بے جا استعمال۔ خود کو express کرنا مقصود ہے یا لوگوں کو impress کرنا، ہمیں وہی اہل قلم پسند آئے تھے جو سادہ عام فہم الفاظ میں اپنی بات خوب صورت و روانی سے کہہ جاتے ہوں۔ اس وقت بھی انڈیا سے آئے ایک معروف مصنف اپنا خطرناک حد تک خشک، بورنگ اور بے انتہا طویل مضمون پڑھنے اور حاضرین کو بور کرنے میں مصروف تھے۔ میں بیٹھا اونگھ رہا تھا اور ودیعہ کوفت زدہ شکل بنائے ادھر ادھر پہلو بدل رہی تھی پھر اپنی بوریت دور کرنے کے لیے اس نے اپنے برابر بیٹھے ایک انگریز شخص سے گفت وشنید شروع کر دی۔ ابتداً محتاط انداز میں مگر جیسے ہی یہ جانا کہ وہ بندہ بھی ان طولانی مضامین سے اتنی ہی کوفت محسوس کر رہا ہے جتنی وہ خود تو پھر ودیعہ کھل کر ان مضامین و تقاریر کی شان میں اپنے بے لاگ تبصرے پیش کرنے لگی۔

وہ ودیعہ کے شوخ جملوں اور برجستہ تبصروں پر ہنستا خود بھی اس سے ملتے جلتے اپنے تبصرے پیش کر رہا تھا جبکہ میں بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ وہ تقریباً پچاس پچپن سال کا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ودیعہ کی حاضر جوابی بذلہ سنجی اور ذہانت متاثر کر رہی ہے۔ کون تھا جو اس سے متاثر نہیں ہوتا تھا؟ اُسے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانا آتا تھا۔ میں بالکل خاموش تھا اور وہ دونوں اب تک مضامین اور تقاریر پر پیش کیے گئے مختلف دانش وروں کے بخیے ادھیڑنے میں مصروف تھے۔ میں نے دو تین بار آہستہ آواز میں ودیعہ کو ٹوکا۔ ہمارے آس پاس کی نشستوں پر بیٹھے کچھ با ادب افراد اس بے ادبی پر ودیعہ اور اس بندے کو خطرناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

"چلیں کچھ دیر کے لیے باہر چلتے ہیں، کافی پی کر آتے ہیں۔" اس بندے نے لوگوں کو گھورنے اور میرے ودیعہ کو مسلسل ٹوکنے پر یہاں سے باہر جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ ہم تینوں کانفرنس ہال سے اٹھ کر باہر کافی پینے آگئے۔ اتنی دیر سے وہ دونوں مل کر نجانے کن کن مصنفین اور دانش وروں کی شان میں کیا کیا ہرزہ سرائیاں کر چکے تھے اور ابھی تک آپس میں باضابطہ اور باقاعدہ طور پر متعارف بھی نہیں ہوئے تھے۔ کافی کے سپ لینے کے دوران اس بندے نے ودیعہ سے اس کے متعلق پوچھا تو اس نے اپنا تفصیلی تعارف کروایا۔

ودیعہ کے بعد اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے ودیعہ کے دس منٹ طویل تعارف نامہ کے جواب میں فقط ایک چھوٹا سا فقرہ۔ "میں عمر حسن ہوں، گریجویشن کر رہا ہوں" کہہ دیا۔ ودیعہ نے اس تعارف پر مجھے گھورا۔

"ان کے اس مختصر تعارف پر مت جائیے، یہ حضرت منہ سے خود کو کچھ بھی کہتے رہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ اس وقت آپ مستقبل کے ایک عظیم مصنف سے تعارف کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ یہ ان دنوں اپنا پہلا ناول لکھ رہے ہیں اور یہ ناول ایک بیسٹ سیلر ہوگا۔ یہ میں جانتی ہوں۔"

اب جواب میں اسے گھورنے کی باری میری تھی۔

وہ ہم دونوں کے ایک دوسرے کو گھورنے پر ہنس پڑا تھا۔ پہلے ناول کے مکمل ہونے سے پہلے آپ کو مصنف کے عظیم ہونے کا کیسے پتا چل گیا ودیعہ؟" اس نے محظوظ نگاہوں سے ودیعہ کو دیکھا۔

"اس لیے کہ یہ مستقبل کی ایک عظیم ایڈیٹر ہیں اور کسی بھی مصنف کی قابلیت کو ایک ایڈیٹر سے بہتر کون جج کر سکتا ہے۔" یہ بات میں نے کہی تھی اور اس بات پر وہ بندہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا جبکہ ودیعہ غصے میں مجھے گھور رہی تھی۔

''آپ نے اپنا تعارف نہیں کروایا؟'' کچھ سیکنڈ بعد میں نے سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔

''جان بکھم میرا نام ہے اور کتابیں چھاپنا میرا کام ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اس شوخ اور قدرے غیر سنجیدگی کا عنصر لیے جواب پر ہم دونوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''جے بی ایم بکس کے نام سے لندن میں میرا پبلشنگ ہاؤس ہے۔'' اس نے فوراً ہی اپنی بات کی وضاحت کی۔ اس وضاحتی تعارف کے بعد ظاہر ہے کہ میں اور ودیعہ ہم دونوں پہلے سے بھی زیادہ اچھی طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ہمارا مخاطب ایک پبلشر تھا اور ان دنوں ہم دونوں مل کر سب سے زیادہ جن افراد کو ڈسکس کرتے تھے، وہ پبلشرز اور ایڈیٹرز ہی تھے۔

''عمر کی کہانی اتنی اچھی ہے۔ لکھنے کا انداز بھی بہترین ہے مگر پھر بھی اسے لگتا ہے کہ نیا رائٹر ہونے کی وجہ سے اس کا ناول کوئی پبلشر شائع نہیں کرے گا۔ آپ بتائیں، کیا آپ نئے رائٹرز کی کتابیں شائع کرتے ہیں یا ان کے غیر معروف اور نئے ہونے کی وجہ سے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں؟''

ہماری اس روز کی باتوں کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور ہمیں لندن سے آئے ایک پبلشر سے ملنے کا موقع مل گیا تھا تو ودیعہ نے میری ناامیدوں اور مایوسیوں کو ذہن میں رکھتے اور انہیں دور کروانے کی خاطر اس بندے سے اسی موضوع پر ہی بات کرنی تھی۔ لفاظی کے طور پر تو اس بندے نے یہی کہنا تھا کہ ہاں اگر نئے رائٹر کا کام اچھا ہو تو ہم ضرور شائع کرتے ہیں مگر اس کا جواب قدرے مختلف تھا۔

''ہم سال میں ایک یا دو نئے رائٹرز کو ضرور متعارف کرواتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ہمارا بزنس ہے تو پہلے یہی جج کریں گے کہ نیا رائٹر کتنا promotable ہے پھر Prometable لگ رہا ہوتا ہے اسے Promote کرتے ہیں۔ ہاں رائٹرز کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھیں تو یہ ضرور ٹھیک ہے کہ نئے رائٹرز کے لیے پہلی مرتبہ اپنی کتاب پبلش کروانا ایک مشکل بلکہ مشکل ترین کام ہے۔ آپ کو رجیکشن کے لیے تیار رہنا ہو گا۔ بہت سی جگہ صرف نئے ہونے کی وجہ سے آپ نظر انداز کر دیے جائیں گے...... بہت سے Best selling authors سے اگر آپ پوچھیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ ابتدا میں ان کا کام کہاں کہاں رجیکٹ ہوا تھا مگر پھر بھی آپ کو ہمت رکھنی چاہیے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان تمام باتوں کے باوجود ہر سال ہزاروں نئے رائٹرز اپنی کتابیں پبلش کروانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اگر آپ کا ناول اس قابل ہے تو وہ بھی ضرور پبلش ہو گا۔''

میں تو اس کے اس مفصل جواب کے جواب میں خاموش رہا تھا مگر ودیعہ بے ساختہ بولی۔

''اگر عمر کا ناول اس قابل ہوا، آپ کے پبلشنگ ہاؤس کے معیار پر پورا اتر رہا ہوا تو کیا آپ اسے پبلش کریں گے۔ اس بات کو نظر انداز کر کے کہ عمر حسن ایک غیر معروف رائٹر ہے؟'' اس طرح کی خود اعتمادی سے بھرپور بات ودیعہ کمال ہی کر سکتی تھی۔ میں کبھی ایسا سیدھا اور صاف سوال کسی سے کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ ودیعہ کی برجستگی حاضر دماغی اور بروقت سوال کرنے پر کھل کر ہنسا۔

''بالکل کروں گا اور مجھے تو ناول دیکھے بغیر ہی لگنے لگا ہے کہ عمر حسن ایک بہترین رائٹر ہے جس کا لٹریری ایجنٹ اتنا شاندار ہے وہ رائٹر برا کیسے ہو سکتا ہے۔'' وہ شدید لہجے میں کہہ کر مسکرایا۔

''چلیں اگر آپ مجھے عمر حسن کے لٹریری ایجنٹ کے طور پر قبول کر رہے ہیں تو میرا آپ کا ایک پبلشر اور لٹریری ایجنٹ کا رشتہ ہو گیا تو اس رشتے سے اگر میں آپ سے یہ فرمائش کر دوں کہ آپ عمر کے ناول کے یعنی اس کے مسودہ کے چند صفحات پڑھ کر اس پر اپنی ماہرانہ رائے دیں تو کیا آپ میری یہ خواہش پوری کریں گے۔؟''

وہ ودیعہ تھی..... ہچکچائے بغیر آرام سے یہ بات کہی۔ میں نے اس بندے کے علم میں نہ لاتے ہوئے آہستہ سے ودیعہ کو کہنی ماری۔ یہ وہ کیا اوٹ پٹانگ شروع ہو گئی تھی۔ جان نا پہچان اور وہ پتا نہیں کیا کیا کہے جا رہی تھی۔ مدعی سست گواہ چست، یہ تو کچھ اسی طرح کی صورت حال تھی۔ وہ بندہ کیا سوچ رہا ہوگا۔ میری سوچ سے برعکس وہ ودیعہ کی باتوں کو انجوائے کر رہا تھا۔ اس کا اعتماد اسے پسند آ رہا تھا۔

''آپ کی کہانی کیا ہے عمر؟''

ودیعہ کی فرمائشوں پر مسکراتے ہوئے اس نے مجھ سے پوچھا۔ اب جب وہ یہ ذکر اس بندے سے چھیڑ چکی تھی تو مجھے بھی اس موضوع پر بولنا ہی تھا۔ میں نے مختصراً اسے اپنی کہانی بتائی۔ کہانی پوری میرے ذہن میں تھی۔ اس میں کہیں کوئی الجھاؤ میرے لیے تھا ہی نہیں۔ آغاز سے لے کر اختتام تک میرے ذہن میں سب کچھ پورا واضح تھا۔

''کہانی تو آپ کی اچھی ہے۔'' میرے خاموش ہوتے ہی اس نے سنجیدگی سے تبصرہ کیا۔ ہم تینوں اس وقت کافی کے دوسرے کپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

''مگر صحیح تبصرہ آپ کے لکھے ہوئے کو دیکھنے کے بعد کیا جا سکتا ہے۔ آپ کل آئیں گے تو اپنے مسودے کے ابتدائی کچھ صفحات لے آیئے گا۔ کل دو پہر میں ہم لوگ دو، تین گھنٹے فارغ ہوں گے، تب میں وہ دیکھ لوں گا۔''

وہ مجھ سے نہیں، ودیعہ سے متاثر ہوا تھا اور یہ غیر معمولی پیشکش صرف اسی کی وجہ سے کی گئی تھی۔ میں اس تمام صورت حال پر اندر سے جتنا بھی چڑ رہا تھا مگر چہرے پر خوش اخلاق سی مسکراہٹ لا کر میں نے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

''کیا ضرورت تھی تمہیں ایک انجان آدمی سے اتنی فضول باتیں کرنے کی؟'' ودیعہ پر خفا ہونے کا موقع مجھے گھر واپس جاتے وقت راستے میں ہی ملا تھا۔ ''وہ بھی کیا سوچ رہا ہوگا۔ یہ پاکستانی کتنے فضول لوگ ہوتے ہیں۔ بغیر جان پہچان کے فری ہو جانے والے۔''

''اس میں فضول کیا ہے عمر؟ میں نے اس سے کچھ مانگا تو نہیں ہے۔ صرف یہی تو کہا ہے کہ تمہارا مسودہ دیکھ کر اس پر اپنی ماہرانہ رائے دیدے۔ ہم نے اس سے صرف اس کی رائے مانگی ہے اور کسی ماہر سے اپنے کام پر رائے لینا ہرگز ہرگز فری ہونا نہیں کہلاتا۔'' اس نے تھوڑی دیر میری لعن طعن سنی پھر مدبرانہ انداز میں سنجیدگی سے بولی۔

''میری رائے تمہارے نزدیک مستند نہیں۔ ابا میاں سے اگر رائے لیں تو تمہارے نزدیک وہ تمہارے کام کو ایک نقاد کی نہیں بلکہ ایک باپ کی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ رہ گئے ابا میاں کے واقف کار ایڈیٹرز و پبلشرز تو ان سے رائے لینا تو تمہیں ایسا لگے گا کہ تم ان سے رائے نہیں مانگ رہے بلکہ ابا میاں کے نام کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ لکھنے اور چھپنے کے معاملے میں تمہاری ناک اتنی اونچی ہے۔ ذرا ذرا سی

بات پر ناک کے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس اونچی ناک کے ساتھ تمہیں یہ پریشانی بھی ہر پل ستاتی ہے کہ تمہارا لکھا، ایڈیٹرز اور پبلشرز کے معیار پر پورا اترے گا یا نہیں۔ یہ پریشانی تمہارے ذہن پر اتنی سوار ہے کہ تم یکسو ہو کر لکھ بھی نہیں پا رہے۔ میں نے پبلشنگ کے بزنس سے منسلک ایک ماہر اور قابل شخص جو یہ بھی نہیں جانتا کہ تم ابا میاں کے کیا لگتے ہو، فقط اس کی رائے معلوم کی ہے تا کہ تمہاری ناک بھی سلامت رہے اور جو کچھ تم لکھ رہے ہو اس پر خود تمہارا اعتماد بھی قائم ہو سکے۔"

گھر آتے ہی وہ میرے احتجاج کی پروا کیے بغیر میرے لکھے صفحات کو یکجا کرنے لگی ایک غیر ملکی پبلشر کے سامنے اپنا کام پیش کرنا تھا، سو اسے Presentable بنائے جانے کے لیے اس نے ان صفحات کو ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا۔

اس نے پہلا پورا چیپٹر یعنی ابتدائی پچاس صفحات کو ٹائپ کر لیا تھا۔ میں غصے میں بھرا اسے یہ تمام حرکات کرتا دیکھ رہا تھا۔ زیادہ غصہ مجھے اس بات پر آ رہا تھا کہ اسے مجھ سے اپنی باتیں منوانا آتی تھیں۔ میں جانتا تھا میں کل دل نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ وہاں جاؤں گا۔ خود اپنے ہاتھ سے یہ صفحات جان بلہم کو دوں گا۔ اندر سے چاہے جتنا چڑ رہا ہوں، جتنا غصہ آ رہا ہو۔ وہ بس ملتجی نگاہوں سے مجھے دیکھے گی۔ "صرف میرے لیے، صرف میری خاطر۔" اور میں اپنا سارا انکار بھول جاؤں گا۔

پھر اگلے روز ہوا بھی یہی، سب کچھ تھا۔ "ہم اس سے صرف اس کی رائے لے رہے ہیں، کچھ مانگ نہیں رہے۔" یہ میں مانتا تھا مگر بس پھر بھی اجنبیوں سے یک دم بے تکلف ہونا مجھے برا محسوس ہوتا تھا۔ جان بلہم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کانفرنس کے آخری روز مجھے اپنی رائے سے ضرور آگاہ کرے گا۔

"آپ رائے بالکل سچائی اور ایمانداری سے دیجئے گا۔ یہ سوچے بغیر کہ مجھے برا لگے گا یا میرا حوصلہ ٹوٹے گا۔"

ہمارا آپس میں تعارف و تعلق یہاں کاروباری نہیں، دوستانہ نوعیت کا تھا اور مجھے یہی خطرہ لاحق تھا کہ شاید وہ اس دوستانہ تعلق کا لحاظ رکھتے، مروت میں میری جھوٹی تعریف کر جائے گا۔ اس آخری دن جبکہ وہ میرے مسودہ کے چند صفحات پر اپنی رائے دینے والا تھا، ہم تینوں اسی ہوٹل میں ساتھ بیٹھ کر ڈنر کر رہے تھے، جہاں کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔

وہ جواباً مسکرایا۔ "جو میری سچی رائے ہے، وہ تو خیر میں آپ کو ہرگز نہیں دوں گا۔ ناول کے ابتدائی صفحات کو پڑھ کر یہ رائے دے دینا کہ یہ Best seller material ہے قبل از وقت ہوگا۔ یہ ناول کی ابتدا ہے۔ آپ کی کہانی اچھی ہے مگر نجانے آپ اسے اتنی خوب صورتی اور اتنی اچھی طرح لکھ پائیں گے یا نہیں جتنی اچھی طرح آپ نے آغاز کیا ہے تو اس ابتدائی مرحلہ پر میں آپ سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ کہانی کہنے کا ہنر آپ کو بخوبی آتا ہے۔ انگریزی مادری زبان نہ ہوتے ہوئے اس میں آپ کے اظہار کی قوت زبردست ہے۔ مشکل، مشکل، پیچیدہ گنجلک الفاظ کے استعمال کے بجائے سادہ الفاظ و سادہ انداز تحریر مجھے آپ کے پاس نظر آیا۔ جو کسی بھی لکھنے والے کی بہت بڑی خوبی ہوتی ہے کہ مشکل الفاظ کی بھرمار سے ہم کسی کی قابلیت سے تو ضرور متاثر ہو سکتے ہیں مگر وہ لفظ ہمارے دل پر اثر نہیں کر سکتے۔ آپ کے لفظ دل پر اثر کرتے ہیں۔ آپ اپنے اس ناول کو ضرور مکمل کیجئے۔ آپ میں ایک اچھا ناول نگار بننے کی تمام خوبیاں مجھے نظر آ رہی ہیں۔"

ایک پبلشر جو صبح شام کتنے ہی رائٹرز کے کام کو قبول یا مسترد کیا کرتا تھا کی اپنے کام پر رائے اور وہ بھی تعریفی رائے ظاہر ہے میرے لیے خوشی کا باعث تھی مگر ودیعہ.....اس کی آنکھیں تو ایک دم خوشی سے ایسے جگمگانے لگی تھیں جیسے پتا نہیں اسے کون سے خزانے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ اس روز کھانا کھانے کے دوران میں اور جان بکھم آپس میں کتابوں کی پبلشنگ، مارکیٹنگ اور پبلسٹی جیسے موضوعات پر باتیں کرتے رہے تھے جبکہ ودیعہ خاموشی سے ہم دونوں کی باتیں سنتی کھانا کھاتی رہی تھی۔ پاکستان میں پبلشنگ کے کاروبار اور پبلشرز کے معیار کے متعلق تو اس کی اتنی معلومات نہیں تھیں مگر برطانیہ میں پبلشنگ اور پبلشرز سے متعلق اس نے مجھے کافی ساری معلومات فراہم کی تھیں۔

''آج آپ بہت چپ ہیں؟'' کھانے کے بعد کافی پینے کے دوران اس نے ودیعہ سے پوچھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے یہ بتانے لگی کہ اسے ہم دونوں کی باتیں خاموشی سے سننے میں مزا آ رہا ہے۔

''آپ دونوں بہت ذہین اور باصلاحیت نوجوان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کی ذہانت ملاقات کے ابتدائی چند لمحوں میں ظاہر ہو جاتی ہے اور دوسرے کی کافی دیر سے۔'' ہم دونوں سے رخصت ہوتے وقت اس نے ہمارے بارے میں اپنی حتمی رائے دی تھی۔

میں لکھ تو پہلے بھی رہا تھا اور مسلسل اور متواتر لکھ رہا تھا مگر جان بکھم سے ملاقات کے بعد یوں ہوا تھا کہ میرا خود پر متزلزل ہوتا اعتماد اچھے انداز میں بحال ہو گیا تھا۔ یہ سب ودیعہ کی وجہ سے ہوا تھا۔ کانفرنس کے پہلے روز ودیعہ وہاں نہ ہوتی تو میں یہ جاننے کے باوجود کہ میرے برابر بیٹھا شخص ایک پبلشر ہے، کبھی اس سے بات چیت میں پہل نہ کرتا اور اگر کسی وجہ سے بات ہو بھی جاتی ''میں بھی لکھتا ہوں، میں بھی لکھ رہا ہوں۔ آپ میرے کام پر اپنی رائے دیں۔'' جیسی باتیں کبھی کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔

میرے گریجوایشن کا دوسرا سال پورا کا پورا اس ناول کی نذر ہوا تھا۔ اپنی دونوں جابز، پڑھائی اور اس وقت سے ہٹ کر باقی ہر وقت لکھنا۔ جیسے جیسے ناول آگے بڑھ رہا تھا میرے لکھنے کی رفتار اور میری لگن بھی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ جب میں یہ ناول لکھ لوں گا۔ جب میرا یہ ناول پبلش ہو جائے گا۔ میں اکثر تصور میں ایک چہرہ لاتا۔ ''یہ تمہاری کتاب ہے عمر! تمہارا ناول، واقعی تمہارا۔'' وہ چہرہ خوشی سے جھلملا رہا تھا۔ وہ آنکھیں مسرت سے جگمگا رہی تھیں۔ کتاب کے صفحے پلٹ پلٹ کر اسے بے یقینی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک چہرہ، وہ اس چہرے کی خوشی، وہ اس چہرے کی ہنسی مجھے اپنی بساط سے بڑھ کر محنت پر اکساتے۔ بسا اوقات میں رات میں دو چار گھنٹے ہی سو پاتا۔ ودیعہ کو میری فکر رہتی۔ اسے لگتا کہ میں بہت تھک رہا ہوں، ضرورت سے زیادہ محنت کر رہا ہوں۔ وہ مجھ سے کہتی کہ جب تک ناول کی مصروفیت چل رہی ہے۔ میں ایک جاب چھوڑ دوں۔ میری ضروریات پوری کرنے کے لیے تو ایک نوکری بھی کافی ہے۔

میری نیند پوری نہیں ہوتی تھی، میرا آرام پورا نہیں ہوتا تھا۔ میں تھک بھی بہت جاتا تھا مگر مجھے یہ نہیں لگتا تھا کہ میں کوئی انوکھا اور غیر معمولی کام کر رہا ہوں۔ میں ودیعہ کو اپنی عمر کے ان دوسرے لڑکوں کی مثالیں دیتا جو اپنے خرچ پر پڑھ بھی رہے تھے اور اپنے پورے پورے کنبے کے لیے کما کر بھی لا رہے تھے۔ میرے پاس تو رہنے کے لیے بہترین گھر تھا۔ مجھے کسی کے لیے کما کر نہیں لانا تھا۔ میں جو کما رہا تھا جو پس انداز کر رہا تھا سب اپنے لیے۔

☆☆☆

''ایران اور عراق دو مسلمان ملک آپس میں کیوں لڑ رہے ہیں۔ افغانستان پر روس نے چڑھائی کیوں کی ہے؟ اسے اس طرح کے بے شمار غم اور فکرات لاحق رہا کرتی تھیں۔ اس طرح کی فکرات خود پر سوار کرنا اس کی ہمیشہ کی عادت تھی اور میں اسے سارے جہاں کا درد اٹھائے پھرنے سے روکنے اور منع کرنے کی حتی الامکان کوششیں کیا کرتا تھا۔''

''تمہارے فکر کرنے سے کیا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟ نہیں نا؟ پھر کیوں ان ایشوز کو ذہن پر اتنا مسلط کرتی ہو؟''

میرے سمجھانے سے وہ وقتی طور پر سمجھ جاتی اور پھر بعد میں دوبارہ وہی اس کی سوچیں ہوتیں اور وہ ہوتی۔ کہاں زلزلہ، آندھی، طوفان آ گیا۔ کتنے لوگ مر گئے، کہاں خون ریزی اور فساد ہوئے، کتنی بے گناہ معصوم جانوں کا زیاں ہو گیا۔ کہاں ہتھیار بنائے گئے، کہاں استعمال کئے گئے۔ اس روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ شاید انڈیا میں کسی جگہ ہندو، مسلم فسادات جن میں بہت زیادہ مسلمان مارے گئے تھے۔

''دیا! اگر تمہارا یہی حال رہا نا تو عنقریب تم بوڑھی ہو جاؤ گی۔ خود پر ٹینشنز سوار کر کے دیکھ لینا کتنی جلدی تمہارے چہرے پر جھریاں پڑ جائیں گی، بال سفید ہو جائیں گے۔ جس چیز کو بدلنے پر ہمارا اختیار نہیں تو اس پر درد اور غم محسوس کرنے کے سوا ہم کیا کر سکتے ہیں؟ تم ذرا حال دیکھو اپنا۔ شکل دیکھو کیسی بارہ بجاتی ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔ اللہ کی بندی سدھر جاؤ اور ذرا یہ تو بتاؤ مجھے آج صبح جو میں لکھ کر رکھ کے گیا تھا، وہ تم نے پڑھا کیوں نہیں ہے؟''

جب تک وہ میرے لکھے پر تبصرہ نہ کر دے مجھے بے چینی سی رہتی تھی۔ میں اکثر سوچتا بھی اور اس سے کہتا بھی۔ ''دیا! اگر تم نہ ہو تو میں کیسے لکھوں گا؟''

وودیعہ میری خفگی کے جواب میں مجھے یہ بتانے لگی تھی کہ میرے کل رات اور آج صبح کے لکھے تمام صفحات وہ صبح یونیورسٹی جانے سے پہلے ہی پڑھ چکی تھی پھر میرے کہے بغیر اس نے اپنا تبصرہ جو کہ یقینی طور پر تعریفی ہی تھا، پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

پارس

رخسانہ نگار عدنان کی خوبصورت تخلیق ...... معاشرتی اصلاحی ناول پارس کہانی ہے ایک لاابالی کمسن لڑکی کی، جس کی زندگی اچانک اس پر نامہربان ہو گئی تھی۔ یہ ناول ہمارے معاشرے کے ایک اور چہرے کو بھی بخوبی اور واضح طور پر دکھاتا ہے اور یہ پہلو ہے ہائی سوسائٹی اور ان میں موجود برگر فیملیز اور نئی بگڑی ہوئی نسل۔ پارس ایک ایسے نوجوان کی کہانی بھی ہے جو زندگی میں ترقی اور آگے بڑھنے کے لیے شارٹ کٹ چاہتا تھا۔ قسمت نے ان دونوں کو ملا دیا اور کہانی نے نیا رخ لے لیا۔

''تم آفس میں تھے، تمہیں تمہارے آفس میں ڈسٹرب کرنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا پھر ڈرائیور تو موجود تھا۔ میں اس کے ساتھ ابامیاں کو اسپتال لے کر گئی۔ کہیں پر بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔''

ہسپتال کے احاطے میں کھڑی وودیعہ مجھے وضاحت دے رہی تھی۔ میرے چہرے پر غصہ، خفگی اور برہمی واضح طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں روزانہ کی طرح رات گئے گھر واپس آیا تھا اور آتے ہی بوا جی سے یہ سن کر کہ دوپہر میں کسی وقت ابا میاں کی طبیعت خراب ہونے پر وودیعہ انہیں ڈرائیور کے ساتھ اسپتال لے گئی تھی، الٹے پاؤں گھر سے بھاگا تھا۔ بھاگتا دوڑتا میں فوراً مطلوبہ اسپتال پہنچا تھا۔ انکل، آنٹی دونوں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے اور وودیعہ دوپہر سے ابامیاں کے ساتھ اسپتال میں اکیلی تھی۔ اس نے مجھے کال کیوں نہیں کی۔ وہ مجھے میرے آفس فون کر دیتی تو پھر خود ابامیاں کو اسپتال لے جاتی اور میں دفتر سے سیدھا وہاں پہنچ جاتا۔ ایک اکیلی لڑکی اور اسپتال کی بھاگ دوڑ۔ کوئی اور موجود نہ ہو تو مجبوری ہے مگر جب میں موجود ہوں تو اس نے مجھے فوری طور پر مطلع کیوں نہیں کیا؟ ابامیاں کو دیکھنے کے بعد، یہ اطمینان پا لینے کے بعد کہ بی پی کے بہت زیادہ بڑھ جانے کے سبب ان کی طبیعت بگڑی تھی اور اب وہ بہتر ہیں۔

میں نے وودیعہ سے یہی سب کہا تو میری بات کے جواب میں اس نے ''تمہیں ڈسٹرب کرنا اچھا نہیں لگا تھا'' کہہ کر ہمیشہ کی طرح ایک سیکنڈ میں میرے غصے کو صدمے اور رنج میں بدل دیا تھا۔ کیا ابامیاں میرے کچھ نہیں؟ صرف اسی کے سب کچھ لگتے ہیں۔ وہ اسپتال میں سارا دن ابا میاں کے پاس گزار دے تو وہ اس کا فرض ہے اور میں دفتر میں اپنے کام چھوڑ کر آ جاؤں تو ڈسٹرب ہوں گا، اس لیے کہ ابامیاں میرے کچھ لگتے نہیں ہیں۔ صرف اسی کے دادا ہیں۔

''عمر! پلیز خفا مت ہو۔ تمہارے پاس اپنی اتنی بھاگ دوڑ اور محنت ہے پھر ابامیاں کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی بھی نہیں، صرف ان کا بی پی۔'' وہ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مجھے وضاحتیں اور صفائیاں دے رہی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ میں نے خاموشی سے اس کی وضاحتیں سنی تھیں۔

ابامیاں اگلی صبح گھر واپس بھی آ گئے تھے۔ میں پوری رات ان کے پاس اسپتال میں رہا تھا اور صبح انہیں اپنے ساتھ لے کر گھر آیا تھا۔ گھر آنے کے بعد میں نے جی جان سے ان کی تیمارداری کی تھی۔ ان کی دوائیں لانا، انہیں اگلے کئی ہفتوں تک ڈاکٹر کے پاس معائنہ کرانے کے لیے لے جانا میں نے اپنی ذمہ داری بنا لیا تھا۔ وودیعہ اور بوا جی بھی میری طرح پوری تندہی سے ابامیاں کی تیمارداری میں مصروف تھیں۔

ہم سب نے مل کر ان کے بے تحاشا کام کرنے اور کھانے پینے میں لاپروائی برتنے پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں۔ وودیعہ سے ضروری بات چیت کے علاوہ کوئی اور بات میں نے ابامیاں کے گھر واپس آنے کے اگلے ایک دن تک نہیں کی تھی۔ یہ میری طرف سے میری ناراضگی کا اظہار تھا مگر دوسرے دن میں معمول کے انداز میں اس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ زندگی میں نجانے کون سی مرتبہ میں نے وودیعہ کے کسی رویے کی توجیہ تلاش کر کے اپنی خامی ڈھونڈ نکالی تھی۔ وودیعہ نے کچھ ایسا بھی نہیں کر دیا جو بہت غلط ہو۔ وہ ٹھیک ہے میں بے تحاشا جذباتی ہوں۔ اسی لیے غلط ہوں۔ خود کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہو جانے کے بعد میں اپنے روزمرہ کے معمولات میں مصروف ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اپنے امتحانات سے چند روز قبل میں...... ناول مکمل کر پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ میں نے ناول اتنے دل سے اور اتنی involvement کے ساتھ لکھا تھا کہ لکھتے لکھتے میں خود اپنے کرداروں کی محبت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میرا ان کے ساتھ ایک جذباتی رشتہ جڑ گیا تھا۔ وہ پچھلے ڈیڑھ سال سے میرے ساتھ تھے۔ انہیں میں نے سوچا تھا، انہیں میں نے جیا تھا، میں ان کے ساتھ ہنسا اور ان کے ساتھ رویا تھا، وہ چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہتے تھے۔ ناول ختم ہونے پر ایسا لگا جیسے میرا اپنے کرداروں سے جڑ جانے والا پیارا سا تعلق ختم ہو گیا ہے۔

ناول ختم ہونے کی خوشی کے ساتھ اپنے کرداروں سے بچھڑ جانے کا مجھے رنج بھی ہو رہا تھا۔ اپنے وہ کردار میں نے بڑی محبت سے تخلیق کیے تھے۔ وہ دنیا جس میں وہ رہتے تھے، وہ میں نے بڑے پیار سے سجائی تھی۔ میرے وہ کردار اور ان کی وہ دنیا کسی اور کو چاہے اچھی نہ لگتی مگر میرے دل سے تو وہ بہت قریب تھے۔ امتحانوں سے فارغ ہونے کے بعد اگلے تین ماہ میں نے اپنے مسودہ پر نظر ثانی کرنے، اس کی غلطیاں درست کرنے اور اسکی ٹائپنگ میں لگا دیے۔ میرے لکھنے کے مرحلے کے دوران ودیعہ کا کام اگر اسے ساتھ ساتھ پڑھنا اور اپنی رائے دینا تھا تو اب ٹائپنگ والے مرحلے میں وہ ٹائپنگ میں مجھے مدد دے رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح از خود، میرے بہت منع کرنے کے باوجود۔ اس مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد وہ اصل مرحلہ آیا جو میرے لیے ناول لکھ لینے سے بھی زیادہ مشکل اور صبر آزما ثابت ہوا۔

ودیعہ نے کہا تھا کہ اسے کوئی ادب سے بے بہرہ اور بدذوق شخص ہی رد کر سکتا ہے اور ودیعہ کے حساب سے تو یہاں سارے کا سارا شہر ہی بے ادب و بدذوق ثابت ہو رہا تھا۔ ایک بالکل نئے اور غیر معروف رائٹر کے لیے اپنا پہلا ناول پبلش کرانا ایک مشکل کام ہے۔ یہ میں جانتا تھا مگر اتنا زیادہ مشکل کہ ناممکن ہی نظر آنے لگے۔ یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ جب میدان میں اترا اور اپنے مسودے کو دھڑا دھڑ رد ہوتا پایا تو ہر خوش فہمی دم توڑنے لگی۔ یہ احساس ہونے لگا کہ واقعی کسی میگزین میں چند صفحات والے افسانے پبلش کرانے اور کسی ناشر سے اپنی کتاب پبلش کروانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پہلی بار جب ایک پبلشر نے میرے مسودے کو ناقابل اشاعت قرار دے کر مجھ سے معذرت چاہی تو دل کو تکلیف تو بہت پہنچی مگر ہمت ذرا نہ ٹوٹی۔

مگر پھر ایک کے بعد ایک مہینے مسلسل انکار مجھے مایوس کرنے لگے۔ اپنے ناول پر بنی ودیعہ کی ساری تعریفیں، تمام تبصرے، جان بکھم کی رائے اور اس سے بھی پہلے میرے قلمی نام سے چھپنے والے افسانے اور ان پر قارئین کی توصیف و ستائش سب جھوٹی لگنے لگیں۔ ہمت ٹوٹنے لگی مگر مجھے اس مرحلے پر خود سے زیادہ ودیعہ کی فکر لاحق تھی۔ وہ میرے ناول لکھ لینے پر اتنی خوش تھی، وہ اس کے پبلش ہو جانے کے لیے اتنی پُرامید و پُرجوش تھی اور اب ہر بار جب میرا مسودہ رد ہوتا تو اس کی آنکھیں دکھ سے بھر جاتیں، ان میں اشک ٹھہر جاتے۔ وہ مجھے حوصلہ دلانے کو امید بھری باتیں کرتی اور میں اس کی آنکھوں میں بکھرے درد کو دیکھ کر رد ہونے کا اپنا سارا دکھ بھول جاتا۔ یاد رہتا تو بس اتنا کہ میں اس کی ایک خوشی پوری نہیں کر پا رہا ہوں جو مجھے ساری دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے پھر میں اللہ سے دعا مانگا کرتا کہ میرا ناول پبلش ہو جائے۔ اس لیے نہیں کہ میں نے اس پر محنت بہت کی ہے اور محنت کبھی کسی کی رائیگاں نہیں جاتی بلکہ اس لیے کہ میں اس لڑکی کی آنکھوں میں دکھ نہیں دیکھ سکتا جس کی سب سے بڑی آرزو میری کتاب دیکھنے کی ہے۔

تقریباً ایک سال ہو رہا تھا مجھے ناول کو پبلش کرانے کی کوششیں کرتے۔ اس ایک سال کے دوران میں بے شمار جگہوں پر اپنا مسودہ رد ہوتا دیکھ چکا تھا۔ اگر میں ابا میاں کا نام استعمال کرتا تو میری کتاب باآسانی شائع ہو جاتی۔

سعادت علی خان ایک بڑا نام تھا۔ ابا میاں خود کسی جگہ میرے لیے ذاتی طور پر کوشش نہ بھی کرتے تب بھی ان کا اتنا نام تھا کہ بہت سے نامی گرامی پبلشر جو ایک غیر معروف اور نئے رائٹر کو دیکھ کر اکثر خوش اخلاقی کا بھی کم کم ہی مظاہرہ کرتے تھے فوراً مجھے اہمیت دینے پر مجبور ہو جاتے مگر مجھے ابا میاں کا نام استعمال نہیں کرنا تھا۔

اگر عمر حسن کا لکھا پبلش ہونے کے لائق ہے تو میرٹ پر ہوگا اور اگر نہیں تو نہیں ہوگا۔

ابا میاں یہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ میں نے کوئی ناول لکھ ڈالا ہے۔ میں ان سے چھپ کر بڑے آرام سے ان کا نام استعمال کر سکتا تھا مگر میں یہ حرکت کبھی کر نہیں سکتا تھا۔

''عمر! تم 'JBM' کے پاس اپنا مسودہ کیوں نہیں بھیج دیتے؟'' اس روز کھانا کھانے کے دوران ودلیعہ مجھ سے بولی۔

''جے بی ایم بکس؟ تم جان بکہم کی بات کر رہی ہو؟'' میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے مجھے اس کی دماغی صحت پر شبہ ہو۔

''ہاں، ان ہی کی۔'' وہ سلاد کے پیالے میں سے سلاد کے پتے چن رہی تھی۔

''تم خیریت سے ہو یا یہ چارہ کھا کھا کے واقعی......''

''کیوں جناب! کون سی غلط بات کہہ دی ہے میں نے؟ اتنے پبلشرز کو تم نے ٹرائی کیا ہے، ایک اسے اور سہی۔ پھر جان بکہم نے تمہارے انداز تحریر کی کتنی تعریف کی تھی۔ یاد ہے ہماری آخری ملاقات میں وہ تم سے کتنا متاثر نظر آ رہا تھا۔'' وہ میرا جملہ درمیان سے اچک کر تیزی سے بولی۔

''بچوں جیسی باتیں مت کرو دیا! یہاں اپنے ملک کے پبلشرز میرا نام شائع کرنے کو تیار نہیں اور وہ لندن میں بیٹھ کر تیار ہو جائے گا؟ خدا کے لیے دن میں خواب دیکھنا چھوڑ دو۔''

میں اپنی پلیٹ میں موجود پنیر کے تمام ٹکڑے کانٹے سے اٹھا کر اس کی پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔

''جن پبلشرز کے پاس بھی تم اپنا مسودہ لے کر گئے ہو، انہوں نے اسے اس لیے ریجیکٹ نہیں کیا کہ وہ اچھا نہیں ہے، معیاری نہیں ہے، اشاعت کے قابل نہیں ہے، ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا بلکہ صرف اس لیے کہ تم نئے اور غیر معروف رائٹر ہو۔ انہوں نے تمہارے کام کو توجہ سے دیکھا ہی نہیں، اسے وہ اہمیت نہیں دی جو اسٹیبلشڈ رائٹرز کے کام کو دی جاتی ہے۔ یاد ہے، یہی بات جان بکہم نے ہمیں بتائی تھی۔ چاہے نئے رائٹر کا کام پرانے سکہ بند ادیبوں سے لاکھ گنا اچھا ہو، پر نئے رائٹر کے ساتھ رسک کون لے۔ کیا پتا ان میں سے کسی نے تمہیں انکار کرنے اور معذرت کرنے سے قبل تمہارا مسودہ ڈھنگ سے پڑھنے کی زحمت گوارا کی بھی تھی کہ نہیں۔'' اس نے پنیر کے ٹکڑے منہ میں رکھتے ہوئے مجھے قائل کرنا چاہا۔

''یہی بات تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ میرے ملک کے پبلشرز نیا اور غیر معروف ہونے کے سبب مجھے رد کر رہے ہیں تو ایک غیر ملکی پبلشنگ ہاؤس اسے کیسے قبول کر لے گا؟ جان بکہم بزنس مین ہے۔ کتابیں پبلش کرنا اس کا کاروبار ہے۔ وہ رشتہ داریاں جوڑنے اور دوستیاں نبھانے نہیں بیٹھا کہ محض جان پہچان اور واقفیت کا لحاظ رکھتے اخلاقاً اور مروتاً میری کتاب شائع کر دے۔'' میں نے سنجیدگی سے اسے سمجھانا چاہا۔

''رشتہ داریاں اور دوستیاں کرنے کو کون کہہ رہا ہے۔ تمہارا کام میرٹ کی بنیاد پر ہی منتخب ہوگا۔ وہاں مسودہ بھیجنے میں یہ فائدہ ہے عمر! کہ

بغیر دیکھے اور بغیر پڑھے اسے مسترد نہیں کیا جائے گا۔ جان بکہم تمہارے ناول کے ابتدائی پچاس صفحات پڑھ چکا ہے۔ وہ ان کی تعریف بھی کر چکا ہے اور سب سے بڑھ کر قسمت آزما لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے۔ فرض کر لیا کہ وہاں سے بھی تمہیں ریجیکشن لیٹر موصول ہو جاتا ہے پھر؟ اس انکار کے بعد کوئی دنیا ختم تو نہیں ہو جائے گی۔ بس یہ اطمینان ہمیں حاصل ہو جائے گا کہ ہم نے ممکنہ ہر جگہ کوشش کی تھی۔ یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے تھے۔'' وہ قائل ہونے کے نہیں قائل کرنے کے موڈ میں تھی۔

''دیا! پتا نہیں اسے ہم لوگ یاد ہوں گے بھی یا نہیں۔ پورے دو سال ہو گئے ہیں ہمیں اس سے ملے اور جب ہم یاد نہیں ہوں گے تو میرے ناول کے وہ چند صفحات جو اس نے پڑھے تھے وہ کیونکر یاد ہوں گے؟''

''عمر! تمہاری فرض کردہ ہر منفی بات کو میں مان لیتی ہوں مگر تم صرف میری ایک بات مان لو۔ اپنا مسودہ جان بکہم کو بھیج دو۔ پلیز میری خاطر۔''

اب بحث واختلاف کی کوئی گنجائش رہ ہی نہیں گئی تھی۔ پہلے بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوا تھا اور اس بار بھی۔ اس لڑکی کو مجھ سے اپنی بات منوانی آتی تھی یا شاید یہ میری محبت تھی جو کبھی اسے نہ کہہ ہی نہیں پاتی تھی۔ اس کی بات غلط ہو تب بھی صحیح لگتی تھی۔ میں ودیعہ کی بات مان گیا تھا۔ میں نے ''JBM BOOKS'' کے پاس اپنا مسودہ معہ جان بکہم کے نام ایک خط کے لندن روانہ کر دیا تھا۔

ناول مکمل کر لینے کے بعد کے تمام عرصہ کے دوران یعنی پچھلے ایک سال میں، میں ناول کی اشاعت کی کوششوں کے ساتھ اپنے لندن میں ایڈمیشن وغیرہ سے متعلق تمام ضروری کارروائیاں کرنے پر مصروف رہا تھا۔ اتنے سالوں دن رات محنت کر کے سخت ترین ملازمتیں کر کے میں اس قابل ہو چکا تھا کہ باہر جانے کے سلسلے میں ہونے والے تمام اخراجات خود اٹھا سکوں۔

اس ایک سال کے دوران جب میں لندن جانے کی عملی بھاگ دوڑ اور کوششوں میں مصروفیت کے ساتھ اپنے مسودے پر تواتر سے ریجیکشن وصول کر رہا تھا، تب ودیعہ اپنا آنرز کا آخری سال مکمل کر رہی تھی۔

ابا میاں مجھے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے کوشاں دیکھ کر بے انتہا خوش تھے جسے بہت محبت سے اپنی زندگی میں شامل کر کے برسوں پہلے اپنے گھر کا ایک فرد بنایا تھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے، معاشرے کا ایک باوقار کامیاب انسان بن کر انہیں سرخرو کر دے۔ میں ان کی اس خواہش سے آگاہ تھا۔ میں ان کا سر فخر سے بلند کر دینا چاہتا تھا۔ میں ابا میاں کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کے ساتھ فخر بھی دیکھنا چاہتا تھا۔

''عمر! مجھے تم پر فخر ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ جو امیدیں میں نے تم سے وابستہ کی تھیں تم نے وہ سب پوری کر دیں۔'' میں ان کے لبوں سے اپنے لیے یہ جملہ سننا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے داخلے کے حوالے سے انہیں سے مشورے لیے۔ مجھے کہاں داخلہ لینا چاہیے، کیا پڑھنا چاہیے، وہ اتنے برسوں تک کیمبرج میں پڑھاتے رہے تھے۔ درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ رہے تھے۔ ان کے پاس UK کے تعلیمی اداروں کے متعلق بہت شاندار معلومات تھیں۔ میں نے ان کے مشوروں سے استفادہ...... کیا۔ جہاں جہاں انہوں نے کہا وہاں وہاں داخلے کی عملی کوششیں شروع کیں۔ وہ میرے داخلے کے سلسلے میں میری مالی معاونت بھی کرنا چاہتے تھے۔

''ابھی میرے پاس اپنے جمع کیے بہت پیسے ہیں ابا میاں! جب وہ ختم ہو جائیں گے پھر آپ سے ہی مانگوں گا۔''

میرے لیے ان کی رہنمائی اور ان کے مشورے ہی بہت کچھ تھے۔ ان کی رہنمائی کے بغیر میں کبھی درست ادارے کا انتخاب نہ کر پاتا۔ جب میں نے جان بلہم کو اپنا مسودہ لندن بھیجا، تب میرا لندن ہی میں داخلہ ہو چکا تھا۔ میں وہاں کری ایٹو رائٹنگ میں MFA کرنے جا رہا تھا۔ میں لندن جانے کی بقیہ تمام فارمیلیٹیز پوری کرنے میں جلدی جلدی مصروف تھا اور اس دوران مجھے اپنا مسودہ JBM بھیجے ایک یا دو نہیں پورے چھ ماہ گزر چکے تھے۔ پہلے دو، تین ماہ میں نے مسترد کیے جانے ہی کے لیے سہی مگر جان بلہم کی جانب سے جواب کا شدت سے انتظار کیا پھر چوتھے اور پانچویں مہینے یہ شدید انتظار پریشانی اور فکر میں تبدیل ہوا اور چھٹے مہینے یہ مکمل مایوسی اور نا امیدی میں بدل گیا۔

ودلیعہ جو وہاں میرے مسودہ بھیجنے پر بڑی پر جوش تھی، وہ بھی چھٹے مہینے کے آتے آتے مایوس نظر آنے لگی تھی۔ وہ آنرز مکمل کر چکی تھی اور ان دنوں انگریزی ادب ہی میں ماسٹرز کر رہی تھی۔ اس کے آرٹیکلز اب کئی بڑے اخبارات میں بھی جگہ پانے لگے تھے۔

''ناول پبلش نہیں ہوا تو نہیں ہوا، کوئی دنیا ختم تو نہیں ہو گئی دیا!'' میں نے ایک روز اسے اسی کے انداز میں رسانیت سے سمجھایا۔ وہ اپنے الفاظ میرے منہ سے سن کر مسکرائی مگر اس کی آنکھوں میں پھر بھی اداسی ہی بھری رہی۔

''تم چاہتی تھیں میں لکھوں، میں نے لکھ لیا۔ مجھے لکھ کر طمانیت اور سکون ملا اور تمہیں میرا لکھا پڑھ کر خوشی۔ بس اتنا کافی ہے۔ ہمارے بچپن میں بھی تو یہی ہوتا تھا دیا! میں تمہیں کہانیاں سناتا تھا تو تم خوش ہوتی تھیں اور مجھے بھی تمہیں کہانیاں سنانے میں مزا آتا تھا۔ وہ کہانیاں کون سی کہیں چھپتی تھیں۔ یہ ناول بھی بس اسی مقصد کے لیے تھا۔ میں لکھ کر خوش ہوں اور تم اسے پڑھ کر۔ یہ ہماری ایک آپس کی چیز تھی اور اب تم اس بات پر اپنا دل ہرگز میلا نہ کرنا، نہ اداس ہونا، نہ دکھی۔ میرے لندن جانے کے بعد بھی نہیں۔ میرا دل اتنے سارے ریجیکشن پر دکھا ہے مگر ایسا نہیں کہ میں نے اسے اپنے اعصاب پر سوار کر لیا ہو اور اب تم بھی اسے اپنے اعصاب سے اتار کر پھینک دو۔ دنیا میں ناول پبلش ہونے کے علاوہ بھی میرے لیے بہت کچھ ہے۔''

یہ پانچویں مہینے کے ختم ہو جانے کے بعد کی بات تھی، جب میں نے ودلیعہ کو یہ سب سمجھایا تھا۔ میرے جانے میں بہت کم دن رہ گئے تھے اور میں اسے دکھی اور اداس چھوڑ کر یہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں اب اپنے جانے کی آخری تیاری یعنی گرم کپڑوں وغیرہ کی خریداری، ساتھ ساتھ اپنی پیکنگ اور دوست احباب سے الوداعی ملاقاتیں کرنے میں مصروف تھا۔ میرے جانے میں رہ بھی تو صرف پانچ دن رہ گئے تھے پانچ دن تھے اور کام مجھے بہت نمٹانے تھے۔

ابا میاں ہر روز مجھے اپنے پاس بٹھا بٹھا کر یہ تلقین کر رہے تھے کہ جب بھی کبھی مجھے پیسوں کی ضرورت ہو تو میں فوراً اور بے جھجک ان سے رابطہ کروں۔ پیسوں کی کمی یا کسی بھی طرح کی مالی مشکلات کے سبب مجھے کسی بھی مرحلے پر اپنی تعلیم نامکمل نہیں چھوڑنی جیسے جیسے میرے جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ ویسے ویسے ودلیعہ کے چہرے کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہمارا اتنے برسوں کا ساتھ تھا اور اتنے برسوں میں، میں نے کبھی اسے اتنا اداس نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھے ہر وقت بھیگی بھیگی نظر آتیں، اس کے لبوں پر ہر پل پھیکی سی مسکراہٹ دکھائی دیتی۔ اس اداسی کی وجوہات

میں جانتا تھا۔ یہ اداسی صرف میرے جانے کی وجہ سے نہیں تھی۔ وہ اتنی زیادہ اداس اور بجھی ہوئی اس لیے تھی کہ میں اپنے دو سال کی محنت، اپنے پہلے ناول، اپنی پہلی کوشش کی ناکامی ساتھ لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔ ''میں لکھنے کے لیے پیدا ہوا ہوں'' اس کے دلائے اس یقین پر میرا اعتماد ٹوٹنے لگا ہے۔ وہ میرے اعتماد کے ٹوٹنے پر بہت اداس تھی اور اس اداسی کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ وجہ دیگر تمام وجوہات سے بڑی تھی۔ وہ ماسٹرز کر رہی ہے۔ میرے پیچھے اس کا ماسٹرز مکمل ہو جائے گا اور پھر ہر والدین کی طرح انکل، آنٹی اس کی شادی کے متعلق سوچیں گے۔

''تم یوں چپ چاپ، خاموش، بنا کچھ کہے چلے جاؤ گے؟ اس کی آنکھیں ہر وقت مجھ سے یہ سوال کر رہی تھیں۔ میں اس کی آنکھوں میں تحریر بہت سے سوال پڑھ رہا تھا، وہ مجھ سے کس چیز کی آرزو کر رہی ہے، یہ جان رہا تھا میں اس کے وجود سے لپٹے بہت سے خوف دیکھ رہا تھا۔

''کہیں میرے علاوہ کوئی اور شخص تو اس کی زندگی میں زبردستی داخل نہیں ہو جائے گا؟'' میں اس کے سارے خوف نظر انداز کر رہا تھا۔ میں اس کی تمام آرزوؤں کو جان کر بھی ان سے انجان بن رہا تھا۔ میں اس کے سب سوالوں سے نظریں چرا رہا تھا۔ خوف، پریشانی، اضطراب، اداسی میں یہ سب اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بھی کیا کر سکتا تھا؟ میرے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا۔ اسے کسی اور کا ہوتا میں کبھی بھی دیکھ نہیں سکتا تھا۔

مگر میری اوقات کیا تھی جو میں اس کی طلب کر سکتا۔ سچائیاں اپنی تمام تر سفاکیوں کے ساتھ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ کبھی نہ کبھی یہ سنگین لمحات ہماری زندگی میں ضرور آئیں گے۔ میں جانتے بوجھتے ان ان دیکھے لمحات سے نظریں چرایا کرتا تھا مگر نظریں چرانے سے کیا ہوتا ہے۔ جن لمحات کو کبھی نہ کبھی آنا ہی تھا، وہ سخت ترین لمحات ہمارے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں اس روز، رات کے کھانے سے کچھ پہلے گھر میں داخل ہوا تو گھر میں کچھ مہمان آئے بیٹھے تھے۔

''بالکل ٹھیک وقت پر آ گئے عمر! ہم لوگ بس ڈنر کے لیے اٹھ ہی رہے تھے۔'' ابا میاں مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔

پھر وہ میرا مہمانوں سے مہمانوں کا مجھ سے تعارف کروانے لگے۔ وہ انکل کے دوست کی فیملی تھی۔ دونوں میاں بیوی ڈاکٹرز اور ساتھ آیا ہوا بیٹا اور بیٹی بھی ڈاکٹر...... مہمانوں کے گھر پر آنے میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر یہ مہمان مجھے کچھ مختلف نوعیت کے مہمان لگ رہے تھے۔

کھانے کے وقت جس طرح انکل کے دوست کی بیگم نے بڑی محبت اور اصرار سے ودیعہ کو اپنے برابر کی کرسی پر بٹھایا، میں اس پر ایک دم ہی چوکنا ہوا۔ وہ آنٹی، انکل اور ابا میاں سے باتیں کرنے سے زیادہ ودیعہ کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھیں اور ان کا وہ ڈاکٹر بیٹا جو امریکہ سے گریجویشن کر کے آیا تھا اور عنقریب پوسٹ گریجویشن کے لیے دوبارہ امریکہ ہی چلا جانے والا تھا، کھانا کھانے کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد ودیعہ کو بھی ضرور گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہیں مجھے اتنی بری لگ رہی تھیں دل چاہ رہا تھا اس کی آنکھیں پھوڑ دوں۔ ایسا زور کا ایک پنچ اس کے منہ پر ماروں کہ اس کی یہ حسین شکل بگڑ کر رہ جائے۔ یہ اس قابل ہی نہ رہے کہ ودیعہ کو نظر اٹھا کر دوبارہ کبھی دیکھ بھی سکے۔ اس کی مسکراہٹ، اس کا اطمینان اور اس کا ودیعہ کو گھورنا، میں خون کے گھونٹ پیتا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

آنٹی، انکل جس طرح ان لوگوں کی تواضع کر رہے تھے، اس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ فیملی اور خاص طور پر وہ امریکہ پلٹ ڈاکٹر انہیں کس قدر پسند آ چکا ہے۔ کھانا مجھے اچانک ہی بد مزہ لگنے لگا تھا۔ بھوک بالکل غائب ہو چکی تھی۔ میری مجبوری تھی، میں مہمانوں کے سامنے کھانا چھوڑ کر

اٹھ کر جا نہیں سکتا تھا۔ مجھے مروتاً وہیں بیٹھا رہنا تھا۔ مہمانوں سے خوش اخلاقی کا مظاہرہ بھی کرنا تھا اور اس امریکہ پلٹ ڈاکٹر سے باتیں بھی کرنی تھیں کہ وہاں اس کے ایج گروپ کا ایک ہی لڑکا تھا۔

میں……ودیعہ کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا مگر جانتا تھا، آنٹی کے کہنے پر اچھی طرح سجنے سنورنے کے باوجود وہ خود کو کتنا اجڑا ہوا محسوس کر رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھی ہیں، اس کا حال ایسا ہے کہ وہ کسی بھی پل رو پڑے گی۔ میں اس سے نظریں چرائے اس کی آنکھوں میں جمع آنسوؤں کو اپنے دل پر گرتے دیکھتا رہا۔

''یہ لوگ میرے رشتے کے لیے آئے تھے۔'' ان لوگوں کے جاتے ہی وہ میرے پاس آئی اور طنزیہ لہجے میں مجھے یہ اطلاع دی۔

''ہاں، مجھے پتا ہے۔'' اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے اپنے کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے لگا۔

''تمہیں پتا ہے، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ممی پاپا میری منگنی کرنے کے موڈ میں ہیں، اپنا جانا چند دن آگے بڑھا لو تاکہ میری منگنی میں تمہاری بھی شرکت ہو سکے۔'' میں اس طنز اور طعنے بازی پر بھی سر جھکا کر اپنا کام کرتا رہا۔ اس نے کچھ دیر میرے جھکے سر کو بغور دیکھا۔ میرے جواب کا انتظار کیا اور پھر بھاگتی ہوئی میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔

مجھے پتا تھا وہ رو رہی تھی، مجھے پتا تھا وہ مجھ سے خفا تھی، مجھے پتا تھا وہ مجھ سے ایک واضح اظہار اور تھوڑی سی جرأت مندی کی توقع رکھتی تھی مگر میں بے بس تھا، بے اختیار تھا۔ اس پل سے زندگی میں ہمیشہ اتنا ڈرا تھا، اتنا بھاگا تھا، اتنا خوفزدہ ہوا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے ڈرنے، بھاگنے اور کترانے کے باوجود یہ پل ایک روز ہماری زندگی میں ضرور آئے گا اور اس پل میری کم مائیگی میرے سامنے آ کھڑی ہوگی جو میرے مدمقابل تھا، وہ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر تھا، مجھ سے کہیں اچھا تھا۔ میرا اور اس کا کوئی مقابلہ تھا ہی نہیں۔ ایک معزز خاندان کا فرد، معاشرے کے باعزت اور معزز والدین کا بیٹا، ماں باپ دونوں ڈاکٹر، ایک بہترین گھر، اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوشحال زندگی، روشن مستقبل اور میں……؟ بے نام و نشان، لاوارث۔ نہ ماں باپ کا پتا، نہ خاندان کا۔ میں تو پہلے ہی مقام پر شکست کھا گیا تھا۔ آگے اپنا کسی سے کیا موازنہ کرتا۔

ابا میاں مجھ سے چاہے جتنا پیار کر لیں مگر اس حوالے سے تو میں ان کے لیے بھی قابل قبول ہو ہی نہیں سکتا تھا پھر انکل، آنٹی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیسے سمجھاؤں اس پاگل لڑکی کو یہ بات؟ میں اس کے قابل نہیں۔ میں تو اس کی تمنا خود سے بھی ڈر ڈر کر چھپ چھپ کر کرتا ہوں، اس کے ساتھ کے خواب خود سے چھپا کر چوری چوری دیکھتا ہوں۔

وہ رو رہی تھی، میں سکون سے کیونکر بیٹھ سکتا تھا۔ بے سکون، مضطرب میں اپنے کمرے سے نکل کر ٹیرس پر آ گیا۔ یہاں سے وہاں پریشانی میں ٹہلتے میری نظر لان پر پڑی۔ وہاں لان چیئرز پر ودیعہ مجھے ابا میاں کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔

وہ اس وقت اکیلی نہیں، وہ رو نہیں رہی، ابا میاں اس کے پاس ہیں، میں اندھیرے میں دور سے اس کی شکل دیکھ کر خود اپنے آپ کو اطمینان دلانے کی کوشش کرنے لگا مگر کوشش سے، بہلاووں سے کیا اطمینان حاصل ہو جایا کرتا ہے؟ میری وجہ سے اسے دکھ مل رہا ہے اور میں اس کے دکھ کو دور کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہا۔

''دیا! مجھے معاف کر دو جو تمہاری آرزو ہے، وہی میری بھی آرزو ہے۔ میری زندگی کی سب سے پہلی آرزو، میری زندگی کا سب سے پہلا خواب مگر میں کیا کروں؟ میرے اختیار میں کچھ بھی تو نہیں۔ جس کے روشن مستقبل کے سبب آنٹی، انکل اسے تمہارے لیے پسند کر رہے ہیں، میں بھی اپنا مستقبل اسی جیسا بلکہ اس سے بھی اچھا بنا سکتا ہوں۔ پچھلے کئی برسوں سے لاشعوری طور پر یہی کچھ تو کرتا رہا ہوں۔ خود کو تمہارے قابل بناتا رہا ہوں۔ میں تمہاری خاطر ہر سختی جھیل سکتا ہوں، ہر امتحان سے گزر سکتا ہوں، میں تمہاری خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ ان تھک محنت اور جہد مسلسل سے میں اپنے مستقبل کو تو سنوار سکتا ہوں مگر میرا ماضی؟ میں اسے نہیں بدل سکتا۔ میرا اصل، میری پہچان، میری شناخت، میرا ماضی سائے کی طرح ہمیشہ میرے ساتھ رہا ہے اور ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ میں اس سے زندگی بھر پیچھا نہیں چھڑا پاؤں گا۔ مستقبل روشن اور تابناک بنالوں مگر ماضی کا کیا کروں؟'' میں بہت بوجھل دل لیے اپنے کمرے میں واپس آ گیا تھا۔

☆☆☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

اگلے روز زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا جب ودیعہ مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی اور میری ہمت نہیں ہو رہی تھی اسے مخاطب کرنے کی۔ یہ ہماری زندگیوں کا پہلا موقع تھا جب ہم ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔ وہ مجھ سے سخت خفا تھی اور کسی قیمت پر مجھ سے بات کرنے کو آمادہ نہ تھی۔ میں اس کی ناراضگی دور کیسے بنا، اسے منائے بنا یہاں سے کیسے جا پاؤں گا؟ میں اپنے کمرے میں اندھیرا کیے بالکل خالی الذہنی کی کیفیت میں اکیلا بیٹھا تھا۔ پتا نہیں کتنے گھنٹوں سے۔

''عمر! تمہارا فون ہے۔'' ودیعہ کی آواز مجھے بہت دور سے سنائی دی، وہ بھاگتی ہوئی میرے ہی کمرے کی طرف آرہی تھی۔ مجھے اس کی آواز میں ناراضگی نہیں بلکہ ایکسائٹمنٹ محسوس ہوئی تھی۔

''عمر! جے بی ایم بکس' سے تمہارے لیے فون آیا ہے۔ جلدی آؤ۔'' وہ بھاگتی ہوئی میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ میں نے ایک سیکنڈ اس کی بات کا مطلب سمجھنے میں لگایا۔ ''جے بی ایم بکس؟ جان بکہم؟''

''جلدی چلو عمر!'' میں تیز قدموں سے چلتا اور وہ میرے پیچھے بھاگتی لاؤنج میں آئی۔ ودیعہ کے جوش و خروش سے بھرے چہرے کو دیکھتے میں نے ریسیور اٹھایا۔

''مسٹر عمر حسن؟'' دوسری طرف ایک لڑکی نے مجھ سے پوچھا۔

''جی۔'' میں کوئی لمبا فقرہ بول نہیں سکتا تھا۔ میرا دل ایک دم بہت تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ودیعہ میرے بالکل برابر کھڑی تھی، ریسور کے ساتھ اپنا کان لگائے۔

''مسز الزبتھ اولیور آپ سے بات کریں گی۔ میں لائن ملا رہی ہوں، آپ ہولڈ کیجیے۔'' ودیعہ نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر ایکسائٹمنٹ بھی تھی اور ڈر بھی۔'' اور کچھ اسے نہیں دے سکتا، کاش میں اسے یہ خوشی دے پاؤں، کاش جان بکہم کے پاس پبلشنگ ہاؤس کے پاس میرے لیے ایک خوش خبری ہو۔''

ریسیور کان سے لگائے میں دیکھ ودیعہ کو رہا تھا اور دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہا تھا۔ آس اور امید میں گھری، منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی، مجھ سے اپنی خفگی بھلائے وہ وہی ودیعہ تھی، میرے لئے زندگی میں ہر چیز بہترین چاہنے والی۔ دوسری طرف لائن پر اب 'JBM' کی سینئر ایڈیٹر الزبتھ اولیور تھیں۔ پہلے انہوں نے اپنا تعارف کروایا پھر میری خیریت معلوم کی۔ ''کیسے ہیں آپ عمر حسن؟'' اس وقت یہ رسمی جملے اور تمہید میری برداشت کا امتحان تھی۔ اچھی یا بری جو بھی خبر تھی، میں فوراً سن لینا چاہتا تھا۔ مسودہ بھیجنے کے چھ ماہ بعد جا کر تو وہاں سے کوئی اطلاع ملنے والی تھی، ورنہ اب تک کئی بار میں اور ودیعہ اس بات پر تبصرہ کر چکے تھے کہ جان بکہم تو سب سے زیادہ روڈ ثابت ہوا ہے۔ اس نے تو ایک ریجیکشن لیٹر بھیجنے جیسی کرٹسی تک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ چند سیکنڈز میں، میں یہ جان لینے والا تھا کہ یہ فون کیوں کیا گیا ہے، مجھے ننانوے فیصد امید ایک مؤدبانہ سی معذرت کی تھی۔

''ہم اس طرح کے ناولز پبلش نہیں کرتے، آپ کہیں اور کوشش کیجیے۔''

''آپ کے ناول کی ابتداء اچھی تھی، کہانی بھی اچھی تھی مگر آگے چل کر آپ اپنے موضوع سے انصاف نہیں کر پائے، ہمیں افسوس ہے ہم

اسے پبلش نہیں کرسکیں گے......"

"آپ میں لکھنے کی صلاحیت تو ہے مگر آپ کا پلاٹ کمزور ہے۔ اس طرف توجہ دے کر دوبارہ کوشش کیجئے۔" میں نے ایک لمحے میں کئی ممکنہ معذرتی فقرے سوچ ڈالے تھے۔

"سب سے پہلے تو آپ کو آپ کا پہلا ناول مکمل کر لینے کی مبارکباد۔" الزبتھ اولیور کا لہجہ اور گفتگو کا انداز دونوں مکمل طور پر پروفیشنل تھے۔ میرے دل کی دھڑکن ہر اگلے لمحے تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ میرے بازو پر ودیعہ کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہوگئی تھی۔ اس کی شکل اتنی ڈری ہوئی اور خوفزدہ ہو رہی تھی، آس و نراس میں ڈوبی۔

"مجھے آپ کو یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ہم آپ کا ناول پبلش کر رہے ہیں۔"

میرے کانوں نے جو سنا اس پر میں نے بے یقینی سے ریسیور کو دیکھا۔ ودیعہ نے جس طرح ریسیور سے کان لگا رکھا تھا تو جو میں نے سنا وہ میرے ساتھ اس نے بھی سن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم ہی خوشی، سکون، جوش اور مسکراہٹ بکھری تھی۔ ڈر اور خوف ایک سیکنڈ میں غائب ہوئے تھے۔ الزبتھ اولیور اسی پروفیشنل ٹون میں مجھ سے یہ کہہ رہی تھی کہ کتاب کی پبلشنگ سے متعلق تمام شرائط و ضوابط کنٹریکٹ سائن کرنے سے متعلق معلومات اور کنٹریکٹ وہ مجھے جلدی سے بھجوا دیں گی۔ ودیعہ کو جو خبر سننی تھی، وہ اسے سن چکی تھی۔ اب میری مزید گفتگو سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ میرا بازو چھوڑ کر بھاگتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف جا رہی تھی۔

"ابا میاں...... ابا میاں...... عمر کا ناول پبلش ہو رہا ہے، ابا میاں عمر کی کتاب چھپ رہی ہے، ابا میاں لندن سے فون......" وہ بھاگتی اور زور زور سے بولتی ابا میاں کے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔

الزبتھ اولیور سے میری رسمی و پیشہ وارانہ نوعیت کی گفتگو جلدی ختم ہوگئی تھی۔ میں بھی تھوڑی دیر بعد ودیعہ کی طرح ابا میاں کے کمرے میں تھا۔ وہ ان چند منٹوں میں انہیں جوشیلے لہجے میں میرے ناول لکھنے اور مسودہ لندن بھیجنے کا احوال جلدی جلدی سنا چکی تھی۔ ابا میاں نے جیسے ہی مجھے دیکھا، فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور فرط محبت سے مجھے گلے لگا لیا۔

"میں جانتا تھا، میرا با صلاحیت بیٹا زندگی میں کچھ نہ کچھ غیر معمولی کارنامہ ضرور سر انجام دے گا۔ دکھائے گا۔"

"ابا میاں! آپ خوش ہوئے؟"

"صرف خوشی؟ میں بہت بہت خوش ہوں بیٹا!" انہوں نے میرا ماتھا چومتے میرے سوال کا جواب دیا۔ ودیعہ خوشی اور ایکسائٹمنٹ میں گھری ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے یہ یاد ہی نہ رہا ہو کہ وہ مجھ سے خفا تھی۔

"ابا میاں! اس خوشی میں ایک شاندار سی دعوت ہونی چاہیے۔ کچھ زبردست سا ہلہ گلا۔" میں خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"بالکل ہونا چاہیے، ڈرائیور کے ساتھ جاؤ اور جو جو چیزیں تمہیں اچھی لگیں، لے آؤ۔ یہ دعوت میری طرف سے ہے۔"

انہوں نے نوٹوں سے بھرا اپنا پورا والٹ ودیعہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ ان سے والٹ لے کر کمرے سے چلی گئی تھی جبکہ میں ابا میاں کے

کینے پر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''تمہاری عمر میں تو میں بھی صاحب کتاب نہیں ہوا تھا۔ تم بہت آگے جاؤ گے انشاء اللہ۔''

''ابامیاں جیسا علمی اور ادبی ماحول آپ نے مجھے فراہم کیا، اس میں پھر مجھے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میری تربیت آپ نے کی ہے، میں جو کچھ ہوں صرف آپ کی وجہ سے۔''

''اپنی محنت کا کریڈٹ مجھے دے رہے ہو؟'' وہ مسکرائے۔ انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

کچھ دیر وہ مجھ سے میرے ناول پر بات کرتے رہے۔ میں نے ناول کس موضوع پر لکھا اور کب لکھا وغیرہ۔ پھر بات کرتے کرتے، انہوں نے اچانک ایک عجیب وغریب سوال مجھ سے کیا۔

''ودیعہ تم سے ناراض ہے۔'' تمہیں معلوم ہے یہ بات؟'' میں ہونق نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگا۔

''میری پوتی میں کیا برائی ہے عمر! جو تم اس سے شادی نہیں کر سکتے؟''

میں ہکا بکا انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ابامیاں! آپ؟'' میں کچھ بول ہی نہیں پا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جو میں سمجھ رہا ہوں وہ یا کچھ اور۔

''اس وقت میں تمہارا ابامیاں نہیں ہوں اور نہ تم میرے بیٹے ہو۔ اس وقت میں صرف ودیعہ کا دادا ہوں اور ودیعہ کے دادا ہی کی حیثیت سے میں یہ سوال تم سے کر رہا ہوں کہ تم اس سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتے؟ میری پوتی میں کس چیز کی کمی ہے؟ وہ کل رات میرے پاس آ کر اتنا روئی اور کوئی میری پوتی کو رلائے، یہ میں کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ غصے بھری نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے اور میں حیران پریشان اور ساکت بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ ودیعہ ابامیاں کے پاس پہنچ گئی، وہ کل رات لان میں ابامیاں سے یہ بات کر رہی تھی؟

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا برخوردار؟'' انہوں نے بارعب لہجے میں مجھے پھر مخاطب کیا۔ یہ ودیعہ نے مجھے کس جگہ پر لا کھڑا کر دیا تھا۔ میں ابامیاں کے روبرو انہیں کی پوتی سے محبت کا اقرار کس طرح کر پاؤں گا۔

''میں جواب کا انتظار کر رہا ہوں عمر؟''

اب کی بار مجھے ایسا لگا جیسے وہ واقعی غصے میں آ رہے ہیں۔ انہیں غصے میں آتا دیکھ کر میں چپ نہیں رہ پایا۔ ''کمی ودیعہ میں نہیں، مجھ میں ہے ابامیاں! ایسی کمی جو ساری زندگی کوشش کروں تب بھی پوری نہیں کر سکتا۔ میری پیدائش، میری ذات، میرا وجود، میری شناخت سب ایک سوالیہ نشان ہیں، میں اتنی بڑی جرأت کس طرح کر سکتا ہوں۔''

میری نظریں بالکل جھکی ہوئی تھیں۔

''تم میں کس چیز کی کمی نہیں ہے میری جان! تمہاری شناخت وہ ہے جیسے تم دکھتے ہو، جیسا تم کرتے ہو جیسا تم سوچتے ہو۔ خاندان، قبیلہ،

نام و نصب کیا یہ انسان کے کیریکٹر سرٹیفکیٹ ہوتے ہیں؟ تم اپنے بچپن سے ہمارے ساتھ ہو، ہماری آنکھوں کے سامنے پل کر بڑے ہوئے ہو، کیا ہم تمہیں جانتے نہیں؟ تمہارے کردار اور اخلاق کی صرف میں کیا کمال اور نائلہ تک برملا تعریف کرتے ہیں۔ میری نگاہوں میں کوئی اونچے نام و منصب والا بھی تمہاری برابری نہیں کر سکتا۔ جو تم ہو، وہ میں بھی جانتا ہوں اور باقی سب جانتے ہیں۔"

جو لفظ میں سن رہا تھا، وہ میں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچے تھے، کبھی خواب میں بھی نہیں سنے تھے۔ ان کے لفظ مجھے معتبر کر رہے تھے، مجھے میری ہی نگاہوں میں عزت و توقیر دلا رہے تھے۔ میں بے اختیار ان کے سینے سے لگ گیا، بالکل چھوٹے بچوں کی طرح۔ کبھی اپنا یہ دکھ، اپنی زندگی کی یہ کمی ان سے شیئر نہ کی تھی اور آج جب کی تو انہوں نے ایک پل میں مجھے بہت باعزت اور بہت معزز قرار دے دیا تھا۔

"ودیعہ! مجھے اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہے اور اپنی جان میں صرف اسی کو سونپ سکتا ہوں جس پر مجھے بھروسہ و اعتماد ہو اور عمر تم سے بڑھ کر میں کسی پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ ہر برے خیال اور منفی سوچ کو اپنے دل و دماغ سے نکال دو۔ ودیعہ کی شادی اگر کسی کے ساتھ میں اپنی پوری خوشی اور بھرپور آمادگی کے ساتھ کروں گا تو وہ صرف تم ہو گے عمر!"

وہ آج حقیقی معنوں میں مجھے زمین کی پستیوں سے نکال کر اپنے برابر لے آئے تھے۔ رونا بزدلی اور کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے مگر اس پل میں ان کے سینے سے لگا آنسو بہانے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے "حال" سے غیر مطمئن ہونے اور "شکر" کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

میں ایک خواب دیکھ رہا تھا، ایک حسین ترین خواب، میں ایک خواب ہی جی رہا تھا اور دل کی آرزو یہ تھی کہ یہ خواب کبھی نہ ٹوٹے۔ میرے جانے سے ایک دن پہلے میری اور ودیعہ کی منگنی ہو رہی تھی۔ ایک ان ہونی تھی جو میرے ساتھ ہو رہی تھی۔ اپنی خوش قسمتی پر مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔

انکل اور آنٹی دونوں کو اس رشتے پر کافی اعتراض تھے اور یہ بات مجھے خود ابا میاں نے کل رات بتائی تھی مگر وہ اعتراض یہ ہرگز نہیں تھے کہ میرے ماں باپ کا کوئی اتا پتا نہیں، میرے خاندان کا کچھ پتا نہیں، میں ابا میاں کی خیرات پر ان ہی کے گھر میں پلا ہوں بلکہ اس لیے کہ میرے مد مقابل جو انتخاب ان کے لیے موجود تھا، وہ ترقی اور کامیابی کے مدارج میں مجھ سے کہیں آگے تھا۔ میری کتاب لندن سے پبلش ہونے والی تھی، ابھی ہوئی نہیں تھی۔ میں ایک اچھے تعلیمی ادارے سے MFA کرنے جا رہا تھا، ابھی کیا نہیں تھا۔ کوئی معقول ملازمت مجھے تعلیم مکمل کرنے کے بعد مل جانی تھی، ابھی ملی نہیں تھی جبکہ میرا مقابل ایک قابل ڈاکٹر بن چکا تھا، وہ ایک اچھی ملازمت کر رہا تھا۔

''میں نے کمال اور نائلہ سے کہہ دیا کہ دیا کو میں نے پالا ہے، لہٰذا اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق سب سے زیادہ مجھے ہے۔ اب یہ ذمہ داری تمہاری ہے عمر کہ تم خود کو آئندہ چند سالوں میں اس قابل بنا لو کہ ودیعہ کو تم سے بیاہتے وقت وہ دونوں بھی اتنے ہی خوش اور مطمئن ہوں جتنا کہ آج میں ہوں۔ ان کے لحاظ سے سوچو تو وہ دونوں بہت غلط بھی نہیں۔ ہر والدین کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کے لیے سب کچھ بہت اچھا چاہتے ہیں، تم خود کو ایسا بنا لو کہ وہ دیا کے مستقبل کی طرف سے بے فکر ہو کر اس کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے دیں۔''

میں نے ابا میاں سے وعدہ کیا تھا کہ میں لندن سے خود کو کسی قابل بنا کر ہی لوٹوں گا اور ان کے بھروسے کو کبھی ٹوٹنے نہیں دوں گا جس بات کو میں اتنا بڑا سمجھتا تھا جس وجہ سے میں ودیعہ کے خواب دیکھتے ڈرتا تھا، وہ ابا میاں کے لیے اس قدر اہم تھی ہی نہیں۔ وہ مجھے میرے کردار سے پرکھ رہے تھے، میرے خاندان سے نہیں۔

میں جانتا تھا کہ انکل اور آنٹی بھی مجھے میرے کردار اور اخلاق کے حوالے سے پسند کرتے تھے۔ پچھلے کچھ عرصہ سے انکل مجھے اہمیت بھی دینے لگے تھے اور مجھ سے اکثر بیٹھ کر باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔ میں نے جس طرح اسکول کے آخری دور میں اپنی پڑھائی کا خرچا خود اٹھایا اور پھر آگے کے تعلیمی اخراجات خود اپنے بل بوتے پر پورے کیے تو انکل کو میری یہ خودداری بہت پسند آئی تھی اور پھر اب جب میں خود اپنے پیسوں سے لندن پڑھنے جا رہا تھا تو وہ مجھے ایک محنتی اور پرعزم نوجوان کی حیثیت سے بہت پسند کرنے لگے تھے مگر وہ پسندیدگی کسی اور حیثیت میں تھی، ان کے داماد کی حیثیت سے ظاہر ہے میں اس معیار پر پورا نہیں اترتا تھا جو انہوں نے اپنے ہونے والے داماد کے لیے طے کر رکھا تھا۔ وہ دونوں ابا میاں کی وجہ سے اس رشتے کے لیے مانے تھے۔ ابا میاں نے اس گھر کے سربراہ کی حیثیت سے اپنا یہ فیصلہ ان سے حکمیہ انداز میں منوایا تھا۔ منوانے جانے اور مان لینے میں خاصا فرق ہوتا ہے۔ خوشی مجھ سے کسی طرح سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔ میری زندگی میں اچانک ایک بہت بڑی خوشی آگئی تھی، اتنی بڑی کہ اسے رکھنے کے لیے میرے دل میں جگہ کم پڑ رہی تھی۔ خوشی سے پاگل ہوتا میں تو کچھ سوچ سمجھ پا ہی نہیں رہا تھا، ابا میاں ہی نے مجھے یہ سمجھایا تھا کہ میں بازار سے جا کر ودیعہ کے لیے منگنی کا جوڑا اور ایک انگوٹھی خرید کر لے آؤں۔ وہ عمر اور رشتے میں مجھ سے اتنے بڑے تھے کہ میں اپنی بے تحاشا خوشی اور اپنا پاگل پن ان پر ظاہر ہوتا دیکھ کر بری طرح جھینپ بھی رہا تھا۔ ان کی شفقت آمیز، محظوظ سی مسکراہٹ مجھے یہ احساس دلا رہی تھی کہ جسے میں اور

ودیعہ ایک راز کی طرح اپنے اپنے سینوں میں چھپائے بیٹھے رہے تھے۔ وہ بات ابا میاں کے لیے کبھی راز تھی ہی نہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا ہیں یہ وہ بہت پہلے سے جانتے تھے۔ ہم بچے تھے جو انہیں انجان سمجھتے تھے۔ انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ ان کا تجربہ، مشاہدہ اور انسانوں کو پڑھ لینے کی صلاحیت ہم سے کہیں زیادہ تھی۔

ودیعہ نجانے کہاں چھپ کر بیٹھی تھی کہ منگنی کی رسم سے قبل مجھے اس کی ایک جھلک تک نظر نہیں آئی تھی۔ رسم کے لیے اسے میرے برابر لا کر بٹھایا گیا تو میں نے اپنے قدم زمین پر نہیں آسمانوں پر پڑتے دیکھے۔ آسمانی لباس میں وہ آسمان کی کوئی حور ہی لگ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر سجا ننھا سا ٹیکا، اس کے بالوں کے گجرے، کلائیوں میں پڑی کانچ کی خوب صورت چوڑیاں۔ یہ روپ صرف میرے لیے تھا، یہ بجنا سنورنا صرف میری خاطر تھا۔

پہلی بار اس استحقاق سے دیکھنے کا احساس کیسا تھا۔ بہت حسین، بہت دلفریب، بہت خوب صورت۔ بس ایسا کہ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ جو خوشی میرے چہرے پر تھی، وہی اس کے چہرے پر بھی تھی۔ لبوں پر حیا آمیز تبسم لیے وہ اپنی خوشی سب سے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اور میں اس کے چہرے پر نمایاں ہوتے ڈمپلز کو چوری چوری دیکھ رہا تھا۔

ابا میاں نے تقریب کا بہت شاندار اور پروقار اہتمام کیا تھا۔ جلدی جلدی ایک دو دن میں تیاری کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے قریب ترین ہر فرد کو تقریب میں مدعو کیا تھا۔ میری فلائٹ صبح ساڑھے تین بجے کی تھی اور ظاہر ہے ائیر پورٹ روانگی کے لیے مجھے اس وقت سے کافی پہلے ہی گھر سے نکلنا تھا۔

یوں جب رات گیارہ ساڑھے گیارہ کے بیچ تمام مہمان رخصت ہو چکے تو میں ودیعہ کے کمرے میں آ گیا۔ وہ ابھی اسی آسمانی لباس میں تھی، یونہی سجی سنوری، میرے نام کی انگوٹھی اپنی مخروطی انگلی میں سجائے۔

مجھے دیکھ کر وہ کچھ کہے بغیر اٹھ کر میرے ساتھ لان میں آ گئی۔ میرے جانے سے پہلے یہ تھوڑے سے پل تھے جو ہم دونوں ساتھ بتانا چاہتے تھے۔ میں اپنے ساتھ ایک اتنا خوب صورت احساس ساتھ لیے اس دور دیس جا رہا تھا کہ اس سے دوری کا ہلکا بھی دکھ دل میں نہیں تھا۔ یہ دوری ہمیں اور قریب کرنے کے لیے تھی۔

"میں تم سے بہت ناراض ہوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہاری بزدلی کے لیے میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے۔ آج تم اتنی دور چلے جانے والے ہو صرف اس لیے اپنی ناراضگی بھلا کر تم سے بات کر رہی ہوں۔" وہ اس سجے سنورے روپ میں خفا ہوتی اور پیاری لگ رہی تھی۔

"دیا! تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔" اپنی بزدلی اور کم ہمتی کو میں قبول کرتا تھا مگر اس وقت یہ باتیں نہیں۔

"اس میں نئی بات کیا ہے؟ یہ جملہ تو آج سب نے مجھ سے کہا ہے۔" اس نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"سب نے اس طرح نہیں کہا ہوگا جس طرح میں کہہ رہا ہوں۔ سب نے ان نگاہوں سے دیکھ کر نہیں کہا ہوگا جن سے میں دیکھ رہا ہوں۔ تم اگر خود کو میری نگاہوں سے دیکھو تو تمہیں پتا چلے کہ تم سے زیادہ خوب صورت اس ساری دنیا میں کوئی نہیں۔"

حیا کے رنگ ایک پل میں اس کے چہرے پر بکھرے تھے۔ میری نگاہوں سے کنفیوز ہوتی، مجھ سے نظریں چراتی وہ ہمیشہ سے بڑھ کر حسین

لگ رہی تھی۔ میں مسکراتا ہوا پہلی بار اسے خود سے شرماتا دیکھ رہا تھا۔

''دیا! میں آج بہت خوش ہوں۔ اتنا خوش کہ تمہیں بتا نہیں سکتا۔ زندگی میں پہلی بار خواب دیکھتے ڈر نہیں لگ رہا۔ میں نے آج اور ابھی سے اس گھر کے خواب دیکھنے شروع کر دیے ہیں دیا! جسے ہم دونوں مل کر سجائیں گے۔ ہمارا وہ پیارا سا گھر جہاں ہم دونوں ہوں گے اور وہاں ہر طرف بس محبتیں ہی محبتیں ہوں گی، چاہتیں ہی چاہتیں ہوں گی۔ میں زندگی میں تمہارے ساتھ اور تمہاری محبت کے سوا اور کچھ نہیں چاہتا۔'' میں نے اپنے ہاتھ آہستگی سے اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے تھے۔ میرے تصور میں ایک محبت بھرا گھر، ایک خوب صورت آشیانہ اپنے خدوخال واضح کر رہا تھا۔ ''عمر! ہم اس خوشی میں تمہارے ناول کی خوشی کو تو بھول ہی گئے۔ تمہاری پہلی کتاب پبلش ہونے جا رہی ہے، تم کتنے خوش ہو عمر؟''

اسے بھی یہی احساس گھیرے ہوئے تھا کہ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے، تب ہی میرے ساتھ مل کر ہمارے گھر کا خواب دیکھتی اس کی آنکھوں نے تھوڑی ہی دیر بعد میری کتاب کو تصور میں لانا شروع کر دیا۔ میری کتاب کا ذکر کرتے ہی اس کے چہرے پر خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئی تھیں۔

''تم کتنی خوش ہو دیا؟'' میں نے جواب دینے کے بجائے یہ سوال اسی سے کر لیا۔

''میں بہت خوش ہوں عمر! اور جس روز تمہارا ناول پبلش ہو جائے گا جس روز وہ مجھے بڑی بڑی بک شاپس میں رکھا نظر آئے گا۔ شاید میں اسی روز خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔ پتا ہے عمر! جس روز اسکول میگزین میں پہلی مرتبہ تمہاری کہانی چھپی تھی، میں کتنی خوش ہوئی تھی۔ تب تم نے غصہ کر کے میری خوشی کو کم کروا دیا تھا، ورنہ میں اتنی خوش تھی کہ.....''

''دیا! تم اس وقت بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں نا؟'' میں نے اس کی بات درمیان سے کاٹی۔ اس سوال پر اس نے مجھے ناراضگی سے گھورا۔

''خود سے محبت کا اظہار ہوتا نہیں ہے اور ایک لڑکی سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ببانگ دہل اپنی محبت کا اعلان کرے۔''

''میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں دیا! ہمیشہ سے، شروع سے۔''

''بہت شکریہ، بڑی نوازش۔'' اس کے چڑچڑے جواب پر میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

''تم اپنی کتاب کس کے نام کرو گے؟''

''ابھی سوچا نہیں۔ دیکھو شاید اپنے اساتذہ کے نام کر دوں، شاید دوستوں کے اور ایک سوچ یہ بھی ہے کہ اسے اپنے پڑھنے والوں کے نام کر دوں۔'' میں مسکراہٹ اپنے لبوں پر روکتا بڑی بھرپور سنجیدگی سے بولا۔ اب اسے چڑانے کی باری میری تھی جو وہ سننا چاہتی تھی، وہ میں بولا نہیں تھا۔

''کیا ودیعہ کمال کے علاوہ تم کسی اور کے نام اپنی کتاب کر سکتے ہو۔'' اس کی خفگی بھری نگاہوں نے مجھ سے پوچھا تھا۔

''میں اپنی کتاب محبت کے نام کروں گا، ودیعہ کمال کے نام کروں گا۔ میرے لیے محبت تم ہو، محبت کی تفسیر تم ہو۔ میری زندگی میں محبت کے تمام رنگ صرف تم سے ہیں اور میں اپنی ہر کتاب محبت کے نام کروں گا، ودیعہ کمال کے نام کروں گا۔ لوگوں کے پاس اپنے لکھنے کی بہت ساری وجوہات ہوتی ہوں گی، میرے پاس صرف ایک وجہ ہے۔ ودیعہ کمال..... میں صرف تمہارے لیے لکھتا ہوں دیا! میرے دل سے نکلا ہر لفظ صرف تمہارے لیے ہوتا ہے۔ اگر تم مجھ سے کھو جاؤ تو میرے پاس سے سب لفظ کھو جائیں گے۔''

اس وقت اسے چھیڑنے کو جو کچھ بھی کہتا رہا ہوں مگر اس سے رخصت ہوتے پل میں نے گمبھیر سنجیدگی سے اسے اپنے دل کی بات پوری سچائی کے ساتھ بتائی تھی۔ میری بات سن کر وہ مسکرائی تھی۔ محبتوں کا مان اور فخر پالینے والی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھری تھی اور اس مسکراتے چہرے کو اپنی نگاہوں میں بسائے میں ایک نئی دنیا کی طرف عازم سفر ہوا تھا۔

☆☆☆

اس اجنبی دیس میں وہ لڑکی نہیں تھی اور اس کے بغیر رہنے کی مجھے عادت نہیں تھی، سو مشکل تو ہوئی تھی۔ اسے دیکھے بغیر، اس سے باتیں کیے بغیر کبھی میری زندگی کا ایک دن نہیں گزرا تھا اور یہاں مہینوں ہوگئے تھے اسے دیکھے ہوئے۔ اس ترقی یافتہ ملک میں، اس جگمگاتی ہنگامہ خیز اور پر رونق سرزمین میں میرے دل کی رونقیں ماند پڑی ہوئی تھیں۔ مصروفیت ان دنوں بے تحاشا تھی، اس لیے دل سے ملاقات ذرا کم کم ہی ہوتی تھی مگر جب بھی اس سے باتیں کرنے کا موقع ملتا وہ یہی کہتا۔

''یار! یہاں جی نہیں لگتا۔ چلو اسی نگر میں چلتے ہیں، وہیں جہاں زندگی ہے، محبت ہے، خوشی ہے۔ چلو اسی کے پاس چلتے ہیں جس کے دم سے زندگی میں تمام رونقیں ہیں۔'' دل کو بہلانا تھا تو مشکل مگر میں اسے آنے والے دنوں کے خوش کن اور خوب صورت خواب دکھا کر بہلا لیا کرتا تھا۔

مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ کب صبح ہوئی اور کب رات مجھے پتا نہیں چلتا تھا۔ صبح اپنے کالج چلا جاتا اور اس کے بعد اس سپر اسٹور میں جہاں میں ملازمت کر رہا تھا اور اس کے بعد چوبیس گھنٹے کھلنے والے ایک اور اسٹور میں جہاں رات میں چند گھنٹے نوکری کرنے کے مجھے دن کی نوکری سے زیادہ پیسے مل جاتے تھے۔ ایک سستے سے علاقے میں جہاں زیادہ تر پاکستانی، انڈینز، بنگلہ دیشی اور سری لنکنز وغیرہ رہائش پذیر تھے۔ میں وہاں دو انڈینز اور ایک بنگالی لڑکے کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ نجانے کون سی صدی کی بنی وہ خستہ حال عمارت تھی، وہاں لفٹ سے لے کر دیگر بنیادی سہولیات موجود تو تھیں مگر انتہائی خراب حالوں میں۔

ساتویں منزل پر ہمارا اپارٹمنٹ تھا اور ہمیں لفٹ کے خراب ہونے پر زیادہ سیڑھیوں ہی کے ذریعے چڑھنا، اترنا پڑتا تھا۔ یہاں تکلیفیں زیادہ تھیں، جب ہی تو کرایہ بھی بہت ہی کم تھا۔ اس بلڈنگ کے ہندو مالک کا کاروبار ہم ہی جیسے غریب اور دیسی طالب علموں کے ذریعے چل رہا تھا۔ ساتویں منزل تک پہنچتے پہنچتے جب میری ٹانگیں جواب دینے لگتیں تو میں خود پر لعنت بھیجتا۔ اس جوانی میں یہ حال ہے؟ اگر یونہی ذرا ذرا سی چیزوں سے تھکنے لگا تو ابا میاں سے کیا وعدہ کیسے نبھاؤں گا؟ ودیعہ کے لیے آسائشیں کیسے جمع کروں گا۔ ایک گھر، ایک گاڑی چند آسائشیں، اتنا تو مجھے اس کے لیے کرنا ہی تھا۔ وہ ہمیشہ اچھے گھر میں رہی ہے، بہترین گاڑیوں میں بیٹھی ہے، قیمتی لباس پہنا ہے۔ میں اسے ان آسائشوں سے تو ہرگز محروم نہیں رکھوں گا جن کی اسے عادت ہے، مجھ سے محبت کی پاداش میں اسے اپنا معیار زندگی تو نہیں کھونا چاہیے۔

کالج کا حال کچھ یوں تھا کہ وہاں چند ہی ہفتوں میں، میں اپنے اساتذہ کی نگاہوں میں آ گیا تھا۔ وہاں کئی ساتھی طالب علموں میں تو نسلی تعصب ضرور تھا مگر اساتذہ میں سے کسی میں نہیں۔ تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ہم طالب علموں کے ساتھ بعض برطانوی اور دیگر یورپی ممالک کے لڑکے، لڑکیاں کبھی نامناسب رویہ اختیار کر بھی جاتے مگر اساتذہ کا رویہ ہر ایک کے ساتھ اچھا تھا جس میں صلاحیت ہے، ذہانت ہے، وہ استاد کی

نگاہوں میں عزت پا جائے گا۔ میرے شروع ہی کے کچھ رائٹنگ اسائمنٹس نے کئی پروفیسرز کو چونکا دیا تھا۔

''تم یہاں کیا سیکھنے آئے ہو عمر حسن؟ تم تو پہلے ہی سب کا سب پڑھے پڑھائے ہوئے معلوم ہو رہے ہو۔ میں تمہیں کری ایٹو رائٹنگ کے متعلق کیا سکھاؤں؟ تم تو پہلے ہی سب جانتے ہو۔''

میرے ایک پروفیسر ڈاکٹر ایڈم رابرٹس نے یہ تبصرہ میرے ایک ابتدائی رائٹنگ اسائمنٹ کو دیکھنے کے بعد کیا تھا۔ وہ بُکر پرائز یافتہ ایک نامور مصنف تھے اور ان کی تعریف و توصیف یقیناً میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے، زبان و بیان میں بہتری لانے اور تکنیکی اعتبار سے وہ سب جو کری ایٹو رائٹنگ کے مسلمہ اصولوں کے حوالے سے میرے علم میں نہیں، یہاں سیکھنے آیا تھا اور وہ کہتے تھے مجھے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ شاید وجہ کچھ یوں تھی کہ اللہ نے کری ایٹو رائٹنگ میرے...... خمیر میں شامل کر کے مجھے اس دنیا میں بھیجا تھا اور اپنی اس خداداد صلاحیت کو میں بہت کم عمری ہی سے بہترین کتابوں اور بہترین ادب کے مسلسل مطالعہ کے سبب پہلے ہی نکھار اور سنوار چکا تھا۔

انگریزی ادب، امریکی ادب، فرانسیسی ادب، روسی ادب، جرمن ادب کون سا ادب ایسا تھا جس پر کسی سیمینار یا ورک شاپ میں بات ہوتی اور میں اس کے متعلق کچھ بولنے یا لکھنے میں دقت محسوس کرتا۔ تواتر سے منعقد ہونے والے یہ سیمینارز اور ورک شاپس ہماری پڑھائی کا حصہ تھے اور ان میں نامور ادیبوں، شاعروں اور اہل قلم کو مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ ہم کری ایٹو رائٹنگ کے طالب علموں کو اپنی اپنی تخلیقات کے کچھ حصے پڑھ کر سناتے، ہم سے اس حوالے سے تفصیلی گفتگو کرتے۔ اکثر وہ ہمیں کتابوں کی پبلشنگ اور پبلشنگ کی دنیا کے اصول و ضوابط بھی سمجھاتے۔ ایک پبلشڈ رائٹر بننا یہاں...... ہر طالب علم کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ جس چیز کی انہیں شدید خواہش تھی مجھے وہ خوشی اللہ نے ڈگری کے حصول سے پہلے ہی عطا کر دی تھی۔ میرا پہلا ناول بہت جلد شائع ہو جانے والا ہے۔ میں نے یہ بات اپنے اساتذہ اور ساتھی طالب علموں میں سے کسی کو بھی نہیں بتائی تھی۔

☆☆☆

''آپ کی دوست ودیعہ کمال کیسی ہیں؟'' میں اپنا کنٹریکٹ سائن کرنے ''JBM'' کے دفتر گیا تو وہاں ابتدائی رسمی خیر و عافیت کے بعد جان بلہم نے مجھ سے ودیعہ کے متعلق پوچھا۔

''ٹھیک ہے، ماسٹرز کر رہی ہے، انگلش لٹریچر میں۔''

''آپ دونوں منگنی کب کر رہے ہیں؟'' اس کا اگلا سوال خاص حیران کرنے والا تھا۔

''ہماری منگنی ہو گئی ہے لیکن آپ کو یہ اندازہ کیسے ہوا کہ......''

وہ میرے سوال پر مسکرایا۔ ''آپ دونوں جب مجھے ملے تو اسی لیے اچھے لگے تھے۔ ایک طویل عرصہ بعد میں نے کتابوں میں پڑھی جانے والی محبت حقیقت میں کہیں دیکھی تھی۔ تب ہی تو اتنے عرصہ میں بھی میں آپ دونوں کو بھول نہیں پایا۔''

ہماری محبت کیا اتنی آسانی سے ہر ایک پر ظاہر ہو جاتی تھی یا وہ بندہ ہی ضرورت سے زیادہ ذہین تھا، میں فیصلہ نہ کر پایا۔ اس روز جان بلہم اور وہاں کی سینئر ایڈیٹر الزبتھ اولیور نے میرے ناول کی کافی تعریف کی تھی۔ ان کا پبلشنگ ہاؤس لندن کے بہت بڑے اور نمایاں ترین پبلشنگ ہاؤسز

میں ہرگز شامل نہیں تھا۔انہیں اس بزنس میں آئے ابھی صرف دو سال ہوئے تھے۔اس سے قبل جان بکہم اور اس کی پوری ٹیم مختلف اشاعتی اداروں سے وابستہ تھے۔ نئے ہونے کی وجہ ہی سے وہ باصلاحیت مگر نئے اور غیر معروف رائٹرز کو موقع دے دیا کرتے تھے۔

جان بکہم ،الزبتھ اولیور اور فینسی اسمتھ جو وہاں کاپی ایڈیٹر تھی، اس بات پر مطمئن تھے کہ ان کے ہاں سے شائع ہونے والی کتابیں معیاری ہوتی ہیں۔ناقدین، کتابوں کے تقسیم کار اور کتابیں خریدنے والوں اور بکسیلر......کی نگاہوں میں قابل قدر توجہ بھی پا جاتی تھی۔

کتاب کی اشاعت کے اس درمیانی وقفہ میں میرا زیادہ تر رابطہ و تعلق الزبتھ اولیور کے ساتھ رہتا تھا اور اس پہلی ملاقات میں ہی میرا اس کے ساتھ وہ پروفیشنل تعلق قائم ہو گیا تھا جو ایک لکھاری اور ایک ایڈیٹر کے درمیان ہوتا ہے۔

☆☆☆

''تم اپنا دوسرا ناول کب شروع کر رہے ہو؟''

ودیعہ کے خطوط میں بھی اور فون پر بھی یہی سوال ہر بار ہوتا تھا۔اپنے دوسرے ناول کی کہانی کافی پہلے جب میں پہلا ناول مکمل بھی نہیں کر پایا تھا، تب میں نے ودیعہ سے ڈسکس کی تھی۔پوری کہانی، کردار، واقعات ایک ایک چیز پوری تفصیل کے ساتھ میں نے اسے بتائی تھی۔اسے ہمیشہ کی طرح میری کہانی بہت پسند آئی تھی اور اس نے یہ کہا تھا کہ میں اگلا ناول اسی موضوع پر لکھوں پھر یہ ودیعہ کا پیہم اصرار ہی تھا کہ میں نے لندن آنے کے دوسرے ہی مہینے میں جب ابھی میں خود کو نئی جگہ، نئے ماحول اور نئے لوگوں میں ایڈجسٹ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا، اپنا دوسرا ناول لکھنا شروع کر دیا۔

وقت کی پہلے ناول کی طرح اس بار بھی میرے پاس شدید قلت تھی۔راتوں میں جاگ کر، صبح منہ اندھیرے اٹھ کر، ٹرینوں، بسوں میں سفر کرتے، کالج میں فراغت کے اوقات میں، یعنی یہ کہ میں خالی مل جانے والے ہر وقت کو لکھنے میں صرف کرتا۔

''تم میرے لیے لکھو۔'' یہ ایک جملہ میرے کانوں میں ہمہ وقت گونجتا اور میں کبھی بھی، کہیں بھی اور کسی بھی وقت لکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔لکھنے میں تو پہلا ناول بھی مجھے بہت مزا آیا تھا۔اپنے لکھنے کو بے تحاشا تھکنے کے باوجود میں نے خوب بہت انجوائے کیا تھا۔جو لکھنا چاہتا تھا، وہ لکھ کر سکون اور اطمینان پایا تھا مگر پہلی بار اور اب کی بار میں فرق یہ تھا کہ پہلی بار خوشی، سکون اور اطمینان کے باوجود مجھے یہ یقین نہیں تھا کہ جو میں لکھ رہا ہوں، وہ پبلش ہونے کے لائق ہے بھی یا نہیں جبکہ اب کی بار صورت حال بالکل مختلف تھی۔

اب مجھے اپنے لکھے پر اعتماد تھا۔میں جانتا تھا جو میں لکھ رہا ہوں، وہ پبلش ہو کر میرا دوسرا ناول کہلائے گا۔اعتماد بڑھا تھا تو کام کا معیار بھی پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا تھا۔

''یہ ناول میرے پہلے ناول سے بھی زیادہ اچھا ہوگا۔'' وہ ودیعہ کی رائے تھی۔

☆☆☆

مجھے لندن آ کر ودیعہ بہت یاد آئے گی، ابا میاں بہت یاد آئیں گے۔ یہ تو میں لندن آنے سے پہلے ہی سے جانتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ ان دو لوگوں کے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں جنہیں میں بہت زیادہ یاد کروں گا۔ بوا جی، انکل، آنٹی...... میں ان لوگوں کو بے تحاشا مس کر رہا تھا۔ گھر فون پر بات ہوتی تو بوا جی کو تو خود بلوا لیا کرتا مگر آنٹی، انکل کو ہمارے بیچ ہمیشہ سے موجود دوری کے سبب جھجک کر بلا تو نہ پاتا مگر دل ہی دل میں دعا ضرور کرتا۔

''بہت دن ہو گئے آنٹی کی آواز نہیں سنی۔ کاش آج کال وہ ریسیو کریں!''

''انکل کو خواب میں دیکھا ہے، دل پریشان ہو رہا ہے، گھر فون کر لیتا ہوں۔ اگر انہوں نے فون نہیں بھی اٹھایا تو دیا یا ابا میاں سے ان کی خیریت پوچھ لوں گا۔''

ابا میاں سے لے کر اس گھر کے ملازمین تک یہاں تک کہ اس گھر کے در و دیوار، کمرے، دالان میں ایک ایک چیز کو یاد کرتا۔ ان سب سے دور آ کر پتا چل رہا تھا کہ سب میرے کتنے زیادہ اپنے ہیں۔ میرے دل کے کتنے نزدیک ہیں اور ان کی دوری سہنا بہت مشکل کام ہے۔

ودیعہ یا ابا میاں کا میرے نام خط آتا اور میرے اپارٹمنٹ کے ساتھیوں میں سے کوئی وہ خط میرے ہاتھ میں پکڑاتا ہوا یوں کہتا۔

''عمر! تمہارے گھر سے خط آیا ہے۔'' تو گھر کا لفظ سنتے ہی دل سرشار سا ہو جاتا۔

فخر سے مسکراتا میں وہ لفافہ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے فوراً لے لیتا۔ ہاں وہاں دور اس دیس میں میرا ایک گھر ہے، میرا اپنا ایک کنبہ ہے، میری واپسی کے منتظر لوگ ہیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ ودیعہ سے دور ہوا تھا تو مجھ پر خود اپنے بارے میں حیرت انگیز اور عجیب و غریب انکشاف ہو رہا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی کے ساتھ رہتے رہتے آپ غیر محسوس انداز میں اسی جیسے ہو جائیں۔ سارے جہاں کا درد رکھنے والی اس کی جن عادتوں کو میں تنقید کا نشانہ بناتا تھا، وہ سب نہ جانے کب مجھ میں آ گئی تھیں۔ میں اس کے رنگ میں رنگ گیا تھا اور یہ بات مجھے اس سے دور آ کر پتا چل رہی تھی۔

اپنے کلاس فیلوز کو اپنے لیکچرز، اسائمنٹس دے دینا، کری ایٹو رائٹنگ، ایڈیٹنگ، پبلشنگ وغیرہ سے متعلق کورس ڈسکشن سیشنز میں ان کی مدد کر دینا، مفید مشورے دے دینا، ان کی تحریر میں تکنیکی اعتبار سے کیا کمی یا خرابی ہے اس سے آگاہ کر دینا اور اپنی ملازمت میں ساتھ کام کرنے والوں کا بے انتہا خیال کر لینا جس کی طبیعت خراب ہے یا کوئی اور مجبوری ہے، اس کی جگہ اس کی ڈیوٹی دے دینا۔

''مبارک ہو، دنیا میں ودیعہ کمال کے علاوہ ایک پاگل اور پیدا ہو گیا ہے۔'' میں نے خط میں اسے اپنی نئی نویلی عادت بتاتے ہوئے یہ جملہ لکھا تھا۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھے اور ودیعہ کو بے صبری سے انتظار تھا۔ میرے ہاتھوں میں میری کتاب تھی، میری پہلی کتاب۔ میں بے یقینی سے اپنے ہی لکھے لفظوں کو ایک کتاب میں معتبر ہوتا دیکھ رہا تھا۔ ایک بے نام و نشان لڑکے کو اللہ نے یہ عزت بخشی تھی اور وہ بھی اتنی کم عمری میں۔ کتنے رائٹرز ہیں جو تیئس سال کی عمر میں اپنی پہلی کتاب شائع کروا پاتے ہیں۔ میں اللہ کا جتنا شکر ادا کرتا کم تھا۔ اس کتاب کا خواب جس نے مجھ سے بھی پہلے دیکھا تھا جس نے یہ خواب میری آنکھوں میں سجایا تھا، وہ اس وقت مجھ سے بہت دور تھی اور میں اس کی کمی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ یہ

خوشی ہم دونوں کی خوشی تھی۔ ہمارا مشترکہ خواب ہماری مشترکہ خوشی۔

میری کتاب خود میرے اپنے ہاتھوں سے سب سے پہلے جسے پہنچی وہ وہی تھی۔ میں نے اسے اور ابا میاں کو اپنی کتاب کی کئی کاپیز فوراً بھجوائی تھیں۔

''سر! آپ نے تو کتاب بغیر دستخط کے بھیج دی۔ اب میں اپنی سہیلیوں کو کیسے یقین دلاؤں گی کہ یہ کتاب مصنف نے خود مجھے پیش کی ہے۔''

یہ میری کوئی شوخ و شریر چنچلی سی فین نہیں، وہ دیبہ کمال تھی اور میں اس کی شرارت پر قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔

''دیا! میں نے خوشی کے ان لمحوں میں سب سے زیادہ تمہاری کمی محسوس کی ہے۔ میں تمہیں بہت مس کر رہا ہوں دیا! کاش اس وقت تم میرے ساتھ ہوتیں۔ کاش اس خوشی کو ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور انداز میں سیلیبریٹ کر پاتے۔''

''کوئی بات نہیں عمر! تمہاری اگلی کتاب کی اشاعت کے وقت ضرور تمہارے ساتھ ہوں گی۔ تب ہم اپنی خوشی خوب دھوم دھام کے ساتھ مل کر منائیں گے۔ آج کی ساری کمی ہم تب پوری کریں گے۔'' اس نے مجھے زیادہ دیر اداس رہنے نہیں دیا تھا۔

''جب ہم ساتھ ہوں گے، جب ہم ساتھ رہیں گے۔'' یہ احساس اتنا دلنشیں تھا کہ میرا دل ایک دم ہی اداس ہونا بھول گیا۔

''عمر کتاب کتنی خوب صورت چھاپی ہے۔ جے بی ایم والوں نے۔ سرورق کتنا زبردست ہے۔ پیپر کی کوالٹی بھی کتنی عمدہ ہے اور تمہاری تصویر۔ شاندار، لاجواب۔ اتنے ہینڈسم لگ رہے ہو۔ بہت سی لڑکیاں صرف مصنف کی خوب صورتی سے متاثر ہو کر کتاب خرید لیں گی۔''

مجھ سے فون پر بات کرتی وہ ان لمحوں میں کتنی بے تحاشا خوش تھی، میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ مجھ سے فون پر باتیں کرتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ کتاب کے صفحے بھی پلٹتی جا رہی تھی۔ مختلف صفحوں پر سے مختلف جملے پڑھ کر۔

''یاد ہے عمر! یہ تم نے کب لکھا تھا۔''

''یاد ہے یہ جملہ پڑھ کر میں نے تم سے کیا کہا تھا۔'' جیسی باتیں کیے جا رہی تھی۔

''میں نے اللہ سے بہت دعائیں مانگی تھیں عمر! تمہاری کتاب کے لیے۔ تمہاری کتاب پبلش ہو اور اسے وہ شہرت اور پذیرائی ملے جس کی یہ حقدار ہے۔''

شہرت اور پذیرائی.....؟ میں دیا کی بات پر ہنسا۔ میں نے ایسے کوئی خواب نہیں دیکھے تھے۔ ایک نئے مصنف کو پہلی ہی کتاب سے شہرت تو پاکستان میں نہیں مل پاتی تو ایسے ملک میں جہاں سالانہ ایک لاکھ سے بھی اوپر کتابیں شائع ہوتی ہیں، جہاں ان گنت پبلشرز ہر ماہ کئی سو کتابیں شائع کرتے ہوں، جہاں کوئی بھی نئی کتاب بک اسٹورز کے نیو ٹائٹلز شیلف سے اگلے ہی ہفتے مزید کئی سو کتابوں کی آمد کے سبب پچھلے شیلف میں منتقل کر دی جاتی ہو، وہاں ایک نئے رائٹر کی کتاب کا نوٹس کیسے لیا جائے گا۔

آپ کی کتاب بہت اچھی ہے، ادب کا ایک شاہکار ہے۔ کلاسکس میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، یہ سب تو لوگ جب جانیں گے جب وہ آپ کی کتاب کو جانیں گے اور یہ سب اس ملک میں میڈیا کوریج کے بغیر ممکن نہیں۔ کسی بھی نئی کتاب کی پبلسٹی، ایڈورٹائزنگ اس کام میں

پبلشرز کے ہزاروں پاؤنڈز خرچ ہوتے ہیں۔ ایک نئے رائٹر کی کتاب شائع کر دی جائے۔ یہی بہت ہے۔ پبلشر اس کی ایڈورٹائزنگ اور پبلسٹی میں اپنا پیسہ داؤ پر نہیں لگاتے، چاہے وہ کتاب کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو۔ کسی بھی دوسرے بزنس کی طرح پبلشرز بھی اپنے کاروبار میں سب سے زیادہ اہمیت منافع کو دیتے ہیں۔ میرے لیے تو یہی بہت خوشی کی بات تھی کہ میری کتاب شائع ہوگئی ہے۔ کتاب کی اشاعت سے قبل مجھے میرے پبلشر کی طرف سے ایڈوانس مل گیا۔ آئندہ رائلٹی مل جایا کرے گی۔ چند لوگ مجھے رائٹر کی حیثیت سے جاننے لگے ہیں۔ اپنے کالج میں، میں ایک دم خاصا مشہور ہو گیا ہوں۔ ہمارے پروگرام ڈائریکٹر سے لے کر ہمارے شعبے کے تمام اساتذہ اور ساتھی طالب علم سب مجھے بہت اچھی طرح جاننے لگے ہیں۔ میں اس سب پر مطمئن تھا، خوش تھا۔ میری اس سے زیادہ کوئی توقعات تھیں ہی نہیں۔

مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اللہ نے میری اس کتاب کے ذریعے کس قدر شہرت اور مقبولیت میرے نصیب میں لکھ رکھی ہے۔ Forever بیسٹ سیلر بن جائے گی، ہارڈ کور پیپر بیک میں اس کی ہزاروں کی تعداد میں کاپیز دھڑا دھڑ فروخت ہوں گی۔ مختلف اخبارات میں میرا نام اور تصویر نمایاں طریقے سے جگہ پائیں گی۔ میں ایک سیلبریٹی کی حیثیت اختیار کر جاؤں گا، یہاں تک تو میرے خوابوں کی بھی رسائی نہ تھی۔

اور میرے ساتھ یہ سب خوابوں میں نہیں، حقیقت میں ہوا۔

اور اس خواب جیسی حقیقت کا آغاز اس روز ہوا جب گراہم جانسن جو ایک بڑے نام اور شہرت کا حامل نقاد تھا، سنڈے ٹائمز میں جس کے مختلف کتابوں پر ریویو باقاعدگی سے ہر ہفتہ شائع ہوتے تھے، جس کے قلم سے اپنی کتاب کی تعریف کیا صرف ذکر ہو جانا ہی مصنفین کے لیے بڑے اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی اور جس کی تعریف کسی نئے کیا مشہور اور نامور ادیبوں تک کا خواب ہوا کرتی تھی، اس نے اپنے ایک کالم میں میری کتاب کا ذکر کر دیا۔

اپنے اس کالم میں وہ میری کتاب پر نہیں بلکہ ایک مشہور انگلش رائٹر کے نئے ناول پر تبصرہ کر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اس تنقید و تبصرے میں اس نے میری کتاب کو بھی شامل کر ڈالا۔ جس ناول پر وہ تبصرہ کر رہا تھا، اتفاق سے وہ بھی دوسری جنگ عظیم کے پس منظر میں لکھا گیا تھا۔ اس ناول کے رائٹر نے اپنی ریسرچ بڑی محنت سے کی تھی۔ یقیناً اس ریسرچ میں بہت وقت بھی لگایا ہوگا۔ جنگی سازوسامان، جنگی ہتھیار، امریکہ، برطانیہ، روس، جرمنی، جاپان وغیرہ کس ملک کے پاس کتنے ہتھیار تھے، کس کس نوعیت کے ہتھیار تھے، کس ملک کی دفاعی صلاحیت کتنی تھی، کس کی معیشت اس وقت کس حالت میں تھی۔ اس نے جنگی تفصیلات، ایک ایک بات، چھوٹی سے چھوٹی چیز کے متعلق سو فیصد درست معلومات اکٹھی کر کے ناول لکھا تھا۔

مگر گراہم جانسن کو وہ ناول اتنی ساری تحقیق شدہ اور مستند معلومات کے باوجود پسند نہیں آیا تھا۔ اس کی رائے میں وہ ایک بہترین معلوماتی، علمی اور تحقیقی کتاب تو کہلا سکتی تھی مگر ایک اچھا ناول نہیں اور یہیں پر اس نے میری کتاب کا ذکر کیا تھا۔ چونکہ دونوں ناولز آگے پیچھے شائع ہوئے تھے اور دونوں کا موضوع ایک ہی تھا۔ کتابوں کے اس بے کراں سمندر میں گراہم جانسن نے میری کتاب کہاں دیکھ لی، میں نہیں جانتا اور اگر سرسری نظر کتاب پر پڑ بھی گئی تو اس کی کس بات سے متاثر ہو کر اسے پڑھ بھی ڈالا۔ مجھے نہیں معلوم مگر اپنے باقی کے آدھے کالم میں اس نے صرف میرے ناول کا ذکر کیا تھا۔

"جنگوں کے پس منظر میں لکھے جانے والے ناولز میں لوگ ہتھیاروں، جنگی سازوسامان، جنگی تیاریوں اور میدان جنگ کے متعلق اتنا

نہیں پڑھنا چاہتے ہیں جتنا یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس دور کے لوگ جوان ہی کی طرح کے انسان تھے، اس جنگ سے کس طرح متاثر ہوئے، وہ اس جنگی ماحول میں خوف و ہراس کے عالم میں کیا محسوس کرتے تھے، کیا سوچتے تھے۔ جنگ کی تباہ کاریاں کس طرح ان پر اثر انداز ہوئیں۔ جنگوں نے ان سے ان کا کیا کیا کچھ چھین لیا اور یہی عمر حسن کی خوبی ہے۔ وہ بموں، میزائلوں اور توپوں کی تفصیلات میں اتنا ہی گیا جتنا اس تفصیل میں کہ جن پر وہ گرائے گئے وہ کس کرب سے گزرے، انہوں نے کتنے دکھ اٹھائے، کتنے غم جھیلے، کس طرح اپنوں سے بچھڑے، محبت کرنے والوں کی جدائی کا دکھ کس طرح سہا، عمر حسن کے کردار زندہ انسان ہیں۔ چلتے پھرتے، ہماری آپ کی طرح سانس لیتے، ہنستے روتے، وہ ہماری طرح سوچتے ہیں، ہماری طرح محسوس کرتے ہیں۔ وہ فرضی ہونے کے باوجود ایک انسان کا تخیل ہونے کے باوجود فرضی اور تخیلاتی نہیں لگتے۔ وہ زندہ، جیتے جاگتے، انسان ہیں۔ ہمارے دل میں ان کے لیے محبت، نفرت، ہمدردی، دکھ، غصہ سارے جذبات اسی طرح پیدا ہوتے ہیں جس طرح اپنے گرد بستے انسانوں کے لیے۔ وہ روئیں گے تو پڑھنے والے کی آنکھیں بھی نم ہوں گی۔ وہ ہنسیں گے تو پڑھنے والے کی آنکھیں بھی مسکرائیں گی۔

عمر حسن انسانی نفسیات کا گہرا اور عمیق مشاہدہ رکھتا ہے۔ وہ لفظوں کو برتنے کا ہنر جانتا ہے۔ انگریزی حروف تہجی کے 26 لیٹرز کا سلیقے اور نزاکت کے ساتھ استعمال اسے خوب آتا ہے۔

میں ایک گنجان آباد علاقے کی قبل مسیح کے زمانے کی بلڈنگ کی ساتویں منزل پر واقع اپنے بے ترتیب و بے آرام و بے آسائش اپارٹمنٹ میں اتوار کی صبح تکیے پر سر گھسائے بے خبر سو رہا تھا۔ اس بات سے قطعاً لاعلم کہ باہر ایک مشہور آدمی میرے متعلق کیا لکھ چکا ہے۔ میری کتاب کا ذکر اس قلم نے کر دیا ہے کہ جو کتابوں کی کامیابی و ناکامی پر بڑی شدت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ باہر میرے لیے دنیا بدل رہی تھی اور میں اندر سو رہا تھا۔

اسٹور میں رات کی ڈیوٹی کر کے آیا تھا، اس لیے اب کچھ گھنٹوں کی نیند لے رہا تھا مگر صبح ہی صبح ڈاکٹر ایڈم رابرٹس نے فون کر کے مجھے جگا دیا تھا۔

''تم نے آج کا سنڈے ٹائمز دیکھا؟'' میں نیند میں ان کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ مجھے گراہم جانسن کے میرے طرز تحریر کی تعریف میں لکھے کچھ جملے سنا رہے تھے۔

میں عالم خواب سے یک دم ہی مکمل طور پر بیدار ہوا اور فوراً ہی بستر سے چھلانگ مارتا ہوا اٹھا۔

''خود جا کر خرید کر لاؤ اور پڑھو۔''

میں ڈاکٹر رابرٹس کے مشورے پر عمل کرتا، اپارٹمنٹ سے نکل ہی رہا تھا کہ آگے پیچھے میری ایڈیٹر اور پبلشر دونوں کے مبارکباد کے فون آ گئے۔ ڈاکٹر رابرٹس ہی کی طرح وہ دونوں بھی مجھے یہ سمجھا رہے تھے کہ میں نے واقعی کوئی میدان مار لیا ہے۔ سنڈے ٹائمز کے ایک بڑے اور مشہور تبصرہ نگار نے ایک نامور مصنف کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے فضول اور بکواس قرار دے کر اس کے مقابلے میں میری یعنی ایک بالکل ہی غیر معروف اور نئے مصنف کی کتاب کو سراہا تھا۔ اسے عمدہ اور بہترین قرار دیا تھا۔ یہ میرے لیے اعزاز کی بات تھی، بہت بڑے اعزاز کی۔

اپنی ایڈیٹر الزبتھ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں نے گراہم جانسن کو اپنی کتاب کی تعریف و ستائش پر شکریہ کہنے کے لیے بہت جھجکتے

ہوئے فون کیا تو دوسری جانب اس نامور شخصیت نے بڑے پُرتپاک لہجے میں مجھ سے گفتگو شروع کی اور میں نے شکریہ کہنے سے بھی پہلے بے ساختگی میں جو بات کی، وہ یہ تھی۔

''آپ نے میرا ناول پڑھا ہے؟ کیا واقعی آپ نے اسے پڑھا ہے؟''

وود لیعہ کی بے تحاشا تعریفوں، اباامیاں، ڈاکٹر ایڈم رابرٹس، الزبتھ اولیور اور نینسی اسمتھ کے قابل قدر ستائشی تبصروں کے باوجود پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری کتاب لوگوں کی نظروں میں اہمیت نہیں پا سکتی۔ مجھے تو یہ بہت اچھی لگتی ہے، اس لیے کہ میں نے اسے لکھا ہے مگر دوسروں کو؟ اور دوسرے اسے خریدیں گے بھی کب۔ مجھے لگتا تھا اسے بس میرے وہی جاننے والے پڑھیں گے جنھیں میں نے اس کی مفت کاپیز اپنے دستخط کر کے پیش کی ہیں۔

گراہم جانسن میری بے یقینی پر ہنسے تھے۔ ''کیا آپ کو یقین نہیں تھا کہ کوئی آپ کی کتاب کو پڑھے گا بھی؟''

''مجھے ایسا ہی لگتا تھا۔'' جو میرا سچا جواب تھا وہ میں نے کہہ دیا تھا۔

''ایک بہترین ناول لکھ کر اس کے اچھے ہونے پر شک میں مبتلا ہیں؟'' دوسری طرف ایک تجربہ کار اور ذہین شخص میرے شک اور بے یقینی پر سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ''Forever ایک کلاسک ناول ہے اور آپ ایک بہت اچھے رائٹر، ایک طویل عرصہ کے بعد کسی رائٹر نے مجھے اس قدر متاثر کیا ہے۔''

بات تو ساری یہی تھی کہ کتابوں کے اس قدر وسیع سمندر میں ایک قطرہ کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا جب نظر آنا شروع ہوا تو اپنی قدر بھی پانے لگا۔ سنڈے ٹائمز میں گراہم جانسن کے تبصرے کے بعد ابتداً دوسرے تبصرہ نگار، پبلشرز، بک سیلرز اور کئی رائٹرز میری کتاب کی طرف متوجہ ہوئے اور پھر اس کے بعد عام لوگ بھی اسے جاننے لگے۔

میں مشہور ہونے لگا ہوں، بہت سے لوگ مجھے پہچاننے لگے ہیں۔ یہ مجھے اس روز اندازہ ہوا جب بس میں دوران سفر ایک بوڑھی جاپانی عورت میرے پاس آ گئی۔ وہ بہت دیر سے مسلسل مجھے دیکھے جا رہی تھی اور میں اس کی نگاہوں سے الجھن محسوس کر رہا تھا۔

''تم عمر حسن ہو؟'' وہ جاپانی لب ولہجے میں انگریزی بولی۔

میرے سر اثبات میں ہلانے کی دیر تھی، اس کی آنکھوں میں فوراً ہی آنسو امڈ آئے۔ اس نے بڑی والہانہ گرم جوشی سے میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر حیران تھا۔

''تمہارا ناول بہت اچھا ہے۔ تم نے ٹھیک لکھا ہے، جنگ بہت بری ہوتی ہے۔ واقعی بہت بری۔ جو جنگ تم نے ناول میں لکھی، وہ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھی ہے۔ جاپان پر جن بموں کے گرائے جانے کی تم نے چپتا لکھی ان بموں نے میرے ماں باپ، بھائی بہن، میرے پورے گھر کو تباہ کر دیا تھا۔ اس جنگ نے مجھ سے میرا سارا خاندان چھین لیا تھا۔ تم نے آنا کے کردار میں مجھے لکھا ہے۔ میں نے بھی اسی کی طرح اپنے ہر رشتے کے بچھڑ جانے کا دکھ سہا ہے، یہاں تک کہ مائیکل کا بھی۔ وہ امریکی فوجی تھا۔ ہماری منگنی ہو گئی تھی، ہماری شادی ہونے والی تھی آنا

اور ٹام کی طرح۔ اس جنگ نے مجھ سے میرا مائیکل چھین لیا۔ وہ کب، کہاں، کیسے مرا مجھے تو کبھی یہ بھی پتا نہ چل سکا۔ اس کی لاش بھی نہ مل سکی۔ تمہارا ناول پڑھ کر پہلی بار مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دکھ کو میری طرح محسوس کیا ہے؟"

وہ بوڑھی عورت میرے ہاتھ پکڑ کر زاروقطار رو رہی تھی ایسے جیسے اسے معلوم ہے کہ میں اس کا دکھ اسی کی طرح اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتا ہوں۔ اس واقعہ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ جنہوں نے جنگ کی تباہ کاریاں دیکھیں، انہیں میری تحریر میں اپنی زندگیوں کے عکس نظر آئے، میرے کرداروں میں اپنا آپ جھانکتا نظر آیا تو نوجوان نسل کے وہ افراد جنہوں نے وہ سب نہیں دیکھا تھا انہیں میرے ناول میں دکھائی گئی سچی اور شدت والی محبت بہت پسند آئی۔ وجہ جو بھی تھی مگر میری کتاب کے پڑھنے اور اسے چاہنے والے بڑی تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

نقاد میرے کام کو اس اس زاویے سے پرکھتے اور اس کی اس انداز سے خوبیاں، خامیاں بیان کر رہے تھے جن پر خود میری نگاہ نہیں تھی۔

رات کی تنہائیوں میں، ساری دنیا سے کٹ کر، بالکل تنہا، بالکل اکیلے اپنے کمرے میں بند ہو کر جو چند کرداروں اور ان کی خوشیوں و غموں کی داستان میں نے تخلیق کی تھی، اس پر مجھے داد و تحسین سے نوازنے کو ایک جہاں موجود تھا۔ کئی اخبارات و میگزین کے ادبی صفحوں کے لیے ایڈیٹرز نے مجھ سے انٹرویوز کی فرمائش کرنی شروع کر دی۔ ٹی وی پر آنے والے بک پروگرامز اور ریڈیو پر اس حوالے سے نشر ہونے والے پروگرامز میں مجھے شرکت کی دعوت دی جانے لگی۔ یہ میرے اور میری کتاب کے لیے بہت اچھی چیز تھی۔

Exposure, Publicity سے تو میری کتاب اور زبردست طریقے سے بکے گی مگر میں اس چیز سے بہت ڈرتا تھا۔ لوگ مجھ سے میرے متعلق سوالات کریں گے۔ ماں باپ، بہن بھائی، گھر، خاندان میں ان سب کے لیا جواب دوں گا۔ یہ بات مجھے اندر ہی اندر بری طرح خوفزدہ کر رہی تھی۔

"مجھے یہ شہرت وہرت نہیں چاہیے دیا! مجھے Celebirty بننے کا شوق نہیں۔ اخباروں اور ٹی وی پر مجھے نظر آنے کی کوئی حسرت نہیں۔"

"کیوں شوق نہیں ہے تمہیں؟ میرے ساتھ جھوٹ مت بولو۔ ایسا کون ہوگا جسے مشہور ہونا اچھا نہیں لگے گا۔ تمہیں بھی اچھا لگتا ہے مگر تم ڈرتے ہو۔ تم کیوں ڈرتے ہو عمر؟" وہ ٹیلیفون پر مجھے سمجھا رہی تھی۔

"جو اس دنیا سے جتنا ڈرتا ہے یہ اسے اتنا ہی ڈراتی ہے۔ تم دنیا سے ڈرنا چھوڑ دو، یہ تمہیں ڈرانا چھوڑ دے گی۔ میری بات کا یقین کرو عمر! کوئی تم سے تمہاری ذات کے بارے میں اس حد سے آگے سوال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جس حد سے آگے تم اسے جانے کی اجازت نہیں دو گے۔ جو شہرت اور عزت اللہ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دی ہے کیوں خود ہی اس سے منہ پھیر رہے ہو؟"

اور پھر واقعی میں نے کئی اخبارات و رسائل کو انٹرویوز دیے تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے مختلف ادبی نوعیت کے پروگرامز میں شرکت کی تھی۔ میری زندگی میں ایک دم ہی سب کچھ بدل گیا تھا۔ ایک بالکل عام آدمی سے میں ایک بہت خاص آدمی بن گیا تھا۔ لوگ مجھے پہچاننے لگے تھے۔ اتنی محبتیں، اتنی چاہتیں۔ کون کون سے ملک ہیں، کون کون سے شہر جہاں میرے چاہنے والے بستے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک میرے ناول کو بھلا نہیں پائیں گے۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ میرے پڑھنے والے کہاں کہاں، مجھے چاہنے والے کہاں کہاں ہیں۔ اتنی بے تحاشا

محبتیں میں سنبھالوں کیسے؟ میں محبتوں کی اس بارش میں بھیگ رہا تھا۔

پریوں کا ایک نگر تھا جس میں، میں پہنچا ہوا تھا اور وہاں سب مجھے چاہتے تھے۔ میں اپنے چاہنے والوں کا ایک ایک خط سنبھال کر رکھتا تھا، یہ کاغذ کے ٹکڑے نہیں میرے چاہنے والوں کی محبتیں تھیں، میں انہیں ضائع کس طرح کر سکتا تھا۔ ودیعہ میری اس حرکت پر ہنستی تھی۔ کہتی تھی کہ میری الماریوں اور میزوں پر میرے لیے میرا اپنا سامان رکھنے کی جگہ ختم ہو جانے والی ہے۔ میرے بہت سے چاہنے والے میرے پبلشر کے ذریعے براہ راست مجھ سے ملاقات کے خواہش مند ہوتے۔ کچھ چاہنے والے تو اتنے جوشیلے اور جنونی تھے کہ وہ میرا پتا ڈھونڈتے ڈھونڈتے میرے کالج تک مجھ سے ملنے چلے آتے تھے۔ میں اپنے ایسے کسی بھی فین کا تذکرہ جان ہکھم یا الزبتھ سے کرتا تو وہ دونوں مجھ سے کہتے۔

"تم حیران اس لیے ہوتے ہو کیونکہ ابھی اپنی شہرت کا تمہیں خود ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہے تم نہیں جانتے کہ تم کتنے دلوں کی دھڑکن بن گئے ہو۔"

اپنے دیس میں بھی میری شہرت پہنچ چکی تھی۔ وہاں کی اخبارات نے میرے انٹرویوز کے لیے اور کئی مشہور اور صف اول کے پبلشنگ ہاؤسز نے میری کتاب کی اشاعت کے لیے مجھ سے رابطہ کیا تھا۔

ودیعہ انٹرویو کی بات سن کر تو نہیں البتہ پبلشرز کی بات سن کر بہت غصے میں آ گئی تھی۔

"گوروں نے تعریف کر دی تو اب انہیں تمہاری قدر ہوئی۔ یہی کتاب تھی جسے انہوں نے ریجیکٹ کیا تھا۔ انہیں یاد دلاؤ۔ ہم کیسی قوم ہیں، یہ ہماری کیسی بدنصیبی ہے۔ ہم اپنی بہترین چیزوں، اپنے قابل فخر سرمائے کو بھی اس وقت تک اچھا نہیں سمجھتے جب تک ہمارے پرانے آقا اسے اچھا قرار نہ دے دیں۔ ہمارے شاعر، ادیب، فنکار، گلوکار، موسیقار، مصور اس وقت تک ہماری نظروں میں عزت اور مقام نہیں پاتے جب تک کوئی گورا انہیں اچھا ہونے کا سرٹیفکیٹ نہ دے دے۔ ہمارے پاس کیا چیز اچھی ہے، یہ بھی ہمیں ابھی تک وہی بتاتے ہیں۔"

☆☆☆

دو بوندیں ساون کی

دو بوندیں ساون کی، ترجمہ ہے جیفری آرچر کے شہرہ آفاق ناول کین اینڈ ایبل کا جسے اُردو زبان میں ترجمہ کیا ہے علیم الحق حقی نے۔ دو بوندیں ساون کی کہانی ہے دو ایسے افراد کی جو ایک دوسرے سے شدید نفرت کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ ان میں سے ایک منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا اور دوسرا در بدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ ایک شخص نے دُنیا کے بہترین تعلیمی اداروں سے تعلیم پائی اور دوسرے کا استاد زمانہ تھا۔

یہ ناول کتاب گھر کے **معاشرتی اصلاحی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

لندن کے مختلف اخبارات وجرائد اور لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام وزیر انتظام اس سال برطانیہ و دولت مشترکہ کے ممالک میں شائع ہونے والی کتابوں کو سال کے اختتام پر ایوارڈز دینے کا موقع آیا تو ان لٹریری ایوارڈز میں مجھے اور Forever کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا گیا۔ مجھے Most promising writer Best Fiction, Best new talent کے علاوہ بعض لٹریری سوسائٹیز کے ذریعے سال کا بہترین مصنف تک کے ایوارڈز دیے گئے۔ میں تقریبات سے، لوگوں کے ہجوم سے ہمیشہ کتراتا تھا اور اب میں تقریبات میں بھی جا رہا تھا اور بہت سے لوگوں سے بھی مل رہا تھا۔ پہلے نامور ادیبوں، شاعروں اور مشہور لوگوں سے ابا میاں کے توسط سے ملنا ہوتا اور اب یہ سب لوگ مجھے میرے حوالے سے مل رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ سب اچھا لگ رہا تھا خوشی ہو رہی تھی۔

رائٹنگ نے مجھے اس ٹوٹے پھوٹے خستہ اپارٹمنٹ سے نکال کر ایک بہترین رہائشی علاقے کے خوبصورت اپارٹمنٹ میں پہنچا دیا تھا۔ ترقی یافتہ ممالک میں کسی رائٹر اور اس کی کتابوں کو پڑھنے والے دل و جان سے قبول کر لیں تو عزت، محبت اور شہرت کے ساتھ پیسہ بھی خوب ملتا ہے اور وہ مجھے بھی بہت مل رہا تھا۔

میں نے رائٹنگ کو اپنا پروفیشن نہیں چنا تھا، اس نے مجھے چن لیا تھا، وہ خود میرا پروفیشن بن گئی تھی۔ ودیعہ صحیح کہتی تھی۔ میں واقعی صرف لکھنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہوں۔ میرا اصل یہی ہے۔ میں لکھنے کے علاوہ اور کچھ شاید کر ہی نہیں سکتا تھا۔

پہلی ہی کتاب کے ذریعے میں نے خود کو اسٹیبلش کر لیا۔ اب میں اپنی رائٹنگ ہی کے ذریعے اتنا کما سکوں گا کہ ودیعہ کو ایک بہت اچھی، آسائشوں بھری زندگی دے سکوں۔ ایک خوشحال اور آسودہ زندگی۔ میں مطمئن ہو کر سوچتا، ودیعہ کو وہ تمام آسائشیں جن کی اسے عادت ہے، دے پانے کا احساس میرے رگ و پے میں سکون بن کر اترتا۔

فون پر میری گھر میں بات ہوتی تو میں محسوس کرتا کہ آنٹی، انکل اب مجھے اپنے داماد کی حیثیت سے قبول کرنے لگے ہیں۔ ان کے لہجے میں سرد مہری اور اجنبیت نہیں بلکہ محبت اور اطمینان جھلکتا۔ میں ان کی بیٹی کو خوش رکھ سکتا ہوں، اسے ایک باعزت زندگی دے سکتا ہوں۔

ودیعہ ماسٹرز مکمل کر کے ایک کثیر الاشاعت اخبار کے ساتھ منسلک ہو چکی تھی۔ یہ 85-84ء کی بات ہے تب انٹرنیٹ جیسی سہولیات نہیں تھیں مگر خطوط اور فون کالز کے ذریعے ہم مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ میرے لیے اس کی تعریفیں ویسی ہی تھیں۔ بے تحاشا اور بے انتہا۔

''پتا ہے عمر! جب کوئی تمہاری تعریف کرتا ہے تو مجھے کیا لگتا ہے بالکل ایسا جیسے یہ تمہاری نہیں میری تعریف ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں اپنی دوستوں اور کولیگز کو یہ بتاؤں کہ یہ عمر حسن جسے تم لوگ ایک مشہور رائٹر کی حیثیت سے جانتے ہو، دیار غیر میں جس نے اپنا نام روشن کر کے تم سب کو فخر و غرور میں اس سبب مبتلا کر دیا ہے کہ وہ تمہارا ہم وطن ہے۔ وہ میرا کیا لگتا ہے؟ وہ میرا کیا ہے؟''

بہت سے قابل لوگ میرے بارے میں بہت کچھ کہتے تھے، بہت کچھ لکھتے تھے مگر جس کے کچھ کہنے سے مجھے فرق پڑتا تھا، وہ یہی لڑکی تھی۔

☆☆☆

اپنے گھر اور گھر والوں کی یاد صرف اس بے آرام و بے آسائش اپارٹمنٹ اور سختی و مشقت والی زندگی ہی میں مجھے نہیں ستاتی رہی تھی اب

جس پر آسائش اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ جیسی آرام دہ و مطمئن زندگی گزار رہا تھا، وہاں بھی ہر پل گھر اور گھر والوں کی یاد ستاتی تھی۔ کسی بہترین ہوٹل میں شاندار کھانا کھاتے مجھے اچانک ہی بوا جی کے ہاتھوں کے پراٹھے یاد آنے لگتے۔ اپنے کالج کی لائبریری یا برٹش لائبریری میں بیٹھ کر مجھے ابا میاں کی لائبریری یاد آنے لگتی۔ کسی جگہ کوئی باوقار و باریش بزرگ نظر آجاتے تو میں مڑ مڑ کر کافی دیر تک انہیں دیکھتا رہتا۔ ان کی شکل میں ابا میاں کی شکل کھوجتا رہتا۔ جس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں تنہا ہوتا تو ہر آسائش کی موجودگی کے باوجود بھی اپنے گھر کا آرام یاد آتا رہتا۔ اپنے گھر کے ایک ایک فرد کی آوازیں میرے کانوں میں گونجتی رہتیں۔

☆☆☆☆

اب مجھے چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سو اب میں کالج کے بعد کا سارا وقت لکھنے میں گزار سکتا تھا اور گزار بھی رہا تھا۔

صرف اتنے فرق کے ساتھ کہ اب کالج ہی کے حوالے سے میری مصروفیات پہلے کے مقابلے میں خاصی بڑھ گئی تھیں اور یہ مصروفیات Creative writing پر مختلف ورک شاپس اور Creative writing سے متعلق شارٹ کورسز کی تھیں جن میں میری حیثیت سیکھنے والے کی نہیں بلکہ سکھانے والے کی تھی۔

میں...... نہ صرف یہ کہ ایک Published writer بن چکا تھا بلکہ ایک کامیاب اور قد آور ناول نگار کی حیثیت بھی اختیار کر چکا تھا۔ علاوہ ازیں میرے ایڈوائزر کے ذریعے دوسرے تمام اسٹوڈنٹس کی طرح جو میری سالانہ پروگریس رپورٹ میری تعلیمی، اخلاقی اور کردار کے حوالے سے پہنچی، وہ بھی بہت اچھی تھی۔ ان ہی کے ذریعے مجھے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں منعقد کی جانے والی ناول رائٹنگ ورک شاپس (work shops) اور شارٹ کورسز جو شام کے اوقات میں ہوتے تھے میں نوآموز اور ناتجربہ کار لکھاریوں کو بہت کچھ سکھانے اور پڑھانے کی دعوت دی گئی۔ ایک تو کام میری ہی دلچسپی کا تھا، میرے پیشے اور شوق سے متعلق پھر اس کا مجھے معاوضہ بھی ٹھیک ٹھاک مل رہا تھا۔ تو میں اتنی شاندار پیش کش سے انکار کیوں کرتا۔ لہٰذا اب سلسلہ کچھ یوں تھا کہ کالج کے اپنے اوقات کار اور اپنی مصروفیات کے بعد کا سارا کا سارا وقت میں اپنے ناول کو دے رہا تھا۔

اب یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں رات لکھوں اور صبح ودیعہ میرے لکھے صفحات کو پڑھ ڈالے۔

اب درمیان میں بہت سارے فاصلے حائل تھے مگر اس کی رائے اور اس کے تبصرے کے بغیر میں لکھ نہیں سکتا تھا۔ جب تک وہ نہ کہہ دے۔ ''اچھا ہے۔'' میں آگے لکھنے میں مشکل محسوس کرتا تھا۔ اور وہاں وہ بھی میرے لکھے کو پڑھنے کے لیے بے چین رہتی تھی۔ اس کے لیے میں ہر اگلے تیس چالیس صفحات لکھ لینے کے بعد انہیں فوٹو کاپی کروا کر کراچی، ودیعہ کے پاس روانہ کر دیا تھا۔ یہ ہم دونوں کی وہ حرکت تھی جسے ہم بچپن میں کہانی سننے اور سنانے والی اپنی حرکت کی طرح سب سے چھپاتے تھے۔

عمر حسن جو ایک مشہور اور معروف رائٹر تھا، اس کی یہ بچگانہ حرکت کسی کو پتا تو نہیں چلنی چاہیے تھی۔ ودیعہ ان صفحات کو وصول کرتے ہی فوراً پڑھتی اور پھر جلدی سے مجھے فون کر کے اپنی رائے بتاتی۔

''اگر تم نہ ہوتو میں کیسے لکھوں گا؟'' میں ہر بار اس کی رائے، تبصرے، تعریف اور تنقید کو سننے کے بعد کہا کرتا تھا۔ وہ اتنی دور بیٹھ کر بھی میری فکر کرتی رہتی تھی۔ کہیں ناول کو اچھے سے اچھا بنانے کی دھن میں، میں ضرورت سے زیادہ محنت تو نہیں کر رہا۔

''لکھنے میں گم ہو کر زیادہ دیر تک مت جاگا کرو عمر! اور سنو، چائے یا کافی کثرت سے پینے کے بجائے دودھ یا جوس پی لیا کرو۔'' میں اس کی فکرمندی پر ہنستا تھا۔

''دیا! اگر میں یہ ناول ہماری شادی کے بعد لکھتا تو کتنا مزا آتا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ ساری رات جگا کر رکھتا۔ دیا! جاؤ میرے لئے ایک کپ کافی لاؤ۔ دیا! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میرے لیے کچھ بنا کر لاؤ۔''

''دیا! میں لکھتے لکھتے تھک گیا ہوں، میرے کندھے دبا دو۔''

خیر اپنے یہ سارے ارمان میں اگلے ناول میں پورے کروں گا، تب تک تو ہماری شادی ہو ہی چکی ہوگی۔''

میں لبوں پر شرارتی تبسم لیے اسے چھیڑتا۔

''تمہارا ارادہ مجھے بیوی بنانے کا ہے یا نوکرانی؟'' وہ لڑنے کو تیار ہو جاتی۔

''دونوں۔ مجھے اپنے لیے ایک ایسی نوکرانی چاہیے جو بغیر تنخواہ کے ساری زندگی میری خدمت کرے۔''

''منہ دھو رکھو۔ میں کوئی تمہاری خدمت ودمت نہیں کرنے والی بلکہ جب تم رات میں لکھتے لکھتے اٹھ کر اپنے لیے کافی بنانے جاؤ گے تو میں فرمائش کر کے ایک کپ اپنے لیے بھی تم سے بنواؤں گی۔''

''یعنی تم میرے ساتھ جاگا تو کرو گی۔ سوتے میں تو تم مجھ سے کافی کی فرمائش کرنے سے رہیں۔ چلو یہ بھی خدمت کا ہی ایک انداز ہے۔ جب تک میں جاگا کروں گا، تب تک تم بھی جاگتی رہو گی۔''

میں ہنستے ہوئے برجستہ کہتا اور پھر اس کی جھنجلاہٹ کا مزا لیتا قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا۔ اس کے ساتھ ہونے والی یہ ہلکی پھلکی سی باتیں اور چھیڑ چھاڑ ہمیشہ میری ساری تھکن اتار کر مجھے لکھنے کے لیے پھر سے بالکل فریش اور متحرک کر دیا کرتی تھیں۔

ودیعہ کہتی تھی میرا یہ ناول پہلے ناول سے بھی زیادہ پذیرائی حاصل کرے گا۔ میں بھی یہ بات جانتا تھا اس ناول کا سبجیکٹ اور اس کا ٹریٹمنٹ دونوں پہلے ناول سے زیادہ میچور تھے۔

جتنے عرصہ میں میرا ''MFA'' مکمل ہوا، اتنے ہی عرصہ میں میرا ناول مکمل ہوا۔ میرا دوسرا ناول، لندن آتے ہی میں نے اسے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ جب ماسٹرز کی ڈگری کے حصول کا آخری مرحلہ آیا۔ میرا تھیسس ایڈوائزری کمیٹی کے سامنے منظوری یا نامنظوری کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ تب میں نے ناول کے اختتامی صفحات تحریر کیے تھے۔ تھیسس والے مرحلے سے فارغ ہوتے ہی میری پاکستان روانگی تھی۔ جہاں میری اور ودیعہ کی شادی کی تاریخ ابا میاں طے کر چکے تھے۔

اس تاریخ کا میں کتنی بے صبری، کتنے مہینوں سے انتظار کر رہا تھا۔ اتنے بہت سارے دنوں بعد میں اپنے ملک جاؤں گا۔ اپنے ناول کو بھی

میں نے صرف شادی کی تاریخ سر پر آتا دیکھ کر جلدی جلدی مکمل کیا تھا، ورنہ میں ابھی اسے ختم کرنے میں چند ماہ اور لگا دیتا۔

''میں نے ناول مکمل کر لیا ہے اور اب پانچ چھ مہینوں تک تم مجھ سے کچھ لکھنے کے لیے اصرار نہیں کرو گی۔ شروع کے چند مہینے میں صرف تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر اسے پہلے ہی وارننگ دے دی تھی۔ میں جانتا تھا، ادھر میں اپنے مسودہ کو نظر ثانی کے بعد اپنے پبلشر کے حوالے کروں گا۔ ادھر وہ مجھ سے اگلا ناول شروع کرنے کا اصرار کرے گی۔

''دو سالوں میں تو تم سے یہ ناول لکھا گیا ہے۔ دوسرے رائٹرز کو دیکھو بعض تو سال میں دو دو تین تین ناولز تک لکھ لیتے ہیں۔'' اس نے جیسے مجھے میری سست رفتاری کا احساس دلانا چاہا۔

''وہ لکھ لیتے ہیں۔ میں نہیں لکھنا چاہتا۔ فی الحال تو میں لکھنے سے اس لیے منع کر رہا ہوں کہ شادی کے بعد شروع کا وقت ہم ایک دوسرے کے ساتھ بھرپور طرح گزار سکیں۔ مگر آئندہ بھی میں سال یا دو سال میں صرف ایک ناول لکھا کروں گا۔ میں بھرتی کی کوئی چیز نہیں لکھنا چاہتا۔ میرا نام چل پڑا، لوگ میرا نام دیکھ کر کتابیں خریدنے لگے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں محنت کرنا چھوڑ دوں۔ میری کتابیں تعداد کے لحاظ سے نہیں، معیار کے لحاظ سے قدر آور ہوں۔ میرے کریڈٹ پر چاہے دوسرے رائٹرز کے مقابلے میں کم کتابیں ہوں مگر وہ ایسی ہوں کہ ان کے معیار پر کوئی دو رائے دی ہی نہ جا سکیں۔ انہیں بہترین کے سوا کچھ اور کہا ہی نہ جا سکے۔''

''ہاں بھئی، بڑے رائٹرز کی بڑی باتیں ہوتی ہیں، عمر حسن جیسے بڑے رائٹر کو ایسی باتیں سوٹ کرتی ہیں۔ پتا ہے تمہارے انٹرویوز میں اس طرح کی تمہاری باتیں پڑھ کر ابا میاں مجھ سے کیا کہتے ہیں۔

''یار! یہ اپنا عمر تو بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔ اب واپس آ کر ہمیں پہچانے گا بھی کہ نہیں۔'' وہ مجھے جان بوجھ کر ستا رہی تھی۔

میں پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ خرید چکا تھا اور آج کل شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں اپنی ہونے والی دلہن کے لیے جلدی جلدی خریداری کرنے میں مصروف تھا۔ کچھ چیزیں جو میں یہاں سے لینا چاہتا تھا، وہ یہاں سے لے جا رہا تھا، باقی کپڑوں اور روایتی عروسی زیورات کی خریداری میرا کراچی میں ودیعہ ہی کے ساتھ کرنے کا ارادہ تھا۔

شادی سے ہٹ کر بھی ودیعہ کے لیے میں نے پرفیوم، قلم، کتابیں بہت ساری چیزیں خریدی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی سب گھر والوں کے لیے بھی بہت سے تحائف خریدے تھے۔

کراچی میں انکل، آنٹی اور ابا میاں نے شادی کی زوردار تیاریاں کر رکھی تھیں۔ میری ودیعہ سے فون پر جب بھی بات ہوتی تو وہ مجھے آنٹی کے ساتھ جا کر، کر کے آئی ہوئی اپنی تازہ ترین شاپنگ کی پوری تفصیلات سناتی۔

☆☆☆

MFA مکمل ہو جانے کے بعد ایک اور خاص واقعہ یہ تھا کہ مجھے میرے ہی کالج میں لیکچرز شپ آفر ہوئی تھی۔ میں ورک شاپس اور شارٹ کورسز میں بہت اچھی کارکردگی دکھا چکا تھا۔ ایک اسٹیبلشڈ رائٹر سے Creative writing Programme, کے ڈائریکٹر ورک شاپس (کنڈکٹ) Conduct کرنے کو کہنے میں غلط نہیں تھے Creative Writing کے ڈین اور کالج کے پرنسپل اسے وہاں مستقل ملازمت کی پیش کش کرنے میں بھی ہرگز غلط نہیں تھے۔

میری کتابیں مجھے اتنا دے رہی تھیں کہ میں اور ودیعہ ایک خوش حال اور آسودہ زندگی گزار سکیں۔ لیکن اگر مجھے اس کے ساتھ کچھ اور اضافی میرے مطلب کا کرنے کا کام مل رہا تھا تو میں اس سے انکار کیوں کرتا۔ میرے لیے لکھنا بھی خوش گوار تھا۔ اور لکھنا سکھانا بھی۔ میں نے جاب قبول کر لی تھی۔ مگر اسے میں جوائن واپس آ کر اگلے ٹرم سے کرنے والا تھا۔ شادی کر کے جب ودیعہ کو اپنے ساتھ یہاں لے آؤں گا پھر پندرہ بیس دن ہم گھومنے پھرنے میں گزاریں گے اور اس کے بعد جب اگلا ٹرم شروع ہوگا تو میں باقاعدہ جاب جوائن کرلوں گا۔ اور اپنے ناول کا مسودہ تو میں پاکستان سے واپس آتے ہی اپنے پبلشر کے حوالے کر دوں گا۔ میں اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جا ہی اس لیے رہا تھا۔ کراچی میں شادی کی تیاریوں کے دوران میرا ارادہ اس پر نظر ثانی کرنے کا بھی تھا۔

میں بڑی باریک بینی سے اپنے مسودہ پر نظر ثانی کیا کرتا تھا۔ یہ سارا کام شادی سے پہلے ہو جائے تو اچھا ہے۔ بعد میں تو پھر میں ہوں گا، ودیعہ ہوگی اور خوابوں سے بھی حسین ہماری نئی زندگی ہوگی۔ پھر میرے لیے مسودے کی طرف دیکھنے کی فرصت نکالنا بھی مشکل ہو جائے گا اور پھر ایک طرف ودیعہ اور دوسری طرف جان بکھم دونوں مل کر میری جان کھائیں گے۔ مجھے ست اور کاہل قرار دیں گے۔ مجھے ڈانٹ ڈانٹ کر یاد دلائیں گے کہ میرے قارئین، میرے پڑھنے والے، میرے چاہنے والے بے شمار اور لاتعداد ہیں اور اتنے بے شمار چاہنے والوں کو بے صبری اور بے چینی سے میرے دوسرے ناول کا انتظار ہے۔

Forever جب بیسٹ سیلر بنا تب جان بکھم نے مجھ سے میرے دوسرے ناول کی بات کی تھی، میں دوسرا ناول لکھنا شروع کروں اور ظاہر ہے اسے JBM سے ہی شائع کراؤں۔ تب میں نے اسے یہ بتا کر کہ میں دوسرا ناول بھی کافی پہلے سے لکھنے میں مصروف ہوں اور تو اسے آدھے سے زیادہ لکھ بھی چکا ہوں، بے تحاشا جوش و خروش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ فوراً مجھ سے بضد ہوا تھا کہ میں اس ناول کے لیے JBM کے پاس کنٹریکٹ سائن کر دوں۔

تب مجھے ”جے بی ایم“ والوں کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے پبلشنگ ہاؤسز سے جو JBM سے زیادہ بڑے بلکہ لندن کے نمایاں ترین پبلشرز میں شامل تھے، پرکشش پیش کش موصول ہو رہی تھی، اور یہ پیش کش تو ابھی بھی موصول ہو رہی تھیں۔ میں کسی بھی نامی گرامی پبلشر کی پیش کش بہترین مراعات دیکھ کر قبول کر لیتا تو ہرگز غلط نہ ہوتا۔ ہر آدمی اپنا فائدہ سوچتا ہے۔ اگر مجھے جے بی ایم سے بہتر جگہ سے آفر آ رہی ہے تو میں کیوں انکار کروں؟ مگر جنہوں نے مجھے پہلی مرتبہ جب کہ کوئی مجھے جانتا تک نہیں تھا، میری کتاب شائع کی، کیا یہ میری اخلاقی ذمہ داری نہیں تھی کہ میں اپنی ہر اگلی کتاب اگر نہیں بھی تو کم از کم دوسری کتاب ضرور وہیں سے شائع کرواؤں۔

یہی سب کچھ میں نے جان بکہم سے بھی کہا تھا، میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ مکمل ہونے کے بعد میرا مسودہ اگر کسی پبلشر کے پاس جائے گا تو وہ صرف اور صرف وہی ہوگا مگر اسے خطرہ تھا دوسرے پبلشنگ ہاؤسز سے، دوسرے پبلشرز سے۔ وہ بضد تھا ایک کانٹریکٹ کے سائن ہونے پر، تاکہ میری اس کی بات قانونی طور پر پکی ہو جائے۔ جان بکہم کے حد سے بڑھتے اصرار کے سبب مجھے کانٹریکٹ کرنا پڑا تھا۔ جس میں نوے فیصد شقیں میری پسند کی تھیں۔ میں ایسا مصنف بن چکا تھا کہ JBM کسی بھی قیمت پر مجھے کھونا نہیں چاہتے تھے۔ اور یوں میں نے جان بکہم کے ساتھ یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ میرا ناول ''جے بی ایم بکس'' ہی شائع کریں گے۔

☆☆☆

پورے سوا دو سال کی جدائی کے بعد گھر والوں سے ملنا ایسا تھا کہ میں اپنی خوشی کسی طور پر چھپا ہی نہیں پا رہا تھا۔ ابا میاں، بوا جی، آنٹی، انکل میں ایک ایک کے چہرے کو گھڑی گھڑی بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ کیا میں واقعی اپنوں کے بیچ پھر سے موجود ہوں، یا یہ کوئی خوبصورت خواب ہے؟ اور ودیعہ، اس کے چہرے پر سے تو میرا نگاہیں ہٹانے کو جی ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس سے اتنے لمبے عرصے تک دور رہنے کے بعد دوبارہ مل رہا تھا۔ تو ابا میاں، انکل اور آنٹی کی موجودگی کے باوجود اسے چپکے چپکے والہانہ نظروں سے دیکھنے سے خود کو روک نہیں پا رہا تھا۔ جب کہ وہ میری اس حرکت پر مجھے تنبیہی نظروں سے گھور رہی تھی۔

''میں نے تو تم سے صرف اتنی خواہش کی تھی کہ ایسے بن کر آنا کہ میں تم پر فخر اور ناز کر سکوں۔ مگر تم تو ایسے بن گئے کہ صرف میں کیا بہت سے لوگ تم سے تعلق پر فخر کرنے لگے ہیں۔ بہت سے پاکستانیوں کے لیے تمہارا پاکستانی ہونا قابل فخر ہو گیا ہے۔''

ابا میاں نے مجھے گلے سے لگا کر والہانہ گرم جوشی سے سب سے پہلی بات یہی کہی تھی۔

''آپ کو کیا ہوا ہے؟ اتنے کمزور ہو گئے ہیں؟'' میں پر تشویش نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی پہلے سے کافی کمزور لگ رہے تھے۔

''بوڑھا ہو گیا ہوں۔'' وہ میری تشویش کے جواب میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولے تھے۔ آنٹی اور انکل بھی مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملے تھے۔ منگنی کے دن جیسی سرد مہری اور سپاٹ انداز کی جگہ ان دونوں کا رویہ میرے ساتھ محبت اور چاہت کا حامل تھا۔ گو درمیان میں تکلفات تو اب بھی حائل تھے۔ میں جس طرح ودیعہ اور ابا میاں سے باتیں کر رہا تھا، اس طرح بے تکلفانہ انداز میں ان دونوں سے باتیں نہ میں کر پا رہا تھا اور نہ ہی وہ دونوں مجھ سے یک دم بے تکلفی اختیار کر پا رہے تھے۔

ابا میاں کے بہت کہنے کے باوجود بھی اپنے گھر میں نہیں ٹھہرا تھا۔ اس لیے نہیں کہ میرا بچپن کا گھر اب میرا سسرال کا گھر بننے جا رہا تھا اور وہاں ٹھہرنے میں میری دامادی انا آڑے آ رہی تھی۔ میں وہاں صرف اس لیے نہیں ٹھہرا تھا کہ ودیعہ کو میرے ساتھ رخصت کرتے وقت آنٹی، انکل اس اطمینان کو ہر طرح اپنے دل میں موجود پائیں کہ ان کا داماد ان کی بیٹی کو گھر، سکھ، چین، آسائشیں، سب کچھ اپنے بل بوتے پر دینے کی پوری اہلیت رکھتا ہے۔ اسے رخصت کرتے وقت انہیں ایسا تو لگے کہ وہ اپنی بیٹی کو ایک خوش و خرم زندگی کی طرف وداع کر رہے ہیں۔

میں نے کرائے پر ایک فرنشڈ اپارٹمنٹ اور ایک گاڑی لے لی تھی۔ شادی میں دن کم رہ گئے تھے اور کرنے کو کام بہت تھے۔ میں روز ودیعہ

کو ساتھ لے کر نکلتا اور ہم کئی کئی گھنٹے بازاروں میں مارے مارے پھرتے وہ اپنے آفس اور اپنے کاموں کا شور مچاتی ہی رہ جاتی اور میں اس کے شور شرابے کو نظر انداز کر کے خریداری کیے جاتا۔ عروسی لباس، دیگر ملبوسات، زیورات ہر چیز ہم دونوں نے ساتھ مل کر پسند کی تھی۔ اپنی زندگی کے جن خوب صورت ترین لمحات کا میں نے پل پل انتظار کیا تھا وہ لمحات بس اب آنے ہی کو تھے، اور ان لمحات کی آمد سے قبل ان تیاریوں کو بھی بہت بھرپور طرح انجوائے کر رہا تھا۔

میں اسے اس کے آفس سے زبردستی لایا ہوں، وہ اس بات پر مجھ سے لڑتی جھگڑتی بھی رہتی۔ اور ساتھ ساتھ میری پسند کی اشیاء کو پسند یا ناپسند بھی کرتی رہتی۔ ہر روز اس کا مخصوص سوال یہ بھی ضرور ہوتا کہ میں نے مسودے پر نظر ثانی کا کام کتنا مکمل کر لیا۔

"تم شادی کے دن بھی مجھ سے میرے مسودے ہی کی باتیں کرنا۔"

جب وہ شادی کی شاپنگ سے زیادہ اہمیت اس موضوع کو دیتی اور اس پر سے ہٹتی نظر نہ آتی تو میں چڑ چڑے پن سے کہتا۔

☆☆☆

میں مسلسل اور متواتر دن، رات لگ کر لکھتے لکھتے اپنے ناول کے اس حصے تک آ پہنچی تھی جب عمر حسن اور ودیعہ کمال کی مہندی کا دن آ چکا تھا۔ مہندی کی رات، رنگ و نور اور خوشبوں کی بارات سعادت علی خان کے گھر میں اتر آئی تھی۔ ان کی جان سے عزیز پوتی کی شادی تھی وہ جو جو بھی اہتمام نہ کر لیتے کم تھا۔ ان کے گھر کے وسیع و عریض لان میں تقریب کا پرشکوہ اہتمام تھا۔ اس تقریب کی رونقوں، سجاوٹوں اور روشنیوں کا بھرپور انداز میں ذکر کرنے کے بعد میں نے سعادت علی خان، ان کے بیٹے ڈاکٹر کمال علی خان، بہو ڈاکٹر نائلہ کمال کو خوشی کے اس موقع پر جذبات کا بہت موثر انداز میں اور بڑی تفصیل کے ساتھ تذکرہ کرنے کے بعد اپنا سارا زور بیان ان دو لوگوں کی خوشیوں کا ذکر کرنے میں لگا دیا تھا جو اپنی سولہ سال کی طویل محبت کو ایک خوب صورت اور من چاہا رخ دینے والے تھے۔

عمر حسن اس موقع پر کتنے خوش تھے اور ودیعہ کمال کتنی مسرور، ان دو کرداروں کے ساتھ ساتھ چل کر اس مقام تک آتے آتے میں ان کی تمام خوشیاں، امنگیں اور سرشاریاں بہت اچھی طرح محسوس کر سکتی تھی۔ دو پیار بھرے دلوں نے جس دن کی دعائیں مانگی تھیں۔ دعاؤں کی قبولیت کے وہ لمحات ان کی زندگیوں میں آ چکے تھے۔ عمر حسن مہندی کی تقریب کے دوران سب کی نظروں سے بچ کر بڑے خفیہ انداز میں ودیعہ کمال کے کمرے میں پہنچ گئے تھے اور میں اس منظر کو لکھتے ہوئے ان کی بے تابی، بے قراری اور ان کی یوں آمد پر ودیعہ کمال کی محبت آمیز خفگی، مجبوری اور بوکھلاہٹ کو انجوائے کر کے مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

"تم......؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" مایوں کے پیلے لباس میں سر سے دوپٹہ لیے وہ بغیر میک اپ کے ہی بہت حسین لگ رہی تھی۔ باہر لان میں مہمانوں کا ایک ہجوم تھا اور وہ مہمانوں کے درمیان سے نکل کر جانے کس طرح یہاں تک پہنچا تھا۔

"باہر اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں آئیں بھی تو اتنا بڑا سارا گھونگھٹ نکال کے۔ میں تمہیں دیکھ بھی نہیں سکا کہ تم ان کپڑوں میں لگ کیسی

رہی ہو۔" وہ بے فکری ولاپرواہی سے کمرے کے اندر قدم رکھنے لگا۔

"عمر کوئی آجائے گا، باہر اتنے مہمان ہیں۔" اس نے کس قدر بوکھلائے ہوئے لہجے میں اسے سمجھانے کی سعی کی۔

"اسی لیے تم سے کہتا ہوں، ہمارے ہاں کی فلمیں کم دیکھا کرو۔ دیکھا ان کا اثر، اس ٹون میں جایئے کوئی آجائے گا، اور ہائے اللہ کوئی دیکھ نہ لے جیسی لائنز بولنے لگی ہو۔" وہ اندر آتا شان بے نیازی سے بولا۔

"ارے واہ مہندی، تم نے مہندی لگا لی؟ دکھاؤ مجھے۔"

اس کے یہ کہنے کی دیر تھی، ودیعہ نے جھٹ اپنے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے چھپا لیے۔ "ہرگز نہیں۔"

اس کے قطعیت بھرے انکار پر عمر نے چہرے پر مصنوعی سی مایوسی اور دکھ بکھیر لیا۔ "دکھا دو یار صرف ایک دن اور ہے تمہارے پاس۔ کل تم سے پوچھوں گا۔"

"تم کل مجھ سے سب کچھ پوچھ لینا مگر اس وقت تو یہاں سے جاؤ۔ عمر...... پلیز......" اس نے ملتجی سے لہجے میں اس کی بے قراریوں پر بند باندھنے کی کوشش کی۔

"چلا جاؤں گا، بس ایک بات مجھے بتاؤ۔"

"کیا......؟" اس نے خفگی بھری عجلت سے پوچھا۔ یہ کہنا سننا ختم ہو اور وہ یہاں سے جائے تو وہ سکون کا سانس لے گی۔

"آج کی رات اور کل کا دن یہ دونوں کب گزریں گے؟ میں یہ ایک دن کیسے گزاروں دیا؟" اس کی بے چارگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"تمہاری یہ امیچور اور بچکانہ حرکتیں اگر تمہارے فینز کو پتا چلیں تو بے چارے حیران پریشان رہ جائیں گے۔ ان کا فیوریٹ رائٹر جو اپنی تحریروں میں اتنا سوبر اور میچور نظر آتا ہے حقیقت میں اس قدر بچکانہ حرکات کرتا ہے۔"

"پتا چل جائے تو چل جائے۔ میں تو ایسا ہی ہوں اور ایسا ہی رہوں گا۔ تمہارے لیے میں بیوقوف بھی ہوں، بچہ بھی ہوں، پاگل بھی ہوں اور دیوانہ بھی ہوں اور میں تمہارے لیے ہمیشہ ایسا ہی رہوں گا۔ میں تمہارے لیے کبھی نہیں بدل سکتا دیا! میں خود کو بدلنا چاہتا ہی نہیں ہوں۔ اور یہ بات تمہیں بھی معلوم ہے پھر کیوں مجھ سے اپنے معاملے میں میچورٹی کی توقع رکھتی ہو؟"

وہ اس کے اس من موہنے روپ کو اپنی نظروں میں سموتا بڑی وارفتگی سے بولا اور وہ بے اختیار اپنی نظریں جھکانے پر مجبور ہو گئی۔

"کبھی میرا ساتھ مت چھوڑنا دیا۔ ! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں ایک خود غرض سی دعا ہمیشہ مانگتا ہوں دیا! مجھے میری اس خود غرضی کے لیے معاف کر دو۔

موت برحق ہے، یہ جانتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں، پھر بھی اللہ کے حضور ایک خود غرض سی دعا بار بار مانگتا ہوں کہ وہ جب آئے تو پہلے مجھے۔ یہ خود غرضی ہی تو ہے دیا! میری خود غرضی، سنگ دلی اور بے رحمی کہ تم سے پہلے میں مروں تم میرے مرنے کا غم سہو مگر میں تمہارا نہیں۔ میں نے کبھی تمہارے لیے کچھ برا نہیں سوچا دیا۔ مگر یہ ایک بری بات ہے جو میں سوچتا ہوں، جس کی میں بار بار دعا مانگتا ہوں۔"

وہ پتا نہیں کیوں ایسی اداس کر دینے والی باتیں کر گیا تھا، خوشی کے ان لمحوں میں شوخ اور شرارتی موڈ سے وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔ حد درجہ سنجیدہ اور ودیعہ کمال وہ بے ساختہ درمیان میں حائل چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس کے بالکل قریب آ گئی تھی۔

''عمر! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آج کے دن، اس خوشی کے موقع پر مرنے مرانے کی باتیں؟ اتنی بری بری باتیں کر کے خود بھی ڈپریس ہو رہے ہو اور مجھے بھی اداس کر رہے ہو۔''

ودیعہ کی آنکھوں میں پھیلتی اداسی اور دکھ دیکھ کر وہ اپنی بے اختیارانہ باتوں پر بری طرح شرمندہ ہوا اور پھر فوراً ہی اپنے کچھ دیر پہلے والے چونچال موڈ میں واپس آ گیا۔

''اچھا! اگر تم مجھے اپنی مہندی نہیں دکھا رہیں تو کم از کم یہ دوپٹہ ہی اوڑھ کر دکھا دو۔'' پیچھے بیڈ پر اس کے عروسی لباس کا سرخ رنگ کا حسین و زرتار دوپٹہ رکھا تھا۔ شاید عمر کے یہاں آنے سے پہلے وہ کمرے میں چھپی خود کو اس دوپٹے سے سجائے اپنا روپ آئینے میں دیکھ رہی تھی۔

''ہرگز نہیں، بالکل نہیں۔''

''اچھا تو دولہا میاں یہاں موجود ہیں۔ باہر سب جگہ ڈھونڈ پڑ رہی ہے کہ مہمان خصوصی کہاں تشریف لے گئے ہیں۔'' یہ چھاپا ودیعہ کی کسی کزن یا سہیلی نے مارا ہوتا تو خیر تھی، مگر یہاں تو آنے والی شخصیت ابا میاں کی تھی۔ وہ اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچ جائیں گے اس کی اسے امید نہیں تھی۔ ودیعہ کی شادی کی خوشی میں وہ اپنی ساری بیماریوں اور کمزوریوں کو بھلائے بڑے چاق و چوبند اور متحرک سارے گھر میں گھومتے اور تقریب کے انتظامات کرتے پھر رہے تھے۔

''جی ابا میاں! وہ جی میں...... وہ'' کرتا وہ کھسیانے انداز میں سر کھجاتا انہیں اپنی یہاں موجودگی کی وجوہات سے آگاہ کر رہا تھا۔ وہ مسکراہٹ ضبط کرتے اس کی بوکھلاہٹ کا مزہ لے رہے تھے اور ودیعہ سر جھکا کر زیر لب مسکراتی اس صورت حال سے حظ اٹھا رہی تھی۔

☆☆☆

عشق کا شین (III)

عشق کا عین اور **عشق کا شین** کے بعد کتاب گھر اپنے قارئین کے لیے جلد پیش کرے گا...... **عشق کا شین(III)**۔ ناول ایک مکمل کہانی ہے۔ امجد جاوید کی لازوال تحریروں میں سے ایک بہترین انتخاب۔ **عشق کا شین (III)** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

''21 جون 1986، خوابوں کی حسین تعبیر لیے وہ دن آخر آ پہنچا تھا جب ان دو لوگوں کی زندگیوں میں خوشیوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آ کر ٹھہر جانا تھا۔ گزری تمام رات وہ جاگتا رہا تھا۔ خوشیوں کے زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شامل ہو جانے میں کتنے پل باقی ہیں، وہ گن گن کر ان پلوں کو گزارتا رہا تھا۔ پھر 21 جون کی صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنے اپارٹمنٹ کو پھولوں سے سجانا شروع کر دیا تھا۔

اس کام میں اس نے کسی کو اپنی مدد کے لیے شامل نہیں کیا تھا۔ وہ یہ کام اکیلا کرنا چاہتا تھا۔ وہ خود ہر طرف پھول بچھا کر اس کے استقبال کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کے مین دروازے سے لے کر ان کے بیڈ روم تک کے سارے راستے میں اس نے پھولوں کی پتیاں بچھائی تھیں۔ بیڈ روم میں بڑی محنت سے اس نے یہ اہتمام کیا تھا کہ جیسے ہی وہاں کا دروازہ کھلے، اسی وقت دروازے پر بندھی ڈور ڈھیلی ہو کر چھت پر سے اندر آنے والے پر ڈھیر سارے پھول ہی پھول نچھاور کر دے۔

وہ بڑی چاہت سے ایک ایک چیز سجا رہا تھا۔ اپارٹمنٹ کو پھولوں کی خوشبوؤں سے مہکا رہا تھا۔ وہ کہیں پر بھی کوئی کمی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ صبح سے سہ پہر تک سب کچھ ٹھیک رہا تھا۔ اسے ہر چیز ٹھیک لگ رہی تھی وہ بے تحاشا خوش ہو رہا تھا۔ مگر پھر جیسے جیسے شام ہونے لگی، نجانے کیوں اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس کے دل کو یہ گھبراہٹ اور پریشانی کیوں ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ اپنے ذہن کو جھٹکنے لگا۔ دل کی گھبراہٹ کو اپنی خوشی اور ایکسائٹمنٹ کے ساتھ جوڑنے لگا۔

''وہ بہت زیادہ خوش ہونے کے سبب بلاوجہ کی گھبراہٹ کا شکار ہو رہا ہے۔'' مگر نہیں، اس کا دل ایک دم ہی تمام سجاوٹوں سے بے زار ہونے لگا تھا۔ اس کا دل بہت پریشان تھا۔ اس کا دل چاہا وہ فون کر کے ودلیعہ سے بات کرے۔

''دیا! تم ٹھیک ہو؟'' بس اتنی بات پوچھے اور اس کا جواب سنتے ہی فون بند کر دے۔ وہ فون تک آ گیا۔ مگر پھر ابا میاں کے ہاتھوں کل رات پکڑی جانے والی اپنی حرکت کا سوچ کر خود ہی رک گیا۔

''ساری دنیا کے لڑکوں کی شادیاں ہوتی ہیں، مگر ہر کوئی میری طرح کی بچکانہ حرکتیں نہیں کرتا۔ ابا میاں، انکل، آنٹی سب کیا سوچیں گے میں اپنی شادی کے لیے اتنا بے قرار ہوا جا رہا ہوں۔

مجھ سے چند گھنٹے صبر نہیں ہو رہا۔ چند گھنٹے ہی تو رہ گئے ہیں شادی میں۔ چند گھنٹوں بعد دیا میرے ہی پاس تو ہوگی۔ میرے ہی ساتھ تو ہوگی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ زندگی بھر کے لیے۔

بلاوجہ کی وہمی سوچ۔ بلاوجہ کی گھبراہٹ وہیں کھڑے کھڑے اس نے خود کو برا بھلا کہا۔ لعنت ملامت کی۔ وہ وہاں سے واپس مڑا ہی تھا کہ فون کی بیل بجی۔ اس نے جھپٹ لینے والے انداز میں سرعت سے ریسیور اٹھایا۔

''عمر! عمر۔!'' وہ ابا میاں کی آواز تھی۔ مگر وہ رو کیوں رہے تھے؟ ریسیور پر اس کی گرفت یک دم ہی مضبوط ہو گئی۔ اس نے جیسے سہارے کے لیے اس کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

☆☆☆

''کک..... کیا ہوا ابا میاں؟'' اس کا دل انجانے وسوسوں میں گھرا تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ''عمر! عمر! دیا، عمر! ودیعہ.....'' وہ بری طرح رو رہے تھے اور ودیعہ کا نام سنتے ہی اسے یوں لگا جیسے تیز تیز دھڑکتا اس کا دل رک گیا ہے۔ جب بات اس لڑکی کی ہوتی تھی تو اس کے دل سے آتا کوئی پیغام کبھی غلط نہیں ہوتا تھا۔ دل کی دہمی سوچیں، دل کی پریشانی سب سچ تھیں۔

''کیا ہوا دیا کو ابا میاں؟'' سکتے کی کیفیت میں وہ یہ جملہ کس طرح بول پایا اسے خود معلوم نہیں ہوسکا۔ ''دیا کا ایکسیڈنٹ..... عمر! میری بچی، میری جان وہ، وہ.....'' ریسیور ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گرا تھا۔

وہ گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے کہاں بھاگا جا رہا تھا اسے خود معلوم نہیں تھا۔ وہ گاڑی کن سڑکوں پر اور کس رفتار سے دوڑا رہا تھا۔ ٹریفک کا شور، اسے سڑکوں پر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''یا اللہ، یا اللہ.....'' اس کے لبوں سے کوئی دعا نہیں نکل پا رہی تھی، سوائے اس ایک پکار کے۔ اس کے تھے ہوئے وجود سے صرف اسی ایک نام کی تکرار ہو رہی تھی۔

بغیر کوئی ایکسیڈنٹ کیے نجانے وہ ہسپتال تک کس طرح پہنچ گیا تھا۔ ابا میاں، انکل، آنٹی ان لوگوں کے کچھ قریبی رشتے دار چہروں پر خوف اور آنکھوں میں آنسو لیے اسے وہاں بہت سے شناسا چہرے نظر آئے تھے مگر وہ کہاں تھی؟

''یونہی ہلکی پھلکی سی چوٹ لگ گئی ہے۔ ڈاکٹر بینڈیج کر رہے ہیں۔ ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔'' وہ یہ جملہ سننے کی آس میں سب کو دیکھ رہا تھا وہ ابا میاں کے پاس آ گیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''عمر! دیا تو دلہن بننے جا رہی تھی، وہ تو سجنے اور سنورنے جا رہی تھی پھر..... پھر اس نے اس طرح کیوں کیا۔ وہ کیوں ہمیں ڈرا رہی ہے عمر؟ وہ کیوں ہماری محبت کو آزما رہی ہے؟ میں نے اسے آوازیں دیں، اس نے میری کسی آواز پر آنکھیں نہیں کھولیں۔ مجھے جواب تک نہیں دیا۔''

''دیا کو کچھ نہیں ہوگا ابا میاں! وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔'' وہ ان سے زیادہ خود اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا۔

حادثہ کیسے ہوا؟ کب ہوا؟ کس کی غلطی سے ہوا؟ اس نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ یہ سوالات وہ لوگ کر رہے تھے جن کے لیے یہ حادثہ ایک دردناک خبر اور ایک الم ناک واقعہ تھا مگر یہ عمر حسن کے لیے کوئی خبر یا واقعہ نہیں، یہ اس کے لیے اس کی زندگی کی بات تھی، اس لیے کہ اندر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا اس لڑکی کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ اس کی دھڑکنیں جڑی تھیں۔ یہ ودیعہ کمال کی زندگی کا نہیں عمر حسن کی زندگی کا سوال تھا اور وہ ابھی زندہ رہنا چاہتا تھا، بہت سالوں تک، بہت طویل زندگی۔

''میں اس وقت اس کے ساتھ کیوں نہیں تھا؟'' وہ خود سے لڑ پڑا۔ وہ اپنے گھر میں پھول سجاتا پھر رہا تھا اور جس کے لیے وہ تمام پھول تھے، وہ ایک حادثے سے دوچار ہو چکی تھی۔

''عمر! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ آج کے دن، اس خوشی کے موقع پر مرنے مرانے کی باتیں۔''

''میں نے تو صرف ایک بات کی تھی دیا! اور تم نے۔ تمہیں میری خود غرضی اتنی بری لگی کہ فوراً مجھ سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ تم نے کبھی میرے ساتھ ایسے نہیں کیا دیا! پلیز مجھے معاف کر دو۔ اب میں ہمیشہ یہی دعا کروں گا کہ ہم دونوں ساتھ مریں۔ ہاں دیا! میں یہی دعا مانگا کروں گا۔

پلیز، پلیز مجھے معاف کر دو۔ بس ایک بار، صرف ایک بار۔''

''خدا کے لیے یہ مت کہنا کہ عمر حسن کے بچنے کی کوئی امید نہیں۔ مجھے میری زندگی کی نوید دو۔''

وہ کمال علی خان کے ساتھ ڈاکٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ کمال علی خان اس وقت ایک قابل ترین سرجن نہیں صرف ایک باپ تھے۔ انہوں نے سہارا دینے کے لیے مضبوطی سے عمر کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ دونوں خوف زدہ چہروں کے ساتھ آنکھوں میں امید لیے ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ودیعہ کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ اسے بچانے کی پوری کوشش کر رہے تھے مگر ابھی یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ حادثے میں اس کی ٹانگیں بری طرح متاثر ہوئی تھیں۔ خاص طور پر اس کا دایاں پیر۔ گھٹنے سے نیچے اس کا دایاں پیر مکمل طور پر کچل گیا تھا۔ گھٹنے سے نیچے اس کی دائیں ٹانگ بالکل ضائع ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز کا کہنا یہ تھا کہ وہ اگر اس کی جان بچا لینے میں کامیاب بھی ہو گئے تب بھی گھٹنے تک اس کی دائیں ٹانگ کاٹ دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے اور وہ کسی ڈاکٹر، کسی سرجن کی کوئی بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ وہ ایسا کبھی بھی نہیں ہونے دے گا۔

☆☆☆

کمال علی خان نے شہر کے تمام بڑے آرتھوپیڈک سرجنز سے رابطہ کیا تھا۔ جہاں تک ان کی رسائی تھی وہ تمام بڑے آرتھوپیڈک سرجن تک پہنچے تھے۔ ان کی ڈگریاں، ان کی پیشہ وارانہ مہارت، ان کا اثر و رسوخ اگر ان کی بیٹی کو نہیں بچا سکتے تو کس کام کا ہے یہ سارا تماشا؟ اپنی فیلڈ میں ماہر ترین آرتھوپیڈک سرجنز کی متفقہ رائے یہی تھی کہ وہ ودیعہ کی ٹانگ گھٹنے تک کاٹنا ناگزیر تھا۔

اندر آپریشن تھیٹر میں سرجنز اس کا آپریشن کر رہے تھے اور وہ باہر کوریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی تیز دھار آری سے اس کے پیروں کو کاٹا جا رہا ہے۔ ودیعہ کو کتنی تکلیف ہو رہی ہوگی، اس کا کتنا خون بہہ رہا ہوگا۔ اس نے زور سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کیسی تھی اس کی محبت جو اسے اس تکلیف سے بچا نہیں پائی۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو گر رہے تھے۔ وہ رات جس کے لیے ان دونوں نے کتنے ڈھیر سارے خواب دیکھ رکھے تھے، وہ آئی بھی اور آ کر گزر بھی گئی۔ مگر کچھ اس طرح کہ اپنی سفاکی اور ظلم کی نشانیاں زندگی بھر کے لیے ان دونوں کے پاس چھوڑ گئی۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا تھا لیکن اس رات عمر حسن نے اپنے پیر کٹتے دیکھے تھے۔

وہ آئی سی یو میں اس کے پاس آیا تھا۔ آپریشن کامیاب ہو چکا تھا۔ لیکن ابھی وہ خطرے سے مکمل طور پر باہر نہیں نکلی تھی۔ اس کمرے میں ایسی خاموشی اور ایسا سناٹا تھا کہ اسے اپنے بے آواز قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ سامنے بستر پر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا اس کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے نیچے کی پوری جگہ سوجی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے کی سرخ و سفید رنگت بالکل زرد ہو رہی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ اس کے پیروں کی طرف دیکھنے کی اس میں ہمت ہی نہیں ہوئی تھی پھر وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور آہستہ سے اس پر جھکا۔

''جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ تمہیں پتا ہے نا تم میرے لیے کیا ہو؟'' چند لمحوں تک بغور اس کے زرد ہوتے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ سیدھا ہوا تو نگاہ اس کے ہاتھ پر پڑی۔

''ہرگز نہیں، کل سے پہلے تم یہ مہندی کسی قیمت پر نہیں دیکھ سکتے۔'' اس کے لبوں سے ایک آہ نکلی۔ اس کی آنکھیں اشکوں سے بھر گئیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں پر اس کے نام کی مہندی رچی ہوئی تھی۔ اس نے اس کے سوئیوں اور تاروں میں جکڑے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر آہستگی سے چوما۔

''میرے لیے ٹھیک ہو جاؤ۔ پلیز جلدی، میں نے اپنا اپارٹمنٹ تمہارے لیے کتنا اچھا سجایا ہے۔ تم دیکھو گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ وہاں میں نے تمہارے لیے اتنے ڈھیر سارے پھول سجائے ہیں اور ہمارا لندن کا اپارٹمنٹ اس کے بارے میں تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں تھا۔ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا......'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ اپنا جملہ مکمل نہیں کر پایا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹرز کہہ رہے تھے کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ دیا اب بالکل ٹھیک ہے۔ کیا واقعی اب وہ ٹھیک تھی؟ وہ اپنے جسم کے ایک اہم ترین حصے سے محروم کر دی گئی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئے گی، جب اسے یہ پتا چلے گا کہ اس کے جسم کا ایک حصہ کاٹ کر پھینک دیا گیا ہے۔ وہ اب کبھی اپنے قدموں پر پہلے کی طرح چل نہیں پائے گی۔ وہ کیسے سہے گی اس دکھ کو؟ زندگی نے اتنا بدصورت کھیل کھیلا تھا عمر حسن کے ساتھ کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ جس کے باعث اسے اس دکھ سے بچا لے۔

اسے ان تین لوگوں کو سنبھالنا تھا جنہیں مشکل کی اس گھڑی میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ ایک بوڑھا دادا تھا، اپنی پوتی کی خوشیوں کو اجڑتے دیکھ کر جس کے لبوں پر خاموشی اور آنکھوں میں اشک ٹھہر گئے تھے۔ ایک باپ تھا، اپنی اکلوتی بیٹی کی معذوری نے جس کی ساری ہمت توڑ کے رکھ دی تھی اور ایک ماں تھی جو بیٹی کو سہاگ کے سرخ جوڑے میں دیکھنے کے بجائے ہسپتال کے بستر پر لاچار اور معذور پڑا دیکھ کر کھانا پینا اور بولنا سب بھول گئی تھی۔ وہ ان تینوں کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میری بیٹی معذور ہو گئی ہے عمر! یہ کس گناہ کی سزا ملی ہے ہمیں؟ تمہیں تو سب پتا ہے نا تم تو اسے سب سے زیادہ جانتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے نا وہ کیسی ہے؟ اس نے تو کبھی بھولے سے بھی کسی کا دل نہیں دکھایا ہوگا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ برا کیا ہی نہیں۔''

وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ ڈاکٹر نائلہ کمال جنہیں اس نے ہمیشہ پروقار انداز میں اٹھتے بیٹھتے اور بولتے دیکھا تھا۔ اس کا دل انہیں اس اجڑے حال میں دیکھ کر اندر ہی اندر رو دیا۔ وہ انہیں سنبھال رہا تھا۔

''آنٹی! ہم اس بات پر اللہ کا شکر کیوں ادا نہ کریں کہ دیا کی جان بچ گئی۔ اور جو کچھ بھی ہوا وہ زندہ تو ہے۔ اور آنٹی دیا بالکل نارمل زندگی گزارے گی پھر بھی اگر ہمارا دل یہاں مطمئن نہ ہوا تو ہم اسے امریکہ یا یو کے لے جائیں گے۔ سرجن فاروقی بتا رہے تھے کہ مصنوعی ٹانگ لگنے کے بعد انسان بالکل نارمل زندگی گزارتا ہے۔''

وہ ایک قابل ڈاکٹر کو وہ باتیں پیار سے سمجھا رہا تھا جو اس سے بہت بہتر انداز میں وہ خود جانتی تھیں۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اس کے لفظ اور اس کی تسلیاں جس طرح دکھوں پر مرہم رکھتے تھے اور کسی کے نہیں رکھ پاتے تھے۔

''انکل! خود کو سنبھالیں پلیز۔ اگر آپ اس طرح کمزور پڑ گئے تو ابا میاں کو، آنٹی کو اور سب سے بڑھ کر دیا کو کون سنبھالے گا۔ جب وہ

ہوش میں آئے گی، اسے یہ سب پتا چلے گا، اس وقت اسے آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہوگی۔ آپ خود کو سنبھال نہیں پائے تو اسے اس کڑے وقت میں حوصلہ کس طرح دیں گے؟

ودیعہ کو پرائیویٹ روم میں شفٹ کیا جا چکا تھا۔ کمال علی خان، ودیعہ کے بیڈ کے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے بہت ہمت کر کے چادر اٹھا کر اس کے پیروں کو دیکھا اور پھر وہ وہیں کھڑے ہو کر دکھ سے بے حال ہو کر رونے لگے تھے۔ عمر نے اس منظر سے اپنی نظریں چرالی تھیں اور ابا میاں کی حالت تو سب سے زیادہ خراب تھی۔ وہ منہ سے کچھ بولتے ہی نہیں تھے، ہسپتال میں ہوتے تو تسبیح کے دانے گراتے آنسو بہائے جاتے اور گھر جاتے تو ودیعہ کو مختلف مواقع پر ملی ٹرافیز اور شیلڈز کو دیکھ دیکھ کر روئے جاتے۔ وہ ان کے چہرے پر لکھا ہر دکھ پڑھ سکتا تھا۔

وہ کسی سے نہیں بولتے تھے۔ مگر جب وہ ان کے پاس جا کر بیٹھتا تو وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر، اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگتے تھے۔ وہ چند دنوں میں اتنے بیمار اور اس قدر نڈھال ہو گئے تھے کہ عمر کو ان کی صحت کی طرف سے سخت تشویش ہو رہی تھی۔

سب اپنے اپنے دکھوں میں اتنے نڈھال تھے کہ کسی ایک نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ودیعہ اس خبر پر کیسا ردعمل ظاہر کرے گی؟ وہ اس بات کو کس انداز میں قبول کرے گی؟ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ کہیں چلا جائے۔ وہ اس لمحے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لمحے کا جو کسی بھی وقت آنے والا تھا۔ اسے ہوش آ رہا تھا۔ ابا میاں، ممی، پاپا، عمر کچھ ہوش اور کچھ غنودگی کی کیفیت میں، کچھ سوتے اور کچھ جاگتے...... آنکھوں کے پپوٹے کھولنے کی کوشش کرتے، انہیں کچھ دیر کو کھولتے اور پھر بند کرتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کئی گھنٹوں سے اپنے سب پیاروں کے نام کبھی بے آواز کبھی آواز کے ساتھ پکار رہی تھی۔

''ابا میاں!'' وہ پوری طرح ہوش میں آ رہی تھی۔ اس کے حواس مکمل طور پر بیدار ہو رہے تھے۔ بیڈ پر اس کے دائیں طرف ابا میاں بیٹھے تھے۔ بائیں طرف کمال علی خان بیٹھے تھے اور نائلہ آنٹی سامنے کھڑی تھیں۔ وہ خود بھی ان کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ان تینوں لوگوں کو بہت سارا حوصلہ دلا کر بہت سمجھا کر یہاں لایا تھا، لیکن بظاہر بہادری سے مسکرا کر کھڑے ہونے کے باوجود اندر ہی اندر خود اس کے حوصلے ٹوٹ رہے تھے۔

''ابا میاں! ممی!'' اس نے بڑی مشکلوں سے آنکھیں کھول کر پکارا۔

نائلہ کمال جو عمر کے سمجھانے پر بہت دیر سے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ودیعہ کو آنکھیں کھولتا دیکھ کر ان کے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر روتے ہوئے وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ ودیعہ کی نظریں اپنے پاس بیٹھے ابا میاں پر جمی تھیں۔ انہوں نے اس کے ماتھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ مگر وہ کچھ بھی بول نہیں پا رہے تھے۔ جان سے عزیز پوتی پر آگہی کے اس قیامت خیز لمحے میں ان کی تمام ہمتیں اور ساری قوت گویائی ختم ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے چلتا ودیعہ کے پاس آگیا۔

''ابا میاں تمہارے پاس بیٹھے ہیں دیا! انکل بھی یہیں ہیں۔ آنٹی ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں سے گئی ہیں۔ وہ بہت تھک گئی تھیں نا۔ میں نے ان سے کہا کہ اب ہم تینوں یہاں ہیں، آپ گھر جا کر آرام کریں۔ میں نے ٹھیک کیا نا دیا؟''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، لہجہ بھی بڑا ہموار اور پر سکون تھا۔ اس میں دور دور تک کسی غم یا دکھ کی پرچھائیں تک نہیں تھی۔

''عمر......'' اس نے گردن قدرے ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی نگاہ عمر کے مسکراتے چہرے پر تھی۔

''تمہارا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا دیا! کتنا پریشان کیا ہے تم نے ہم سب کو۔ ابا میاں کی حالت دیکھو، تمہاری وجہ سے کتنے فکر مند ہیں۔ ذرا ہسپتال سے ڈسچارج ہو جاؤ پھر دیکھنا میں تم سے کتنا لڑوں گا۔''

وہ بوڑھا دادا اور وہ کمزور پڑتا باپ، کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ وہ بس اپنے آنسوؤں کو ضبط کر کے جبراً مسکرا رہے تھے۔ ودیعہ نے سینے سے اوپر تک چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ عمر کا جواب سن کر اس نے چونک کر بیڈ کو، اپنے ہاتھ میں پیوست سوئی کو اور اپنے اوپر پڑی چادر کو دیکھا۔

''ایکسیڈنٹ......؟'' اس نے ذہن پر زور ڈال کر جیسے سب کچھ یاد کرنا چاہا۔

''ہاں بھئی ایکسیڈنٹ، انکل ذرا بتائیں تو سہی ان محترمہ کو، کتنا ستایا ہے انہوں نے ہم سب کو۔''

اس نے جلدی سے ودیعہ کی توجہ انکل کی طرف مبذول کروائی کہ قیامت کا وہ لمحہ کچھ دیر کے لیے اور ٹل جائے۔ (دیا! اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اپنی جان دے کر بھی تمہیں اس دکھ سے بچالیتا)۔

ودیعہ کچھ الجھی ہوئی لیٹی تھی۔ وہ اب مکمل طور پر ہوش میں تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے یہ تو اسے پتا نہیں چل رہا تھا لیکن کچھ ہوا ضرور ہے، یہ اس کا دل یقیناً اسے بتا رہا تھا۔ اس نے چادر سے نکال کر اپنے دونوں ہاتھ دیکھے۔ پھر اس نے اپنے پیروں کو ہلانا چاہا۔ وہ لمحہ آپہنچا تھا۔

''عمر میرے پاؤں......؟'' ابا میاں اور کمال علی خان کی موجودگی کو فراموش کرتے ہوئے اس نے مضبوطی سے ودیعہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''کچھ نہیں ہوا دیا! تم بالکل ٹھیک ہو۔''

''نہیں، میرے پاؤں......'' اس نے جھنجھلا کر دوبارہ اپنے پیروں کو ہلانا چاہا۔ اس کا بایاں پیر بھی مکمل طور پر پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پٹیوں میں جکڑے ہونے کے سبب وہ اسے ہلا تو نہیں پا رہی تھی لیکن وہ اسے محسوس تو کر رہی تھی۔ اسے اپنا بایاں پاؤں محسوس ہو رہا تھا اور دایاں؟

''عمر میرا پیر I can't feel it! ابا میاں! میرا پیر......؟'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر زور سے چلائی۔ اس نے خود پر سے کھینچ کر چادر دور پھینک دی۔

''میرا پیر کہاں ہے؟'' وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ پیچھے کھڑی نرس بھی اسے سنبھالنے کو فوراً آگے بڑھی تھی۔

''دیا! میری بات سنو، دیکھو کچھ نہیں ہوا ہے؟'' وہ اسے آوازیں دے رہا تھا، مگر وہ کچھ سن نہیں رہی تھی۔

''میرا پیر کہاں ہے؟'' وہ اسے دھکے دے دے کر دور ہٹانے لگی۔ نجانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ روتے ہوئے جنونی انداز میں چلاتی وہ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ کمال علی خان آنسوؤں پر ضبط کے پہرے بٹھا کر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی سسکیاں پورے کمرے میں گونج رہی تھیں۔ اس کی چیخیں کوریڈور کے آخری سرے تک سنی جا رہی تھیں۔ آخر کار ڈاکٹر کو اسے انجکشن دینا پڑا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ ایک بار پھر غافل ہو چکی تھی۔ کمرے میں اب خاموشی تھی، اس کے چہرے، گردن اور ہاتھوں پر سے خون رس رہا تھا۔

نرس نے شاید اس کی اس طرف توجہ بھی دلائی تھی۔ اسنے بے دھیانی میں گم صم سے انداز میں اس کی بات سنی تھی۔ اس وقت اسے تنہائی چاہیے تھی۔ مکمل تنہائی۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں کوئی اسے جانتا نہ ہو۔ مگر آنکھیں بند کر کے اکھڑی اکھڑی سی سانسیں لیتے ابا میاں، سر جھکا کر آنسو ضبط کرتے، کمال علی خان اور باہر کوریڈور کے کسی کونے میں بیٹی کی چیخیں بن کر خود بھی چیخ چیخ کر رونے والی اس کی آنٹی، وہ ان لوگوں کو چھوڑ کر کیسے جائے۔ اسے ہمت کرنی ہے۔ بہادر بننا ہے۔ چیخ چیخ کر رونے کی اپنی خواہش کو اپنے اندر دبا کر وہ کمال علی خان کے پاس آیا۔ وہ نائلہ کمال کے پاس آیا، انہیں اپنی باتوں سے حوصلہ دیا۔ ان کے آنسو اپنی پوروں پر چنے، انہیں اپنے کندھے پر سر رکھ کر خوب کھل کر رونے دیا پھر ان دونوں کو ہسپتال میں چھوڑ کر وہ ابا میاں کو بمشکل راضی کر کے گھر لے آیا۔

اسے ان کی حالت سے سب سے زیادہ ڈر لگ رہا تھا۔ وہ لیعہ ان کے لیے کیا ہے وہ جانتا تھا، وہ ان کی جان ہے، وہ ان کی زندگی ہے، ساری دنیا میں جس سے وہ سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں وہ، وہ ہستی ہے۔ وہ نہ رو رہے تھے، نہ بول رہے تھے۔ اس نے بڑی مشکلوں سے زبردستی کر کے انہیں کھانے کے چند لقمے کھلائے۔ انہیں ان کی دوا کھلائی اور پھر جب وہ دوا کے سہارے غیر فطری نیند سو گئے تب وہ تھکے تھکے قدموں سے لاؤنج سے نکلنے لگا کہ اس کی بوا جی پر نظر پڑی۔ وہ جائے نماز پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ اسے سب یاد رہا اور وہ بوا جی کو بھول گیا؟ وہ ودیعہ کی آیا تھیں۔ وہ ان کی بیٹی نہیں مگر انہیں بیٹی ہی کی طرح عزیز تھی۔

اپنی کوتاہی پر شرمندہ ہوتا وہ بوا جی کے پاس آ گیا۔

''بوا جی! آپ نے کھانا کھایا؟'' انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''چلیے اٹھیے تھوڑا سا کھانا کھا لیجیے۔'' وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کرنے لگا۔

''عمر! میری بچی...... میں کھانا کیسے کھاؤں؟ میری بٹیا اس حال میں......'' وہ بھی اس کے مضبوط بازوؤں میں پناہ ڈھونڈتی بری طرح رونے لگی تھیں۔ بہت دیر بعد جب وہ انہیں چند نوالے کھلانے اور کچھ دیر نیند لے لینے پر آمادہ کرنے کے بعد باہر لان میں نکلا تو بہت رات ہو چکی تھی۔ رات کا وقت، اندھیرا، تنہائی، کئی دنوں کی گھٹن کے بعد اب اسے یہ سب میسر آئے تھے۔ بہادری، حوصلے اور ہمت کے تمام مصنوعی خول اس نے اتار کر دور پھینک دیے تھے۔

☆☆☆

''کیا حال ہیں جناب؟'' ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا مہکتا ہوا گلدستہ لیے وہ بڑے ہشاش بشاش موڈ میں کمرے میں داخل ہوا۔ ہنستا، مسکراتا اتنا خوش جیسے زندگی میں کہیں کوئی دکھ ہے ہی نہیں۔ گھستے ہی اس کا استقبال فرش پر دور دور تک بکھرے پھولوں اور کارڈز نے کیا تھا۔ یہ خوش نما پھولوں کے گلدستے اور یہ جلد صحت یابی کی دعاؤں سے آراستہ کارڈز یقیناً اس کے کولیگز، کزنز اور دوست اس کے لیے لائے تھے اور پھولوں سے بے تحاشا محبت کرنے والی لڑکی نے ان سب کو بے دردی سے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ عمر نے اس سے کچھ کہے بنا وہ سارے پھول اور کارڈز فرش پر سے سمیٹے۔ پھر وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے بیڈ کے بالکل قریب لے آیا۔ اور مطمئن سے انداز میں بیٹھ گیا۔

جب وہ اندر داخل ہوا، تب وہ خاموشی سے لیٹی چھت کو تک رہی تھی؟ لیکن عمر کو دیکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ان پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

اس طرح کہ جیسے وہ سونا چاہتی تھی۔ اس نے عمر کے خیریت پوچھنے کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ آج کل وہ سب کے ساتھ یہی کر رہی تھی۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتی تھی۔ کوئی آ کر اس کے پاس کتنی ہی دیر بیٹھ جائے اور کچھ بھی بولتا رہے۔ وہ یونہی خاموش لیٹی رہتی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد شروع کے چند دن وہ چلا چلا کر اور رو رو کر سارا ہسپتال سر پر اٹھاتی رہی اور اب یوں خاموش ہوگئی تھی گویا زندگی بھر کبھی بولے گی ہی نہیں۔ وہ کچھ کھا پی بھی نہیں رہی تھی۔ اور یہ بات سب سے زیادہ تشویش ناک تھی۔

''یہ دیکھو، میں تمہارے لیے کتنے خوبصورت پھول لایا ہوں۔''

جو سلوک وہ دوسرے پھولوں کے ساتھ کر چکی تھی وہ انہیں نظر انداز کر کے اسے اپنے لائے پھولوں کے بارے میں بتانے لگا۔ وہ ویسی ہی بے حس و حرکت آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی رہی۔ عمر اس کی لاتعلقی اور بیگانگی کو دیکھنے کے باوجود بیڈ کے برابر رکھی میز پر موجود گلدان میں اپنے لائے ہوئے پھول سجانے لگا۔

''آج میں تمہارے لیے بہت ساری کتابیں بھی لایا ہوں۔'' بڑا سا پلاسٹک بیگ اس نے بیڈ پر ودیعہ کے پاس ہی رکھ دیا۔

''سارے تمہارے فیوریٹ رائٹرز کی کتابیں ہیں۔ بتاؤ کون سی پڑھ کر سناؤں تمہیں؟ اور یہ دیکھو یہ رائٹر تو تمہارا پسندیدہ ترین ہے، میرا خیال ہے تم اسی کی کتاب سننا پسند کرو گی۔''

بہت سی کتابوں میں رکھی اس نے Forever اٹھالی اور اپنے ناول کا وہ حصہ اسے پڑھ کر سنانے لگا جو ودیعہ کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ وہ آہستہ آواز میں ہولے ہولے پڑھتا بھی جا رہا تھا اور کن انکھیوں سے اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ ہنوز بازو آنکھوں پر رکھے لیٹی تھی۔ لیکن اس کے گالوں پر بکھرے آنسو اس کے رونے کا پتا دے رہے تھے۔ عمر نے پڑھنا بند نہیں کیا، وہ پڑھتا رہا۔ اور وہ روتی رہی۔

اسی مدھم آواز میں پڑھتے پڑھتے وہ اس کی طرف ذرا سا جھکا اور اس کی آنکھوں پر رکھے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی بند تھیں اور ان سے ایک تواتر سے آنسو گر رہے تھے۔ یہ آنسو اس کے دل کو کس قدر اذیت پہنچا رہے تھے۔ پھر بھی اس نے انہیں صاف نہیں کیا۔ اس نے ہاتھ پر اپنی گرفت اور مضبوط کر دی۔ اتنی مضبوط جو اسے یہ یقین دلا سکے کہ وہ زندگی کے ہر موڑ پر اس کا ساتھ نبھائے گا۔ وہ صرف اس کے سکھوں کا نہیں بلکہ اس کے دکھوں کا بھی ساتھی ہے۔ وہ نرم و شیریں لہجے میں دھیرے دھیرے پڑھے جا رہا تھا۔

''محبت جن کے ساتھ ہوتی ہے وہ کبھی تنہا نہیں ہوتے، محبت انہیں کبھی تنہا ہونے نہیں دیتی۔''

''عمر......!'' اس پکار پر وہ پڑھتے پڑھتے ایک دم خاموش ہوا۔ وہ آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پہلے سے بھی زیادہ شدت سے بہہ رہے تھے۔

عمر نے کتاب بند کر کے جلدی سے میز پر رکھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہی تھی۔ اس نے اسے سہارا دے کر بیٹھنے میں مدد دی۔ وہ اس کی کمر کے پیچھے تکیہ لگانا چاہتا تھا کہ اس نے ایک دم ہی اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔ وہ اس کے ہاتھوں پر اپنا چہرہ رکھ کر زار و قطار رو رہی تھی۔

''میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا ہے؟؟''

''یہی تو میں سوچتا ہوں دیا۔ تمہارے ساتھ کیوں، میرے ساتھ کیوں نہیں؟ اگر یہ حادثہ ہونا ہماری تقدیر میں تھا تو میرے ساتھ ہو جاتا۔''

وہ سوچتا رہا۔

''میرے جسم کا ایک حصہ کاٹ کر پھینک دیا گیا عمر، مجھ سے پوچھے بغیر، مجھے بتائے بغیر۔''

وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اور وہ اس کے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی رہی، اس کے آنسوؤں سے اس کی ہتھیلیاں پوری کی پوری بھیگ چکی تھیں۔

''میں اب بھی پہلے کی طرح چل نہیں سکوں گی۔ کیوں عمر کیوں؟''

کرب کی انتہا پر پہنچا وہ اسے بلک بلک کر روتا دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کیوں کا کیا جواب دے۔

''وہ ہماری شادی کا دن تھا نا عمر؟ میں اس دن کتنی خوش تھی۔ میں نے سوچا تھا اس دن میں تمہیں اپنے دل کی وہ تمام باتیں بتاؤں گی جو کبھی تم سے کہی نہیں ہیں۔ میں تمہیں بتاؤں گی کہ جس طرح تم مجھ سے محبت کرتے ہو یہ کہتے ہو کہ تم میرے لیے کبھی نہیں بدلو گے بالکل اسی طرح میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں اور میں بھی تمہارے لیے کبھی نہیں بدلوں گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتاؤں گی کہ جب تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ تم صرف میرے لیے لکھتے ہو تو تمہارا یہ کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ میں بہت معتبر ہو جاتی ہوں۔ میں خود کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی سمجھتی ہوں۔ سب سے خوش قسمت لڑکی جسے کوئی اتنی شدت سے چاہتا ہے۔''

کرب اور اذیت سے اسے دیکھتا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کیا؟ تسلی دینے کے لیے ادا کیا جانے والا ہر فقرہ بے معنی اور رسمی لگ رہا تھا۔

''میری مہندی عمر......! میری مہندی...... تم نے تو وہ دیکھی بھی نہیں۔ اتنا گہرا رنگ چڑھا تھا میری مہندی کا۔ اتر گیا وہ رنگ، مٹ گئی میری مہندی۔'' روتے روتے اس نے خود ہی اس کے ہاتھوں سے اپنا چہرہ اٹھا لیا۔

''مہندی پھر لگ جائے گی دیا! پھر سے تمہاری مہندی کا رنگ اتنا ہی گہرا چڑھے گا۔ تم خود کو سنبھالو تو سہی۔ دیکھو سب تمہارے لیے کتنے پریشان ہیں، دیکھو سب تمہارے لیے کتنے سارے پھول لائے ہیں اور تم نے انہیں اتنی بے رحمی سے پھینک دیا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میری دیا! کبھی پھولوں اور محبتوں کو پھینک بھی سکتی ہے۔''

اس نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے آہستگی اور نرمی سے بولا۔

''ہاں، میں نے انہیں پھینک دیا تھا عمر! یہ پھول اور یہ محبتیں کیا مجھے میرے جسم کا وہ کھویا ہوا حصہ لوٹا سکتے ہیں؟ میری ٹانگ عمر...... میری ٹانگ...... میں اپنی ایک ٹانگ سے محروم کر دی گئی ہوں اور تم کہتے ہو میں پھولوں کو دیکھ کر خوش ہوں۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ مجھے دنیا کی ہر چیز بری لگ رہی ہے۔

''کیا میں بھی؟'' ہذیانی انداز میں چلاتی وہ اس سوال پر یک دم خاموش ہو گئی۔ عمر نے اس کا چہرہ ابھی بھی اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔

''میں تمہیں کبھی برا نہیں لگ سکتا۔ مجھے پتا ہے۔'' اس نے آہستہ سے ودیعہ کے چہرے کے اس زخم پر ہاتھ رکھا جواب پہلے سے بہت بہتر تھا۔

''ہمیں اس دکھ کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑے گا دیا! سمجھوتا کرنے کے سوا ہمارے پاس اور کوئی چوائس نہیں۔ پلیز دیا! ہمت کرو، اپنے لیے نہ سہی میرے لیے۔ مجھے میری وہی دیا لوٹا دو ہمت والی، حوصلے والی، مسکراہٹوں، خوشیوں اور زندگی کی باتیں کرنے والی، میری مایوسیوں پر مجھے حوصلہ دلانے اور میری ہمت بندھانے والی۔ یہ مایوسیوں اور ناامیدوں کی بات کرتی، روتی لڑکی میری دیا نہیں، یہ تو کوئی اور ہے۔ مایوسیوں کی باتیں تو عمر حسن کیا کرتا تھا، ودیعہ کمال نے تو کبھی نہیں کیں۔''

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی اس کی باتیں سن رہی تھی۔ عمر نے اس کے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹا لیے اور ایک دم ہی بیڈ سے اٹھ گیا۔

''کھانا کھاؤ گی نا؟'' وہ نفی میں سر ہلا کر ''نہیں'' کہنے والی تھی لیکن اس نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

''نیچے گارڈن میں مجھے آنٹی اور انکل ملے تھے۔ کتنا تنگ کر رہی ہو تم انہیں۔ آنٹی کہہ رہی تھیں، ودیعہ نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ آنٹی اتنے مزے کا لنچ تمہارے لیے خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی ہیں اور تم نخرے دکھا رہی ہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔''

وہ اسے نظر انداز کر کے خود ہی بولتا ہوا میز پر رکھے لنچ باکس کو کھول کر دیکھنے لگا۔

''ارے واہ سلاد، سوپ اور اسپیگیٹیز۔ جلدی سے بتاؤ کیا کھاؤ گی؟''

اسپیگیٹیز پلیٹ میں نکالنے سے پہلے اس نے جواب طلب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اسے بضد دیکھ کر اس نے گردن اقرار میں ہلا دی۔ اس نے کانٹے میں اسپیگیٹیز پھنسا کر نوالہ ودیعہ کی طرف بڑھایا تو وہ کانٹا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔

''میں خود کھا لوں گی عمر! تم نے بھی تو لنچ نہیں کیا۔'' وہ جواباً مسکرایا۔ وہ نارمل ہو رہی تھی، خود بھی کھانا کھانے کے لیے تیار تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کے لیے بھی فکرمند ہو رہی تھی۔

وہ کھانے کے دوران اس کی ان اوٹ پٹانگ باتوں پر مسکرا رہی تھی۔ وہ دونوں تقریباً پوری پلیٹ خالی کر چکے تھے، جب کمرے کا دروازہ کھول کر کمال اور نائلہ اندر آئے۔ ودیعہ کو بیٹھا دیکھ کر اس کے ہاتھ میں پلیٹ دیکھ کر ان کے پژمردہ اور مایوس چہروں پر بے ساختہ طمانیت سے بھری بھرپور مسکراہٹ ابھری۔

''ایسے ہی آپ کہہ رہی تھیں آنٹی! کہ ودیعہ کھانا نہیں کھا رہی۔ یہ ندیدی تو ساری کی ساری پلیٹ صاف کر گئی۔ مجھے تو صرف چکھنے کے لیے تھوڑی سی اسپیگیٹیز ملیں۔'' وہ دونوں مسکراتے ہوئے ان کے قریب آ گئے۔ نائلہ ودیعہ کے پاس بیڈ پر بیٹھ گئیں اور کمال علی خان بیڈ کے قریب رکھی اسی کرسی پر جو عمر نے ان کے لیے خالی کی تھی، وہ خود سامنے صوفے پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ ودیعہ نے اپنا سر ماں کے کندھے سے ٹکا دیا تھا۔

☆☆☆

وہ پورا ایک مہینہ ہسپتال میں رہی تھی اور اس تمام عرصہ میں وہ اس کے ساتھ رہا تھا۔ ہسپتال، گھر اور گھر سے باہر کی ہر ذمہ داری اس نے اپنے ذمے لی ہوئی تھی۔ اسے دن بھر میں ہسپتال سے گھر اور گھر سے ہسپتال تک کے دس چکر بھی لگانے پڑتے تو با خوشی لگاتا۔

ہسپتال میں جب وہ ودیعہ کے ساتھ ہوتا تو کبھی اسے کتابیں پڑھ کر سناتا، کبھی وہ اس کے ساتھ لڈو یا کارڈز کھیلتا، کبھی وہ دونوں ساتھ بیٹھ

کر میوزک سنتے اور کبھی وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر کی پر لطف اور دلچسپ سی باتیں کیا کرتا۔ ودیعہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ فزیوتھراپسٹ اور آرتھوپیڈک سرجن سب اس کی طرف سے مطمئن تھے۔ وہ لمحات بڑے قیامت خیز تھے جب ودیعہ کو بیساکھی کے سہارے چلنے کی مشق کروائی گئی تھی۔ بیساکھی ہاتھ میں لے کر اس نے چلنے کے لیے قدم اٹھایا تو اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے کرتے وہ ہار گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ وہ اس پل اس کے بالکل پاس تھا۔ عمر نے چلنے کی مشق کرنے میں اس کی مسلسل مدد کروائی تھی، جہاں وہ لڑکھڑانے لگتی، رونے لگتی، وہ اسے سنبھال لیتا۔ آئینے میں اپنے ادھورے وجود کو دیکھ کر جب وہ گھنٹوں روتی تھی، وہ تب بھی اس کے پاس ہوتا تھا۔

پھر وہ ہسپتال سے گھر واپس آ گئی۔ عمر کا بس چلتا تو وہ چوبیس گھنٹے اس کے سرہانے بیٹھا رہتا، لیکن اسے نارمل زندگی کی طرف لانے کے لیے، بہت ضروری تھا کہ وہ سب لوگ اس کے ساتھ نارمل سلوک کریں۔ اپنے اپنے معمولات زندگی میں اسی طرح مگن ہو جائیں جیسے پہلے تھے۔ سب نے اسے مان بھی لیا تھا سوائے نائلہ کے۔ وہ اب اپنے ہسپتال نہیں جاتی تھیں، وہ اب سارا وقت گھر پر رہتی تھیں۔

''نہیں جانا مجھے ہسپتال، نہیں کرنا کوئی ڈاکٹری۔ اپنے اسی پروفیشن کی خاطر ہمیشہ اپنی بیٹی سے دور رہی۔ اس کی زندگی کے کتنے اہم موقعوں پر میں اس کے پاس نہیں تھی۔ کیا دیا میرے اس پروفیشن نے مجھے؟ جب میری بیٹی کو میری ضرورت پڑی تب میری کوئی ڈاکٹری، کوئی قابلیت، کوئی علم اور کوئی تجربہ اس کے کام نہ آ سکا۔ میں نہ اچھی ماں بن سکی نہ اچھی ڈاکٹر۔ میں کچھ بھی اچھی نہیں بن سکی عمر! میں کچھ بھی اچھی نہیں بن سکی۔''

ماں کے دل پر جو گھاؤ لگا تھا اسے بھرنے میں ابھی بہت وقت لگنا تھا۔ عمر کے لیے یہی غنیمت تھا کہ ابا میاں اور کمال علی خان نے اس کی بات مان لی ہے۔ ابا میاں، ودیعہ سے گھنٹوں بیٹھ کر دنیا جہان کے موضوعات پر باتیں کرتے۔ انہوں نے اپنے ملاقاتیوں سے پہلے کی طرح ملنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اپنی اسٹڈی میں بیٹھ کر کسی لغت کی تیاری کا اپنا علمی اور تحقیقی کام بھی دوبارہ شروع کر دیا تھا لیکن عمر جانتا تھا وہ اندر ہی اندر گھل رہے ہیں۔ وہ اس حادثے کے وقت جتنا روئے تھے، رو لیے تھے۔ اب بالکل نہیں روتے تھے۔ انہوں نے اپنا سارا دکھ، سارا غم اپنے اندر چھپا لیا تھا۔

عمر ہر وقت ودیعہ کے ساتھ رہ کر اسے اس کے ادھورے پن کا تکلیف دہ احساس نہیں دلانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ ہر وقت اس پر مسلط نہ رہے تاکہ اکیلے رہ کر وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے، آرام سے کر لے مگر وہ جب اسے اکیلا چھوڑتا وہ تنہا بیٹھ کر گم صم سے انداز میں نجانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ اسے ان سوچوں سے بچانے کے لیے عمر نے اسے پھر سے آرٹیکلز لکھنے کی طرف راغب کیا۔ وہ فی الحال اپنی جاب پر واپس نہیں جا سکتی تھی تو کم از کم لکھنے میں تو خود کو مصروف کر سکتی تھی۔

''اپنی جاب میں مصروف ہو کر تم نے لکھنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا دیا! دوسروں کے لکھے کی قطع و برید کرنا بھی دلچسپ کام ہے مگر خود لکھنا بھی تو کم دلچسپ نہیں پھر آج کل تمہارے پاس فرصت بھی ہے، لکھ ڈالو مہنگائی کے خلاف، حکمرانوں کے ظلم، سیاست دانوں کی مکاریوں کے خلاف، بیوروکریسی کے خلاف، ظلم اور ناانصافی کے خلاف۔''

اس نے بڑی روانی سے ودیعہ کو اس کے پسندیدہ موضوعات بتائے۔ ودیعہ نے اس کا مشورہ قبول کر لیا تھا، وہ لکھنے لگی تھی۔ اب جب وہ اکیلی ہوتی یا کچھ پڑھ رہی ہوتی یا کچھ لکھ رہی ہوتی تو اس کا سارا وقت لکھنے، پڑھنے یا پھر اپنی عیادت کے لیے آنے والوں سے ملنے میں گزرنے لگا

تھا۔ وہ ایک دم ہی پھر سے مصروف ہوگئی تھی اور کمال اور نائلہ اسے مصروف اور مگن دیکھ کر مطمئن سے ہوگئے تھے۔ وہ ابا میاں کے ساتھ اپنے آرٹیکلز کے موضوعات کو ڈسکس کرتی، وہ انہیں اپنا لکھا ہوا پڑھواتی۔ وہ اس کے آرٹیکلز کو ٹائپ کرنے اور انہیں متعلقہ اخباری دفاتر تک خود جا کر پہنچانے یا پوسٹ کر کے آجانے والا کام کرنا چاہتا تھا مگر ودیعہ نے اپنے پہلے ہی آرٹیکل کو خود ٹائپ کر لینے کے بعد عمر کی اسے اخبار کے دفتر تک پہنچانے والی پیشکش کے جواب میں انکار کر دیا تھا۔

وہ اس انکار پر حیران رہ گیا۔ شاید حیرت کے ساتھ کچھ ملال بھی اس کے چہرے پر بکھرا تھا، تب ہی وہ فوراً وضاحتی انداز میں بولی۔

"مجھے غلط مت سمجھو عمر! میں تمہاری مدد اپنی زندگی کے ہر معاملے میں لے لوں گی مگر اس روز جب مجھے ایسا لگے گا کہ اب میں خود کچھ نہیں کر سکتی۔ دونوں ٹانگوں پر چلتی، اپنے مکمل وجود کے ساتھ زندگی گزارتی ودیعہ کمال جس طرح زندگی کے ہر میدان میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا کرتی تھی، کیا اس مکمل وجود کے بغیر ایک کمی کے ہوتے کچھ کرنے کے قابل ہے بھی یا نہیں؟ جس روز میرے پاس اس سوال کا جواب نفی میں آیا، جس روز میں ہار مان گئی، اس روز میں تم ہی سے مدد مانگوں گی عمر! صرف تم سے۔"

"جس روز وہ ہار جائے؟"

وہ اسے ہارتا ہوا کس طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس نے خدا سے دعا مانگی کہ ودیعہ کمال زندگی میں کبھی، کہیں، کسی جگہ پر نہ ہارے۔

☆☆☆

کرشن چندر کے بہترین افسانے

کرشن چندر کے بہترین افسانے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے افسانوں پر مبنی ہے۔ اس کتاب میں اُن کے افسانے، بربے پھنسے، زندہ نوادر، نیوٹرل زون، ٹمپریچر، پرنس فیروز، تائی ایسری، جامن کا پیڑ، بھیا جی، ساجھے کا مردہ، ملکہ کی آمد، داتن والے، جوتی لکیساں، شنو، خوشی، جینگ جینگ فلنگ، آؤ مر جائیں، ٹیکسی ڈرائیور، کچرا بابا، تنہائی کا پھول، سپاہی۔ کرشن چندر نے بمبئی فلم انڈسٹری کے لئے بھی کام کیا جہاں انہیں فلم نگری کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اپنے انہیں مشاہدات کو بنیاد بنا کر انہوں نے اپنا مشہور ناول "چاند کا گھاؤ" لکھا جو کہ بمبئی فلم انڈسٹری کی ہی کہانی ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ کشمیر میں بھی گزارا اسلئے ان کے کچھ ناولوں کا پس منظر کشمیر کے زندگی پر مشتمل ہے۔

ودیعہ کو ہسپتال سے گھر آئے ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا۔ جو روگ زندگی بھر کے لیے اسے لگا تھا، وہ تو لگ چکا تھا۔ اس ادھورے پن کے ساتھ تو اب اسے ساری زندگی گزارنی تھی، مگر اس کے علاوہ باقی، وہ اب ہر طرح سے ٹھیک تھی۔ وہ سفر کر سکتی تھی۔

اسی لیے عمر اب ابا میاں سے شادی کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے لندن واپس جانا تھا، وہاں بہت سے کاموں کا حرج ہو رہا تھا۔ جان بکھم اور الزبتھ اولیور مسودہ کے لیے کئی بار اسے فون کر چکے تھے۔ وہ اس کی دوسری کتاب جلد از جلد چھاپنا چاہتے تھے۔ وہ کالج سے جتنی رخصت لے کر آیا تھا، وہ وقت تو کب کا گزر بھی چکا تھا۔ اب اسے جلد سے جلد لندن واپس جانا تھا اور اسی لیے وہ ابا میاں سے شادی کی نئی تاریخ رکھنے کی بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن وہ جانتا نہیں تھا کہ جن سے وہ اپنی شادی کی نئی تاریخ رکھنے کی بات کرنے والا ہے، وہ نہ اس کی شادی کی نئی تاریخ رکھ پائیں گے اور نہ اس میں شرکت کر پائیں گے۔ اتنے چپ چاپ، اتنی خاموشی سے انہوں نے آنکھیں بند کی تھیں کہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ کوئی یوں بھی جا سکتا ہے۔

عمر کے ہاتھ سے پانی پی کر، ودیعہ سے باتیں کرتے کرتے، انہوں نے کلمہ پڑھا تھا۔ ایسی موت جس کی لوگ تمنا کرتے ہیں۔ چلتے ہاتھ پیر نہ کسی سے خدمت لی، نہ تیمارداری کروائی۔ آخری وقت تک اپنا ہر کام اپنے ہاتھوں سے خود کرتے ہوئے۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آتی ہے۔ ان کی موت کا بھی وہی وقت مقرر تھا مگر اتنا دکھ ساتھ لے کر، جسے دلہن بنا دیکھنے کی برسوں سے چاہ تھی، اسے اس روپ میں دیکھے بغیر؟ انہیں شاد اور آباد دیکھ کر خوش اور مطمئن اس دنیا سے رخصت ہوتے تو ان کے جانے کا غم سہنا آسان ہو جاتا مگر اب...... اب یہ غم سہنا برداشت سے بہت زیادہ لگ رہا تھا۔ آنکھیں بند کر کے گہری نیند سوئے اس بارعب اور پروقار جھریوں بھرے چہرے کو وہ اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔

وہ یتیم پیدا ہوا تھا مگر آج حقیقی معنوں میں وہ یتیم ہو گیا تھا۔ اس کے سر پر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔

اس نے جھک کر ان کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا، ان کے جنازے میں شرکت کے لیے اتنے بے شمار اجنبی چہرے آئے تھے، جنہیں کمال، نائلہ، عمر اور ودیعہ میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ بری طرح دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے، وہ اجنبی چہرے۔ وہ لاتعداد اجنبی افراد جو بری طرح روتے ان سب سے تعزیت کا اظہار کر رہے تھے۔ یہ لوگ ان میں سے اکثر کو نہیں جانتے تھے۔

عمر ڈبڈبائی آنکھوں سے ان روتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ نجانے ان میں سے کس کس کی وہ خفیہ طریقے سے کیا کیا مدد کیا کرتے تھے۔ ان میں سے کس کس کی زندگی کا وہ آسرا تھے۔ انہیں لحد میں اتارتے وقت عمر حسن یہ جانتا تھا کہ وہ اس دنیا سے اپنے سینے میں ایک غم ساتھ لیے ضرور گئے ہیں مگر وہاں اس ابدی زندگی میں، اس لافانی جہان میں ان کے لیے آسانیاں ہی آسانیاں تھیں، سکھ ہی سکھ تھے کہ ان کی نجات اور بخشش کا ذریعہ صرف عمر حسن ہی نہیں نجانے کون کون بننے والا تھا۔

☆☆☆

"ودیعہ کی زندگی کے جس ادھورے پن کا غم اپنے سینے میں لے گئے ہیں، میں اس ادھورے پن کو ختم تو نہیں کر سکتا، میں اسے اس کا وہ مکمل وجود لوٹا تو نہیں سکتا مگر میں، عمر حسن...... آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں ابا میاں، کہ ودیعہ کی زندگی میں اتنی خوشیاں بھر دوں گا، اتنی خوشیاں کہ اپنی

زندگی کی اس کمی کی طرف دھیان دینے کی اسے فرصت تک نہیں ملے گی۔ جسمانی طور پر وہ نامکمل ہوگی، ادھوری ہوگی مگر روحانی طور پر نہ میں اسے نامکمل رہنے دوں گا اور نہ ادھورا۔ اس کمی کے ہوتے ہوئے بھی میں اس کی زندگی میں کوئی کمی نہیں رہنے دوں گا۔''

یہ وعدہ عمر حسن نے اپنے ابا میاں کی روح کے ساتھ کیا تھا۔

سب صدمے سے نڈھال تھے اور عمر کا سینہ، اس کے شانے، اس کی بانہیں سب کے غم سمیٹنے کو تیار، وہ خود کتنا دکھی ہے، وہ خود کتنا رونا چاہتا ہے یہ جب وہ بالکل اکیلا ہوتا تب تھوڑی سی دیر کے لیے سوچا کرتا۔ ورنہ اکیلے میں بھی اسے کمال، نائلہ، بوا جی اور سب سے بڑھ کر ودیعہ کی فکر لگی رہتی۔

اپنی زندگی کے اتنے بڑے سانحہ کے بعد ابا میاں کی دائمی جدائی کا غم، وہ اس کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ وہ اس کا درد محسوس کر سکتا تھا، لیکن اسے ودیعہ کے ساتھ ساتھ گھر کا بیٹا بن کر دکھانا تھا، اس نے کمال علی خان اور نائلہ سے ان کے تمام تفکرات اور پریشانیاں لے لی تھیں۔ گھر کے ہر کام کی ذمہ داری اس نے اپنے اوپر لے لی تھی۔ نائلہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بار ہا کہتیں۔

''عمر! خدا نے تم جیسا بیٹا دے کر بیٹا نہ ہونے کے میرے سارے گلے دور کر دیے عمر! تم اتنے پیارے بیٹے ہو جس پر ہر ماں فخر کرے۔''

ودیعہ، ابا میاں کے انتقال پر بہت روئی تھی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ نجانے اسے کیا ہونے لگا۔ اس کے مزاج میں عجیب سی تبدیلی آنے لگی۔ اس نے رونا چھوڑ دیا، اس نے بولنا چھوڑ دیا۔ اس نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس نے اپنے کمرے سے نکلنا چھوڑ دیا۔ وہ جس صدمے سے گزر رہی تھی اس سے سب ہی واقف تھے۔ ابھی تو وہ اپنے ادھورے پن کے ساتھ پوری طرح سمجھوتا نہیں کر پائی تھی کہ ابا میاں یوں چلے گئے۔

ایک کے بعد ایک آنے والے ان دکھوں نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے یہ عمر بھی جانتا تھا اور باقی سب بھی۔ سب اس سے باتیں کرتے، اس کا دل بہلانے کے جتن کرتے، مگر وہ جیسے بہلنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ اس کا جی چاہتا تو کسی کی بات کا کوئی جواب دے دیتی ورنہ بولنے والا گھنٹوں بیٹھ کر بولتا رہتا اور وہ ہونٹوں پر چپ کی مہر لگائے ساکت بیٹھی رہتی۔

پھر اس کے اس مزاج میں مزید تبدیلی آئی۔ وہ بات بات پر تلخ ہونے لگی۔ معمولی معمولی باتوں پر وہ غصے میں آ جاتی اور اپنے غصے کا اظہار ان لفظوں میں کرتی جو اس کی شخصیت کا حصہ کبھی نہیں رہے تھے۔ وہ کمال اور نائلہ سے، عمر سے، بوا جی سے، دیگر ملازمین یہاں تک کہ اپنی خیر وعافیت دریافت کرنے کے لیے آئے ہوئے اپنے کولیگز، دوستوں اور کزنز کے ساتھ بھی بدمزاجی کا مظاہرہ کرنے لگی۔ سب اس کے مزاج کی اس تبدیلی سے بے انتہا پریشان تھے۔ عمران سب کو دلاسا دیتا۔ یہ تلخی اور بدمزاجی بہت سے صدمات کا ردعمل ہے۔ مگر بے وقتی۔ وہ بہادر لڑکی بہت جلد اس وقتی کیفیت سے باہر نکل آئے گی۔ وہ ان سب کو متفکر دیکھ کر یقین دلایا کرتا۔ سب کو تو یقین دلا کر مطمئن کر دیا کرتا مگر خود اندر سے وہ بہت پریشان تھا۔

وہ اس لڑکی کو اتنا زیادہ جانتا تھا جتنا وہ خود اپنے آپ کو نہیں جانتی تھی۔ وہ اس کی تلخیوں اور بدمزاجیوں کی دوسروں کو جو بھی دلیل دے دے، مگر خود اس کا دل اندر ہی اندر یہ کہتا کہ ودیعہ ہسپتال میں اور ہسپتال سے آنے کے بعد گھر میں اتنے دنوں سے خود کو نارمل صرف اور صرف ابا میاں کی خاطر ظاہر کرتی رہی تھی۔ اور اب جب وہ نہیں رہے تھے تب اسے کسی کی بھی خاطر مجبوراً کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کی بدمزاجی کو دیکھتے ہوئے اس کے کولیگز اور کزنز نے اس کے پاس آنا بتدریج کم کرتے کرتے تقریباً ختم کر دیا تھا اور اسے جیسے کسی

کے آنے یا نہ آنے سے کوئی فرق پڑتا ہی نہیں تھا۔ وہ جانتے بوجھتے خود کو تنہا کر رہی تھی اور یہ تمام صورت حال عمر کے لیے بے انتہا تشویش ناک تھی۔

وہ اپنی تشویش اور پریشانیوں کو اپنے اندر ہی چھپائے اس کے پاس معمول کے انداز میں جاتا، اس سے باتیں کرتا، اس کی کڑوی کسیلی باتیں مسکراتے ہوئے سنتا، وہ ان دنوں سب ہی کے ساتھ تلخ تھی مگر عمر کے ساتھ یہ چڑ چڑا پن، بدمزاجی اور تلخی سب سے زیادہ تھی۔

وہ اس کے پاس جاتا تو بیزاری کا اظہار کرتی، وہ اس سے باتیں کرتا تو اکھڑے اکھڑے انداز میں جواب دیتی۔ وہ اس کی اس بیزاری اور چڑ چڑے پن کی پروا کیے بنا اس کے پاس اسی طرح آتا، اسی طرح بیٹھتا، اسی طرح باتیں کرتا، پھر اس روز وہ اس کے پاس آیا تو وہ بہت خوش تھا۔

ودیعہ کی بدمزاجی اور چڑ چڑے پن کو ختم کرنے کی دوا اس کے پاس لندن سے جان بلہم نے بھیج دی تھی۔ اس کے موڈ کو بحال کرنے کی کوششیں کرتا پریشان ہو رہا تھا کہ مسئلہ اپنے آپ حل ہو گیا۔ جان بلہم نے اسے مسودہ جلد از جلد بھجوانے کا ناراضی اور خفگی سے ملا جلا خط لکھنے کے ساتھ اپنے پاس آئے عمر کے بے شمار مداحوں کے خطوط بھی...... ساتھ ہی ارسال کر دیے۔

''میرا نہیں تو اپنے چاہنے والوں ہی کا خیال کر لو۔''

عمر اس کی چالاکی پر مسکرایا تھا۔ ایڈیٹرز اور پبلشرز سے بہتر یہ بات کون جانتا ہے کہ رائٹرز سے لکھوانے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ری چارج کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ان کی تعریفیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ ان خطوط کو دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ اپنے چاہنے والوں کی محبتوں پر سرشاری سے مسکرایا تھا۔ بہت دنوں بعد کہیں سے خوشی کی کوئی خبر زندگی میں آئی تھی۔ مگر زیادہ خوش وہ ودیعہ کا سوچ کر ہوا تھا۔ اب وہ اس کا موڈ ٹھیک کر سکتا تھا، اسے خوش کرانے مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دینے والا جادوئی کرشمہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔

عمر کے لکھے کی تعریفیں ہوں، اس کے قصیدے پڑھے جائیں اور ودیعہ خوش نہ ہو، ایسا ہونا ناممکن تھا۔

''مس ودیعہ کمال! اب آپ زیادہ دیر منہ پھلا کر اور مجھے اگنور کر کے بیٹھی نہیں رہ سکیں گی۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ وہیل چیئر پر رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر اس نے قلم رکھ دیا اور حسب معمول بے تاثر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ خوشی اور جوش میں بھرا کرسی گھسیٹ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔

''دیکھو دیا! جان بلہم کی چالاکی۔ ویسے میرا خیال ہے اسے یہ مشورہ الزبتھ یا نینسی نے دیا ہوگا۔'' وہ اسے خط دکھانے لگا مگر جب اس نے انہیں دیکھنے میں کوئی دلچسپی نہ لی تو وہ اسے پڑھ کر سنانے لگا۔ وہ بغیر کسی جوش و خروش کے اسے سننے لگی۔ وہ ایک ایک کر کے تمام خطوط پڑھ رہا تھا۔ ہر خط پڑھنے کے بعد وہ اسے ودیعہ کے ہاتھ میں پکڑا دیتا۔ وہ اسے بے دلی سے پکڑ لیتی مگر اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالتی۔ ہر خط کی ہر سطر پڑھنے کے بعد وہ ودیعہ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتا۔ اب اس کے لبوں پر مسکان آئے گی۔ اب اس کی آنکھیں خوشی سے جھلملائیں گی۔ مگر اس کے لبوں پر نہ مسکان آ رہی تھی نہ آنکھوں میں کوئی خوشی۔

اس کے لبوں پر چپ تھی اور آنکھوں میں بے زاری اور کوفت یوں جیسے وہ اسے ایک ایسی چیز زبردستی سنا رہا ہے جس سے اسے کوئی رغبت نہیں۔

''یہ خط سنو دیا! اس لڑکی کی باتیں سن کر تم ضرور جیلس ہوگی۔ ناول پسند کرتے کرتے اس نے تو مجھ ہی کو پسند کرنا شروع کر دیا۔ لکھا ہے

روز رات میں آپ کی تصویر دیکھ کر اور آپ کی کتاب اپنے سرہانے رکھ کر سوتی ہوں۔''

وہ ویسی ہی بے حس سی بیٹھی رہی۔

''تم کسی بھی خط سے خوش نہیں ہوئیں دیا! اتنی ساری تعریفیں ہو رہی ہیں میری اور تمہیں خوشی نہیں ہو رہی؟''

''ہوں.....'' اس کی یہ ہوں جیسے ایک خوشی کا اظہار تھی۔

''جان بکہم کا خط تو میں نے تمہیں سنایا ہی نہیں۔ بہت ناراضی کا اظہار کیا ہے اس نے میرے مسودہ اب تک نہ بھیجنے پر۔''

اس کے دل پر اندر ہی اندر کیا گزر رہی تھی یہ ظاہر کیے بغیر وہ اسے جان بکہم کا خط پڑھ کر سنانے لگا۔ اسے لگا اس خط کے سنتے ہی ودیعہ وہی ودیعہ بن جائے گی اس کی ساری بیزاری اور لاتعلقی ختم ہو جائے گی۔ وہ اس سے لڑے گی، اسے سست اور کاہل قرار دے گی۔

''ہو گئے سارے خط؟'' عمر کے چہرے پر نظریں جمائے اس نے بے تاثر سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں.....'' اس کے لبوں سے بہت مری مری آواز نکلی۔

''میں اپنا کچھ ضروری کام کر رہی تھی۔''

سرد اور سپاٹ لہجے میں اس نے اپنی فائل کی طرف اشارہ کیا اور میز پر رکھا قلم واپس اٹھانے لگی، اس نے بے یقینی سے ودیعہ کو دیکھا اور پھر وہ وہاں سے مردہ قدموں سے چلتا اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ بہت دیر اکیلا بیٹھا ودیعہ کے رویے پر دکھی ہوتا رہا پھر ایک دم اسے ایک احساس ہوا۔ ''یہ میں کس کے رویے پر دکھی ہو رہا ہوں؟ ودیعہ کے، وہ جو خود اتنے دکھ اٹھا رہی ہے؟'' وہ فوراً ہی صوفے پر سے اٹھا۔

اس کے کسی بھی رویے پر دکھی ہونے سے پہلے یہ تو سوچ لینا چاہیے کہ وہ کس کرب سے گزر رہی ہے۔ ایک کمی، ایک بہت بڑی کمی سہہ رہی ہے اور میری محبت بھی اس کی اس کمی کو دور نہیں کر سکتی۔

''بس یہ ہے تمہاری محبت؟ صرف اتنی؟ اس نے تمہارے لکھنے پر، تمہارے لکھے کی تعریفوں پر پہلے جیسی خوشی کا اظہار نہیں کیا اور تم نے دل میں درد بٹھا لیا، اس کے درد کو محسوس کیے بغیر۔ وہ ودیعہ کے رویے پر چند لمحوں کے لیے دکھی ہوا تھا مگر ان چند لمحوں کی سزا اس نے پوری شام اور پوری رات اپنے آپ کو دی۔ وہ اپنے کمرے میں بند کیا کر رہا ہے، کوئی جانتا نہیں تھا اور وہ پوری شام اور پوری رات اپنے سارے کام صرف الٹے پیر کے ذریعے کرتا رہا۔ رات گئے جب وہ ایک ٹانگ کی مدد سے بیڈ پر لیٹا تو اس نے اپنی سزا اب بھی ختم نہ کی۔ وہ سویا نہیں لیکن لیٹا وہ صرف ایک ٹانگ سیدھی کر کے۔ رات بھر اس نے جب جب کروٹ بدلی تو صرف الٹے پیر کو استعمال کیا۔

''دیا! تمہاری یہ تکلیف میں تم سے کیسے لوں؟ صبح، شام، دن، رات اپنی زندگی کے ہر پل میں جو درد تم سہہ رہی ہو، وہ سارا کا سارا مجھے مل جائے۔ کاش، کاش میں ایسا کر پاتا۔'' صبح تیار ہوتے وقت جب اس نے الٹے پیر کے بعد اپنے سیدھے پیر میں جوتا پہننا چاہا تو کتنی دیر تک وہ اپنے سیدھے پیر کے انگوٹھے، انگلیوں، ایڑی اور تلوے کو گھورتا رہا پھر ایڑی اور انگلیوں سے ہوتی اس کی نگاہیں پنڈلی اور پھر اوپر ہوتی ہوئی گھٹنے تک جا کر ٹھہر گئیں۔

اس نے گھٹنے سے لے کر ایڑی تک آہستہ آہستہ اپنے پیر پر ہاتھ پھیرا پھر ایڑی اور انگلیوں پر ہاتھ پھیرتے اس کا ہاتھ واپس گھٹنے تک آ گیا۔ گھٹنے پر لا کے اس نے اپنے ہاتھ کو روک دیا۔ اس کے پاس سیدھا پیر پورا ہے۔ صرف گھٹنے تک نہیں بلکہ اس نے نیچے پنڈلی، ایڑی اور پنجے تک کھڑے ہو کر اپنے دونوں پیروں سے چلنے کے لیے قدم اٹھایا تو اس لڑکی کے درد پر اس کا چیخ چیخ کر رونے کا جی چاہا۔

''کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ آخر دیا کے ساتھ ایسا کیوں؟ میرے ساتھ کیوں نہیں؟ میرے ساتھ کیوں نہیں؟'' وہ اپنی چیخوں اور اپنی آہوں کو اپنے ہی اندر دبا کر بمشکل کمرے سے باہر نکلا تھا۔ باہر نکل کر اسے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرنی تھی۔ ہنسنا تھا، باتیں کرنی تھیں۔ کتنا دشوار تھا ایسا کرنا مگر بہت سے لوگ تھے جن کی خاطر اسے یہ سب کرنا ہی تھا۔

صبح سے شام تک کا سارا وقت بہت مصروف گزرا تھا۔ وہ سارا وقت تقریباً گھر سے باہر ہی رہا تھا۔ نائلہ کی داڑھ میں تکلیف تھی، صبح سب سے پہلے تو وہ انہیں ڈینٹسٹ کے پاس لے کر چلا گیا تھا پھر دوسرا کام کمال علی خان کی گاڑی کا تھا جو کچھ مسئلہ کر رہی تھی۔ وہ انہیں دوسری گاڑی پر ان کے ہسپتال چھوڑ کر پھر خود ان کی گاڑی لے کر مکینک کے پاس چلا گیا۔ گاڑی کے ساتھ خاصے مسئلے تھے۔ انہیں حل کراتے کراتے اسے وہاں کئی گھنٹے لگ گئے اور یوں گھر واپس آتے آتے اسے شام ہی ہو گئی تھی۔

''آ گئے بیٹا۔'' وہ گھر میں داخل ہوا تو بوا جی سامنے ہی نظر آ گئیں۔

''دیا کیا کر رہی ہے؟'' ان سے سلام دعا کر کے اس نے ودیعہ کا پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہے۔ تمہارے لئے چائے بناؤں؟''

''جی پلیز...... میں دیا کے کمرے میں ہوں، وہیں لے آئیے گا۔'' وہ وہاں سے سیدھا اس کے کمرے میں آ گیا۔

''کیا ہو رہا ہے بھئی؟ وہ ہنستا مسکراتا اس کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب بیزاری سے اسے دکھا دی۔ اس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے وہ نارمل...... بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ یہ بیزاری اسے دیکھتے ہی چہرے پر بکھری تھی۔

''کل اپنے خطوط کی ایکسائٹمنٹ میں، میں یہ تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ تم کس موضوع پر اور کیا لکھ رہی ہو۔ تمہارا پچھلا آرٹیکل تو زبردست تھا۔ پرسوں کے اخبار کے ادارتی صفحے پر تمہاری نگر کا کوئی آرٹیکل نہیں تھا۔ آج آصف اور ولید ملے تھے مجھے۔ یاد ہیں نا تمہیں وہ دونوں؟ بہت بڑی چیز بن گیا ہے بھئی آصف ہمدانی، امریکہ سے بڑی بھاری بھرکم ڈگریز لے کر لوٹا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ تمہاری قابلیت سے خوب اچھی طرح متاثر ہے۔ بڑی پابندی سے وہ تمہارے آرٹیکلز پڑھتا ہے۔ جتنی دیر ہماری بات ہوتی رہی، وہ تمہاری ذہانت کے قصیدے پڑھتا رہا۔ بڑا امپریس ہے بھئی وہ تم سے۔ کہہ رہا تھا ودیعہ کی معلومات اور اس کا مطالعہ قابل رشک ہے۔'' وہ خوشگوار موڈ میں اسے اسکول کے دنوں کے پرانے دوستوں کی باتیں بتا رہا تھا۔ ودیعہ کے چہرے پر دلچسپی جیسے کوئی تاثرات نہیں تھے۔

''زندہ باد بوا جی! آپ تو چائے کے ساتھ لوازمات بھی لے آئیں۔'' بوا جی ٹرے ہاتھ میں لیے کمرے میں آئیں تو وہ ٹرے میں چائے کے کپس کے ساتھ گرما گرم خستہ کچوریاں دیکھ کر خوش ہوا۔ ''تمہارے اور ودیعہ ہی کے لیے بنائی ہیں۔ شکر تم صحیح وقت پر آ گئے، ورنہ ٹھنڈی کچوریاں

کھانے میں کیا مزا آتا۔ اب جلدی سے کھا کر بتاؤ کیسی بنی ہیں؟'' انہوں نے ٹرے ان دونوں کے قریب رکھ دی تھی۔ ''آپ نے بنائی ہیں، بری ہو ہی نہیں سکتیں۔'' اس نے جلدی سے ایک کچوری اٹھالی اور ودیعہ کو بھی کھانے کی دعوت دی۔

''تم بھی لو دیا!'' ودیعہ نے نہ کچوری لی اور نہ چائے۔

''ہماری بات تو ادھوری رہ گئی۔ تمہارے کل والے آرٹیکل کے بارے میں ذرا پڑھوا ؤ تو سہی تم کل کیا زبردست چیز لکھ رہی تھیں۔'' ودیعہ کی فائل رائٹنگ ٹیبل پر رکھی تھی۔ بواجی ابھی کمرے سے گئی نہیں تھیں، وہ رائٹنگ ٹیبل کے بالکل پاس کھڑی تھیں۔ ودیعہ کو نظریں گھما کر رائٹنگ ٹیبل کی طرف دیکھتا پا کر انہوں نے جلدی سے میز پر سے فائل اٹھائی اور ودیعہ کے پاس لے آئیں۔

''لو بیٹا۔''

''یہ میں خود بھی اٹھا سکتی تھی، صرف ٹانگ کٹی ہے میری، ہاتھ تو سلامت ہیں۔ آپ لوگ برائے مہربانی مجھ پر یہ عنایتیں مت کیا کریں۔ میں اپنے کام خود کر سکتی ہوں۔'' اس کا لہجہ انتہا سے زیادہ کڑوا تھا۔ اس کی نگاہوں میں سخت کوفت اور بیزاری تھی۔ بواجی ساکت کھڑی پتھرائی آنکھوں سے ودیعہ کو دیکھتی رہ گئیں۔ وہ اس گستاخ لہجے میں ان سے بات کر سکتی ہے، انہیں جیسے یقین نہیں آرہا تھا پھر وہ ایک دم ہی پلٹیں، فائل واپس میز پر رکھی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔ ان کے جانے کے بعد ودیعہ خود وہیل چیئر چلاتی رائٹنگ ٹیبل تک گئی، وہاں سے فائل اٹھائی اور پھر واپس اس کے قریب آگئی۔ اس نے فائل عمر کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ وہ چہرے پر کوئی بھی تاثر لائے بغیر فائل کھول کر دیکھنے لگا۔ ودیعہ نے صرف آدھا صفحہ لکھا تھا۔

''اتنا اچھا تو لکھ رہی تھیں، اسے مکمل کیوں نہیں کیا؟''

''کیا ضروری ہے کہ میں اسے لکھوں۔ اس کے لکھنے اور چھپنے سے میری زندگی پر کیا فرق پڑے گا؟'' تھوڑی سی تعریفیں، تھوڑی سی واہ واہ...... بس؟'' اس نے فائل عمر کے ہاتھ سے لے کر بیڈ پر پھینک دی۔

''ہاں یہ ضروری ہے کہ تم لکھو، اس سے تمہاری زندگی پر فرق پڑے یا نہیں۔ میری زندگی پر فرق پڑتا ہے، اس لیے کہ جس طرح میرا لکھنا تمہیں اچھا لگتا ہے، بالکل اسی طرح مجھے بھی تو تمہارا لکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔''

''میں خود کو اس بات کا پابند نہیں سمجھتی کہ ہر وہ کام کروں جو تمہیں اچھا لگے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کرتی، تم نہیں چاہتے تو مت لکھا کرو۔'' وہ بڑی بے رحمی سے بولی۔

''مت لکھا کرو؟'' جو وہ غصے میں کہہ رہی تھی کیا اس کے مفہوم سے آشنا تھی؟ کیا اسے خود اندازہ تھا اس نے کتنی بڑی بات بول دی ہے؟ وہ اس کی اپنے چہرے پر مرکوز ساکت نگاہوں کو نظرانداز کرتی ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا کر چائے پینے لگی تھی۔

''بواجی! میری پیاری بواجی! ودیعہ کی باتوں پر رو رہی ہیں؟'' ودیعہ کے کمرے سے نکل کر وہ بواجی کو ڈھونڈنے لگا۔ وہ اسے کچن میں بیٹھی نظر آگئی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے جلدی جلدی دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے تھے۔ وہ میز کے آگے سے دوسری کرسی کھینچ کر ان کے برابر میں بیٹھ گیا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"ودیعہ کو کیا ہو گیا ہے عمر؟ میری بچی ایسی تو کبھی بھی نہیں تھی۔ کاش آج ڈاکٹر صاحب زندہ ہوتے وہ اسے سنبھال لیتے۔ وہ زندہ تھے تو اس نے خود کو سنبھال لیا تھا، اب تو لگتا ہے اسے کسی کی کوئی پرواہی نہیں رہی۔"

"وہ ٹھیک ہو جائے گی بوا جی! اتنے بڑے حادثے سے گزری ہے اسے تھوڑا سا وقت تو دیں۔ وہ بالکل پہلے جیسی ہو جائے گی۔ یہ تلخی اور یہ کڑوا پن اس کا مزاج نہیں، ہم سب جانتے ہیں۔ وہ تو پھر بھی دوسروں سے بہت زیادہ حوصلے والی ہے۔ اس کی جگہ ہم میں سے کوئی ایسے حادثے سے گزرتا تو اتنی آسانی سے اسے قبول نہیں کر سکتا تھا جیسے وہ کر رہی ہے۔ ابھی وہ اپنے بکھرے وجود کو جوڑ رہی ہے، زندگی کو نئے سرے سے جینے کی کوشش کر رہی ہے، ہمیں اس کا ساتھ دینا ہے۔ اس سے بدگمان نہیں ہونا، اس سے خفا نہیں ہونا۔" ان کے آنسو صاف کرتے اس نے بہت پیار سے انہیں سمجھایا۔

"اگر تم نہ ہوتے عمر! میری بیٹی کا کیا ہوتا؟ وہ تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔ ہم میں سے کوئی اسے ایسے نہیں سمجھتا جیسے تم سمجھتے ہو۔" انہوں نے اس کے ماتھے کو بے اختیار چوما تھا۔

مگر یہ کیسی بات تھی کہ دوسروں کو ودیعہ کے رویوں کی توجیہات دینے والا عمر حسن اپنے کمرے میں آتے ہی نڈھال سا ہو گیا۔

"تم نہیں چاہتے تو مت لکھا کرو۔" وہ ودیعہ کی کسی بات پر دکھی نہیں ہوگا۔ وہ ودیعہ کے کسی رویے پر درد محسوس نہیں کرے گا۔ وہ جو کچھ کہتی ہے صرف غصے میں۔ وہ کل کی طرح ایک ٹانگ سے چل کر اپنے سارے کام کرتا، خود کو ودیعہ کے تلخ رویوں کی وجہ یاد دلا رہا تھا لیکن صرف الٹے پاؤں سے چلتے، اٹھتے بیٹھتے بھی یہی ایک سرد سا جملہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تم نہیں چاہتے تو مت لکھا کرو۔"

"دیا! پلیز اور جتنی دل چاہے تلخ بات مجھ سے کہہ جایا کرو لیکن یہ نہیں۔ یہ نہیں دیا! پھر سے یہ کبھی مت کہنا دیا! ورنہ میں ٹوٹ جاؤں گا۔" اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے، وہ اس جملے کی بازگشت نہیں سننا چاہتا۔

"جب تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ تم صرف میرے لیے لکھتے ہو تو تمہارا یہ کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔" کچھ من چاہے جملے اس نے اپنے ذہن میں دہرانے شروع کر دیے تھے تاکہ اس تلخ ترین جملے کے اثر سے نکل سکے۔

"تم کہانیاں میرے لیے بناتے ہو مگر انہیں آئندہ سب سے کریں گے عمر حسن۔"

"جب تمہاری کہانیاں میرے لیے ہیں تو پھر وہ کہیں چھپیں گی یا پھینکیں گے، یہ فیصلہ کرنے کا حق بھی صرف مجھے ہے۔"

"تم کبھی لکھنا مت چھوڑنا!"

"تم لکھنا مت چھوڑو عمر...... کسی اور کے لیے نہ سہی تم میرے لیے لکھو۔ میں تمہیں پڑھنا چاہتی ہوں۔ تم میرے لیے لکھو۔" پھر ساری رات وہ "تم نہیں چاہتے تو مت لکھو" کی جگہ "تم میرے لیے لکھو" کو اپنے ذہن و دل میں دہراتا رہا۔

☆☆☆

صبح وہ بستر سے اٹھا تو اس کے ذہن میں ایک بات بالکل واضح تھی، ایک فیصلہ بالکل مستحکم تھا۔ رات بھر موجودہ حالات کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد کیا جانے والا ایک فیصلہ۔ ایک بالکل اٹل فیصلہ۔ اب اس کی اور ودیعہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ وہ تلخ ہو رہی ہے، اس کے اندر کڑواہٹیں بھرتی جا رہی ہیں، وہ خود کو جان بوجھ کر تنہا کر رہی ہے جس طرح خود کو سب سے اور خاص طور پر اس سے دور کر رہی ہے، وہ یہ سب خاموشی سے تو نہیں دیکھتا رہے گا۔ وہ کیسی مرجھائی ہوئی، کمزور اور بیمار بیمار سی نظر آنے لگی ہے۔ اس کے چہرے کی رونق، چمک، خوبصورتی سب ماند پڑ گئی ہیں۔ ان سب کا بہترین حل یہی ہے کہ ان دونوں کی شادی ہو جائے۔

شادی کے بعد نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز، عمر کا ساتھ، ایک بے تحاشا چاہنے والے شوہر کے روپ میں اس کی ودیعہ سے والہانہ محبت اور اس محبت کا گرم جوشی سے بھرپور اظہار، یہ سب اس کے مزاج کی تلخی کو یقیناً بدل ڈالے گا۔ ودیعہ کی زندگی کے اس مشکل ترین موڑ پر وہ جس طرح اپنے پیار کا اس سے والہانہ اظہار کرنا چاہتا ہے، ابھی وہ حق اس کے پاس نہیں۔ ایک بار یہ حق اسے مل جائے پھر وہ اسے اپنے پیار کی بارش میں ایسا جل تھل کرے گا کہ وہ اداس ہونا، خاموش رہنا اور خفا رہنا سب بھول جائے گی۔

اس نے صرف سوچا ہی نہیں تھا بلکہ اسی روز کمال علی خان اور نائلہ سے اپنی اور ودیعہ کی شادی کی بات کر بھی ڈالی تھی۔

نائلہ خوشی اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

''عمر تم..... کیا واقعی؟ کیا تم ابھی بھی ودیعہ سے.....؟'' ایک ماں اپنی بیٹی کی اجڑی خوشیوں کو دوبارہ آباد ہوتا دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائی تھی۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملانے لگے تھے۔

خوشی کے رنگ بکھرے تو کمال علی خان کے چہرے پر بھی تھے مگر صرف ایک پل کے لیے۔ ایک پل کی خوشی کے بعد تفکرات اور اندیشوں کا جال سا بن گیا تھا ان کے چہرے پر۔ عمر نے نائلہ کی خوشی کے ساتھ کمال علی خان کے متفکر چہرے کو بھی فوراً دیکھ لیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ ان سے ان کی فکر اور پریشانی کا سبب پوچھتا وہ خود ہی اس سے سوالیہ لہجے میں پوچھنے لگے۔

''عمر! کیا تم نے ودیعہ سے شادی کا فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے؟''

''فیصلہ؟ سوچ سمجھ کر؟ انکل ہماری شادی کا فیصلہ تو کب کا ہو چکا ہے۔ اگر درمیان میں یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو آج ہماری شادی کو چھ مہینے ہونے والے ہوتے۔''

''تب میں اور اب میں بہت فرق ہے عمر! تب میری بیٹی ہر لحاظ سے تمہارے قابل تھی بلکہ بعض حوالوں میں وہ تم سے برتر تھی مگر اب۔'' وہ ایک پل کے لیے چپ ہوئے جیسے کوئی ناپسندیدہ لفظ ادا کرنے کے لیے خود میں ہمت پیدا کر رہے ہوں۔

''اب وہ ایک اپاہج لڑکی ہے اور ایک اپاہج لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کوئی آسان فیصلہ نہیں۔'' انہوں نے بڑی تکلیف سے ودیعہ کے لئے یہ لفظ ادا کیا تھا۔ بیٹی کے لیے یہ لفظ بولتے وقت ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مشکلوں سے خود کو رونے سے روکا تھا۔ اگر ان کے لیے یہ لفظ بولنا تکلیف دہ تھا تو نائلہ اور عمر کے لیے اسے سننا۔ ماں کی آنکھوں سے بیٹی کے لیے ایک بدصورت لفظ سنتے ہی آنسو گرنے شروع ہو

گئے تھے اور عمر نے اپنا درد ضبط کرنے کو ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا تھا۔

''میری باتوں کا برا مت ماننا عمر! لیکن یہ میری بیٹی کی زندگی اس کی خوشیوں اور اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ اس سے شادی کا جو تم فیصلہ کر رہے ہو، کیا اسے نبھا پاؤ گے؟ تمہارے سامنے ابھی تمہاری پوری زندگی پڑی ہے۔ تم ایک کامیاب انسان ہو، تمہارا مستقبل بہت روشن ہے۔ ان سب کے ساتھ تم ودیعہ کو، ایک معذور لڑکی کو ایڈجسٹ کرا لو گے؟ تمہیں ایک سے بڑھ کر ایک حسین اور خوب صورت لڑکی مل سکتی تھی، اس بات کا اگر تمہیں خود احساس نہیں بھی ہوا تو لوگ تمہیں احساس دلائیں گے۔ ہم ودیعہ کو علاج کے لیے امریکہ، انگلینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا کہیں بھی لے جائیں، قابل سے قابل سرجن سے اس کا آپریشن کروا کر ٹانگ لگوا لیں۔ ایسی کہ وہ اصل سے قریب ترین لگے مگر پھر بھی وہ اصل ہوگی تو نہیں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو عمر! بغیر کسی دباؤ کے۔ ابا میاں کا تمہارے ساتھ سلوک، ان کے تم پر احسانات ان سب کو درمیان میں لائے بغیر۔ ان میں سے کسی چیز کو تمہاری اور ودیعہ کی شادی کی وجہ نہیں بننا چاہیے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں عمر کہ ابھی اگر تم ودیعہ سے شادی کرنے سے انکار کر دو گے تو ہم میں سے کوئی تمہیں اس کے لیے غلط نہیں سمجھے گا۔ ہم میں سے کسی کو اس کا اس قدر غم بھی نہیں ہوگا لیکن تین چار سال بعد اگر تم نے ودیعہ کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا تو تب ہم تمہیں بہت غلط سمجھیں گے اور تب ہم میں سے کوئی اس صدمے کو برداشت نہیں کر پائے گا۔''

وہ اسے بیچ چوک پر ہزاروں لوگوں کی سامنے گندی سے گندی گالیاں دے دیتے تو اسے اتنی ذلت کا احساس نہ ہوتا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔ ودیعہ سے اپنی محبت، اپنی وفا، اپنی چاہت، اپنی دیوانگی کی صفائیاں دینا، وضاحتیں پیش کرنا۔

''انکل! آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ بالکل حقیر، ایک بونے جتنا کر دیا اور اگر میں نے کوئی وضاحت اور کوئی دلیل پیش کی تو اپنی نظروں میں رہی سہی عزت بھی کھو دوں گا۔'' وہ کچھ بھی بولا نہیں تھا، وہ خاموش نگاہوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں نجانے ایسا کیا تھا کہ کمال علی خان کچھ لمحوں کے لیے اپنی ہی کہی باتوں پر شرمندہ سے ہو گئے۔

''میں تمہارے خلوص پر شک نہیں کر رہا عمر! میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں۔'' انہوں نے اپنی باتوں کی فوراً وضاحت دینی چاہی مگر عمر ایک دم ہی جیسے ان کے احساسات کو سمجھ گیا۔ اگر وہ عمر حسن بن کر جو ودیعہ کمال کو اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہتا تھا ان کی باتوں کو سوچتا تو وہی کچھ محسوس کرتا جو چند لمحوں پہلے تک کر رہا تھا۔

''لیکن اگر وہ ایک بچپن سالہ باپ کی جگہ پر خود کو رکھتا جو اپنی بیٹی کی زندگی میں پیدا ہوئی ایک ہمیشہ رہ جانے والی کمی کی وجہ سے دکھی اور پریشان ہے تو کیا محسوس کرتا؟ وہ ایک مصنف تھا، ایک ایسا مصنف انسانی نفسیات و جذبات پر جس کا مشاہدہ غیر معمولی تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ کمال علی خان کا عمر حسن کی محبت پر شک نہیں بلکہ ایک پریشان حال باپ کے اپنی بیٹی کے مستقبل کے حوالے سے تفکرات اور اندیشے تھے۔ اس باپ کو ایک یقین دہانی چاہیے تھی، زبان سے اقرار چاہیے تھا، ایک سچا وعدہ چاہیے تھا۔

''انکل! میرا مستقبل، میرا کیریئر میرا اسٹیٹس سب کچھ میرے لیے بے معنی ہے۔ اگر ودیعہ میرے ساتھ نہ ہو۔ آپ کو یقین دلانے کے لیے میرے پاس صرف لفظ ہیں۔ میرا عمل تو میرا آنے والا کل بتائے گا۔ اگر آپ میرے لفظوں پر اعتبار کر لیں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں

کہ میرے ساتھ اس کی زندگی بالکل ویسی ہوگی جیسی زندگی آپ اس کے لیے چاہتے ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میرے ہوتے اس پر کبھی کوئی مشکل یا مصیبت نہیں آئے گی۔ ابھی بھی تو میں اور آپ ہم سب اس کے پاس موجود تھے، جب اس پر اتنی بڑی آزمائش آئی ہم اسے اس حادثے سے بچا تو نہیں پائے مگر اتنا یقین میں آپ کو دلا سکتا ہوں کہ اس کی زندگی کی ہر مصیبت، ہر مشکل اور ہر آزمائش میں، میں اس کے ساتھ ہوں گا۔"

ایک باپ کو یہ یقین دہانی کرا دینے سے عمر حسن چھوٹا نہیں پڑ گیا۔ اس نے ذلت کے احساس میں گھر تی اپنی محبت کو سمجھایا تھا۔ کمال علی خان کے چہرے پر چھائے تفکرات اور پریشانیوں کی سائے اور آنکھوں کی بے چینی اور اندیشے یک دم ہی کہیں غائب ہو گئے تھے۔ نائلہ کمال کے ساتھ کمال علی خان کو بھی مطمئن ہوتا دیکھ کر وہ پرسکون ہو گیا تھا۔ اب وہ ان سے یہ بات کر رہا تھا کہ ابامیاں کے بعد، ان کے بغیر شادی میں دھوم دھام اور شور شرابا ان میں سے کسی کے بھی دل کو اچھا نہیں لگے گا، لہٰذا پہلے جیسے دھوم دھام اور بڑے اہتمام والی تقریب کی جگہ اب شادی کی تقریب سادگی سے منعقد کر لی جائے۔ شادی کی حتمی تاریخ طے کرنے کے لیے نائلہ اپنے بھائیوں، بہنوں کو اور کمال علی خان اپنی خالہ اور چچا جیسے قریبی احباب کو بلانا چاہتے تھے تاکہ سب کی مشاورت سے کوئی مناسب سی تاریخ رکھ لی جائے۔ خوش خوش یہ سب باتیں کرتی نائلہ اچانک ہی پتا نہیں کیا سوچ کر کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔

"آپ کیا سوچ رہی ہیں آنٹی؟" عمر نے ان کے مسکراتے چہرے پر فکر اور پریشانی پھیلتی دیکھی تو فوراً پوچھا۔

"میں ودیعہ کے بارے میں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب شادی کے لیے آسانی سے مانے گی۔ تم نے آج کل اس کا رویہ دیکھا ہے، کیسا ہو گیا ہے۔ ایک دوبار ودیعہ کی خالہ اور بواجی نے اس کی موجودگی میں مجھ سے تم دونوں کی شادی کی بات چھیڑی تو اس کا ردعمل بڑا عجیب تھا۔ میری سمجھ سے باہر۔ اگرچہ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں میں انکار بڑا واضح نظر آ رہا تھا مجھے۔" یہ انکار نظر تو عمر حسن کو بھی آتا تھا مگر نہ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا، نہ سمجھنا چاہتا تھا اور نہ وہ اسے اہمیت دینا چاہتا تھا۔

"آپ دیا کی فکر مت کریں، آپ کو اس سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بس تاریخ جلد از جلد طے کر لیں، باقی ان محترمہ کو کیسے ہینڈل کرنا ہے، یہ مرحلہ میں خود طے کر لوں گا۔" اس نے ان دونوں کو اطمینان دلا دیا تھا۔

وہ اسی روز اس روٹھی ہوئی ضدی لڑکی کے پاس اپنا مدعا لیے چلا آیا۔ بھرپور اعتماد کے ساتھ، پوری تیاری کے ساتھ۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوا۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی کچھ لکھنے میں مصروف تھیں۔

"اور جناب کیا لکھا جا رہا ہے؟" اسے دیکھتے ہی اس کے سنجیدہ چہرے پر کوفت، ناگواری اور بیزاری پھیلی تھی اور وہ نظر انداز کر کے مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا تھا۔

وہ مطمئن سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ ودیعہ آنکھوں میں ناگواری لیے اسے دیکھ رہی تھی۔ "دیا! میری آنٹی، انکل سے شادی کی تاریخ طے کرنے کی بات ہوئی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، کون سی تاریخ رکھیں؟" وہ اس کی ناگواری کو اہمیت دیے بغیر بڑے اعتماد سے بولا۔

"کس کی شادی؟" وہ وہیل چیئر آہستہ آہستہ چلاتی اس کے بالکل سامنے آ گئی۔

''ہماری شادی...... میری اور تمہاری...... کیا اتنے سے دنوں میں تم بھول گئیں کہ ہماری شادی ہونے والی تھی۔ اب کیا شادی کے لیے کوئی نئی تاریخ نہیں رکھی جائے گی؟''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں شادی کے لیے مان جاؤں گی؟'' ودیعہ نے ناپسندیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''تم مان چکی تھیں دیا! تمہارے مان لینے کی نشانی ابھی بھی تمہاری انگلی میں موجود ہے۔ تمہارے مان لینے کی وجہ سے ہماری منگنی ہوئی تھی، تمہارے مان لینے کی وجہ سے ہماری شادی طے ہوئی تھی۔'' اس نے ودیعہ کی کسی بات کا برا نہیں مانا۔ وہ جو بھی کہہ رہی ہے، صرف جھنجلاہٹ میں۔ ان لفظوں میں سے کوئی لفظ اس کے دل سے نہیں نکل رہا۔ وہ مسلسل خود کو باور کرا رہا تھا۔

''ہاں جب مانی تھی، اب نہیں مانتی۔ تب جس لڑکی سے تم شادی کرنا چاہتے تھے، وہ اپنے پیروں پر چلتی تھی۔ کسی بیساکھی اور وہیل چیئر کے بغیر۔'' اس نے اپنے پیروں پر پڑی چادر قصداً اٹھا کر دور پھینک دی۔ اب اس کے دونوں پیر عمر کے بالکل سامنے تھے۔ ایک بالکل صحیح سلامت اور دوسرا گھٹنے کے نیچے سے غائب۔

اس کی یہ خود اذیتی عمر کے دل پر کیسے زخم لگا رہی تھی، وہ اسے بتا نہیں سکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ خدا کے لیے مجھے یہ اذیت مت دو۔

''یہ معذوری اب ایسی معذوری نہیں رہی ہے دیا! جسے کوئی اہم ایشو بنایا جائے۔ ویسے تو پاکستان میں بھی اسے حوالے سے کافی ترقی ہو چکی ہے لیکن میں نے سوچا ہے شادی کے بعد جب ہم لندن چلے جائیں گے پھر وہیں تمہارا علاج بھی کرائیں گے۔ تمہاری زندگی پہلے کی طرح بالکل نارمل ہو جائے گی۔ تمہیں وہیل چیئر اور بیساکھی کی کوئی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ تم اپنے کیا میرے بھی سارے کام آرام سے کر سکو گی۔ بغیر کسی سہارے اور مدد کے۔ تمہیں خود کو پتا ہوگا تو ہوگا ورنہ دیکھنے والوں کو تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ تم کسی مصنوعی عضو کا سہارا لے کر چل رہی ہو۔'' اس نے بڑی رسانیت اور پیار سے اسے سمجھایا۔

''یہ سب جو تم مجھے بتا رہے ہو، یہ سب میں...... جانتی ہوں اور میں تو یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر میری دونوں ٹانگیں اور دونوں ہاتھ پورے کے پورے کٹ چکے ہوتے، میں زندگی بھر کے لیے اس طرح معذور ہو جاتی کہ کبھی کسی علاج سے بھی ٹھیک نہیں ہو پاتی، تم تب بھی مجھ ہی سے شادی کرتے۔ ابھی تو صرف ایک ٹانگ اور وہ بھی آدھی کٹی ہے۔'' وہ اپنے پیروں کی طرف دیکھ کر تمسخرانہ انداز میں ہنسی۔

''اس سب کے باوجود میں تم سے شادی نہیں کروں گی اور یہ میرا بالکل اٹل اور آخری فیصلہ ہے۔ اس پر تم مجھے کتنا بھی قائل کرنے کی کوشش کر لو، میں مانوں گی نہیں۔ میرا جواب آج بھی یہی ہے، کل بھی یہی ہوگا اور دس سال بعد بھی یہی ہوگا۔ اس لیے تم مجھے سمجھانے میں اپنا وقت اور توانائی برباد نہ کرو۔'' اس کے لہجے کی سختی نے عمر حسن کے دل کو اندر ہی اندر مسل ڈالا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا، وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھتا تھا، وہ اس کی آنکھیں پڑھا کرتا تھا اور آج ان آنکھوں میں بھی اس کے لیے وہی سختی اور وہی انکار تھا جو اس کے لفظوں اور اس کے لہجے میں تھا لیکن وہ اس سختی سے خائف نہیں ہوگا، وہ ہار نہیں مانے گا۔ اس نے خود کو سمجھایا۔

''دیا! ہم نے ایک دوسرے سے محبت کی ہے اور محبت اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے ختم ہو جائے۔ تم مجھے بتاؤ اگر جو

حادثہ تمہارے ساتھ ہوا ہے، وہ میرے ساتھ ہوتا پھر کیا تم مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتیں؟''

''اگر انکار نہ بھی کرتی تب بھی چند سالوں بعد اپنے فیصلے پر پچھتاتی ضرور۔ ایک معذور انسان کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کڑی آزمائش ہوا کرتا ہے اور اس کڑی آزمائش میں مبتلا ہونے والے اگر تمہاری طرح کے وفادار ہوں تو ہمت اور حوصلے سے ساری عمر سمجھوتے کی زندگی ہنسی خوشی گزار لیتے ہیں۔ رہی محبت تو وہ آزمائش والے اس سفر کے آغاز ہی میں کہیں کھو چکی ہوتی۔'' وہ اس سے یہ توقع رکھتی تھی؟ وہ اسے ایسا سمجھتی تھی؟ اس کے دل کو یقین نہیں آرہا تھا کہ آج اسے اس لڑکی کو اپنی محبت کا یقین دلانا پڑے گا۔ اسے جسے وہ محبت کہتا ہے۔ کمال علی خان اور نائلہ اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے اس کے پاس لفظوں کی کوئی کمی نہیں ہوئی تھی مگر اسے......؟ ودیعہ کمال کو......؟ کیا ان سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں؟ کیا ان سوالوں کے جواب مانگے جاتے ہیں؟ وہ اس کے منہ پر کھینچ کر کئی طمانچے مار دیتی، وہ اس کے منہ پر نفرت سے تھوک دیتی، وہ اس سے جو مرضی کہہ لیتی مگر کاش یہ نہ کہتی۔

وہ اس کے پاس سے اٹھ گیا تھا۔ اس کے دل کے نگر میں ہر طرف اداسیاں ڈیرا جمانے لگی تھیں۔ نجانے دل سے محبتوں کا موسم رخصت ہوتا ہوا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ رات گئے تک وہ یونہی مارا مارا سڑکوں پر تنہا پھرتا رہا جس سکون کی اسے تلاش تھی، وہ کہیں مل نہیں رہا تھا۔ وہ اس رات گھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس نے گھر فون کر دیا تھا کہ ایک پرانا دوست مل گیا ہے اور رات وہ اسی کے گھر پر گزارے گا۔ اپنے اپارٹمنٹ کا کرایہ وہ پابندی سے ہر ماہ دے رہا تھا لیکن خود شادی والے دن ابا میاں کا فون سنتے ہی جو وہاں سے نکلا تھا، تو اب تک دوبارہ وہاں قدم رکھنے کی خود میں ہمت پیدا نہیں کر پایا تھا۔ حالانکہ اس کا سارا سامان وہاں پڑا تھا اور اسے اپنے سامان کی مسلسل ضرورت پڑتی تھی لیکن وہاں وہ سوکھے ہوئے پھول اور مرجھائی ہوئی کلیاں اسے یہ یاد دلاتیں کہ کس طرح اس کی زندگی کا خوب صورت ترین دن بدترین دن میں تبدیل ہو گیا تھا، اس لیے وہ وہاں جاتا نہیں تھا۔ ساری رات جاگتے رہنے کے بعد صبح وہ گھر آیا بھی تو اس کا دل اداس اور پژمردہ ہی تھا لیکن وہاں نائلہ اسے بے تحاشا جوش و خروش سے بوا جی کو دوپہر کے کھانے کی ہدایات دیتی نظر آئیں۔

شاید کوئی دعوت تھی۔ بوا جی نے لندن سے اس کے نام آیا ایک خط اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور کچن میں چلی گئیں۔ وہ وہیں بیٹھے ہوئے ہی لفافہ کھولنے لگا۔ نائلہ اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ''میں نے سوچا دیر کیا کرنی پھر آج چھٹی کا دن بھی ہے۔ رات ہی میں نے سب کو فون کر دیا تھا۔ لنچ پر میں نے سب کو انوائٹ کر لیا ہے۔ بس آج ہی تاریخ طے کر لیں گے۔'' اس نے ان کے خوشیوں بھرے چہرے کو افسردگی سے دیکھا۔ ساتھ ہی خط کے مضمون پر نگاہیں دوڑائیں۔ وہ اس کے کالج سے خط تھا اور اس خط میں خاصے سخت اور تنبیہی الفاظ میں یہ پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ اپنی جاب پر آنے کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیں۔ ڈین اسے ذاتی حیثیت میں بہت پسند کرتے ہوتے تو اسے اتنی رعایت کبھی نہ ملتی جتنی مل چکی تھی مگر رعایت اور غیر معمولی سلوک بھی تو ایک حد تک ہی ہوا کرتا ہے۔ اب مزید رعایت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے فوراً لندن واپس پہنچنا تھا۔ وہ اب مزید بالکل نہیں رک سکتا۔ یہ عمر حسن کے اور ودیعہ کے مستقبل کا سوال ہے لیکن وہ شادی کے لیے مان نہیں رہی اور وہ اسے یہاں چھوڑ کر اکیلا جا نہیں سکتا۔ موجودہ حالات اور ودیعہ کی موجودہ کیفیات میں وہ اسے چھوڑ کر لندن کیسے چلا جائے اور اگر چہ چلا گیا تو وہاں سکون سے رہ کس طرح سکے گا؟ ابا

میاں زندہ ہوتے تو دوسری بات تھی پھر وہ اس کے انکار کو وقتی طور پر قبول کر کے اسے اس ضد اور ہٹ دھرمی سے باہر نکلنے کا وقت دے کر اکیلا واپس چلا جاتا مگر اب...... اب ابا میاں نہیں رہے تھے اور نائلہ اور کمال علی خان اس کے ماں باپ ہونے کے باوجود اس سے بے پناہ پیار کرنے کے باوجود اس کے اتنے قریب کبھی نہیں رہے تھے اس کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں اور کشمکش کو اچھی طرح سمجھ پاتے۔

اور ایسے افراد ودیعہ کمال کی زندگی میں دو ہی تھے۔ ایک سعادت علی خان اور دوسرا عمر حسن۔ ایک اب رہا نہیں تھا اور دوسرا ابھی موجود تھا جس طرح وہ خود کو سب سے دور کر رہی ہے، گوشہ نشین ہو رہی ہے۔ اگر وہ اسے اس حالت میں یہاں چھوڑ گیا تو وہ خود کو بالکل ہی تنہا کر لے گی۔

''بہت اچھا کیا آنٹی آپ نے، کالج سے بڑا ٹھیک ٹھاک دھمکی بھرا خط آیا ہے۔ اب تو شادی کی کوئی بالکل قریب کی تاریخ رکھنی پڑے گی۔'' وہ چہرے کی افسردگی کو ایک خوشگوار سی مسکراہٹ سے بدل کر چند سیکنڈز بعد بولا۔ اگر بات تھوڑی سی زبردستی کر کے منوانی پڑ جائے تو کیا حرج ہے۔ اگر وہ پیار محبت سے نہیں مان رہی تو زور زبردستی سے ہی سہی۔ وہ اسے ساتھ لیے بغیر تو بہرحال یہاں سے نہیں جائے گا۔ آنٹی اپنے رشتے داروں کو انوائٹ کر چکی تھیں اور اس نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ودیعہ نے کل اس سے کیا کہا تھا۔ گھر پر جمع ہوئے عزیز و اقارب اور ماں باپ کی عزت کے خیال سے وہ ہزار تلملانے پر بھی کچھ کر نہیں پائے گی۔

گھر پر مہمان آ چکے تھے اور وہ فریش ہو کر ان کے درمیان آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ودیعہ کے دونوں ماموں، تینوں خالائیں، ددھیال کی طرف سے ابا میاں کے چھوٹے بھائی بہن اور کمال علی خان کے فرسٹ کزنز۔ آنے والی ہفتہ وار چھٹی کا دن عمر کی خواہش پر طے کیا جا رہا تھا، جب بے ساکھی کے سہارے چلتی ودیعہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر بے تحاشا غصہ اور طیش تھا۔

''السلام علیکم۔'' اس نے عمر کے چہرے پر نگاہ نہیں ڈالی۔ وہ باقی تمام افراد خاص طور پر اپنے ماں باپ کی طرف متوجہ تھی۔ سب نے اس کے سلام کا جواب کس قدر حیرت سے دیا تھا۔ اس کا انداز اور اس کے چہرے کے تاثرات ہی اس قسم کے تھے۔

''پاپا! میں عمر سے شادی نہیں کروں گی، نہ آج نہ آئندہ کبھی۔ اپنا انکار میں بڑے واضح اور صاف لفظوں میں کل اسے بتا چکی ہوں۔ اس نے آپ لوگوں کو بتایا نہیں یا بتا کر یہ کہا۔

''کہنے دیں اسے، ہم اسے پریشرائز کر کے شادی کے لیے راضی کر والیں گے۔'' اور ودیعہ کمال کے بارے عمر حسن کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ رشتے داروں کے سامنے ماں باپ کی عزت کے خیال سے وہ خاموش ہو جائے گی۔ وہ بے جھجک اور بے خوف سب کے سامنے خود سری سے کھڑی تھی۔ وہ جیسی ہرگز بھی نہیں تھی، ویسا اس وقت کر کے دکھا ضرور رہی تھی۔

''ودیعہ......'' نائلہ نے اسے تنبیہی نظروں سے گھورا تھا۔

''مجھے بات کرنے دیں ممی! یہ میری زندگی کی بات ہے اور میری زندگی کا فیصلہ عمر حسن نہیں، میں خود کروں گی۔ اسے دیوتا بننے کا، دوسروں کو دان کرنے کا شوق چرایا ہے مگر مجھے نہ اس کا دیوتا پن قبول ہے اور نہ اس کی بھیک۔ میں عمر سے شادی نہیں کروں گی۔ یہی میرا آخری فیصلہ ہے۔''

''میں تمہیں بتاؤں گی کہ جس طرح تم مجھ سے محبت کرتے ہو، یہ کہتے ہو کہ تم میرے لیے کبھی نہیں بدلو گے، بالکل اسی طرح میں بھی تم سے

محبت کرتی ہوں اور میں بھی تمہارے لیے کبھی نہیں بدلوں گی۔''

زندگی میں کہاں پر اس سے غلطی ہوئی تھی، کون سی غلطی ہوئی تھی، کس کا دل دکھایا تھا اس نے، کون سا ایسا گناہ کرڈالا تھا جس کی سزا اس طور مل رہی تھی کہ کبھی نہ بدلنے کا عہد کرنے والی لڑکی آج اس سے علی الاعلان نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ کرب واذیت سے اپنے ہونٹوں کو کچلتا رہا اور وہ اپنی بات مکمل کرتے ہی وہاں مزید ایک پل ٹھہرے بغیر واپس چلی گئی۔

''آج جو تماشا ہوا اس پر میں، ممی، پاپا سے تو شرمندہ ہوں مگر تم سے ہرگز نہیں، اس لیے اس خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ میں تم سے معذرت کرنے آئی ہوں۔'' وہ اپنے کمرے میں دونوں ہاتھ لٹکائے اس طرح بیٹھا تھا جیسے اس کے ہاتھوں میں اب کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ وہ آنٹی، انکل سے شرمندہ تھا، بہت زیادہ شرمندہ۔ سب کے جانے کے بعد اس نے بڑی ندامت سے ان دونوں سے معافی مانگی تھی۔

آج کے واقعہ کا ذمہ دار اور قصوروار خود کو سمجھتا تھا۔ شرمندگی اور ندامت کی اسی کیفیت میں گھرا بیٹھا تھا، جس وقت وہ دیا اس کے کمرے میں آئی تھی۔

''آج کے تماشے سے اگر تمہارا دل نہیں بھرا تو کوئی اور تماشا کر دیکھو۔ آج تم نے تھوڑے سے لوگ جمع کیے تھے، چاہو تو سارا خاندان مع نکاح خواں اور گواہوں کے اکٹھا کرڈالو، میں تب بھی کسی جذباتی بلیک میلنگ کا شکار نہیں ہوں گی۔''

''دیا! مجھے لندن واپس پہنچنا ہے، فوراً۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''تو جاؤ میں نے تمہیں کب روکا ہے۔''

''میں تمہارے بغیر کیسے جاؤں؟ تمہیں اپنی زندگی میں چاہے میری ضرورت نہ ہو مگر مجھے میری زندگی میں تمہاری بہت ضرورت ہے دیا! پلیز مجھے آزماؤ مت، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے دیا!'' وہ کہہ چکی تھی کہ ''میں قائل نہیں ہوں گی'' پھر بھی وہ اسے قائل کرنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔

''یہ ڈائیلاگز اگر تم اپنے کسی ناول میں لکھو تو پڑھنے والوں کو بہت اچھے لگیں گے مگر یہ زندگی ہے، عمر حسن! ایک حقیقی زندگی۔ یہ تمہارے کسی ناول کا کوئی سین نہیں کہ جس میں ایک کردار دوسرے پر جان نچھاور کر کے دیوتا بن جائے اور دوسرا اس کا پجاری اور پڑھنے والے خوش۔ بھئی واہ کیا محبت ہے، سچی محبت ہے۔''

''میں تمہارے بغیر نہیں جاؤں گا دیا!'' اس کے طنزیہ جملوں کا اثر قبول کیے بغیر وہ بچوں کے سے ضدی لہجے میں بولا۔

''تو نہ جاؤ، بیٹھے رہو ساری زندگی یہاں میرے انتظار میں۔ ہاں بس یہ یاد رکھنا کہ آج جیسا کوئی تماشا پھر کبھی نہ ہو، ورنہ نتائج کی ذمہ دار میں نہیں تم ہوگے۔'' وہ جس طرح تنفر اور تمسخر لیے اس کے کمرے میں آئی تھی، اسی طرح نکل کر چلی بھی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا، زندگی جس رخ پر جس رفتار سے جا رہی تھی وہ اسے بدلنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ وہ آج کل گھر پر بہت کم دیر کے لیے جا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر غصے میں آجاتی ہے پھر غصے میں کھاتی پیتی بھی نہیں اور پھر اپنے والدین اور دوسرے سب لوگوں کے ساتھ بھی بدسلوکی کرتی ہے، اسی لیے اس نے گھر پر رہنا اور رات وہاں پر سونا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ وہ اس کے پاس جانا نہیں چھوڑ سکتا تو اسے کم تو کر سکتا ہے، کسی اور کے لیے نہیں، صرف ودیعہ ہی کی صحت اور خوشی کی خاطر۔ وہ دن بھر میں ایک مرتبہ فون کر کے اس کی خیریت پوچھ لیتا اور ایک مرتبہ تھوڑی سی دیر کے لیے گھر آجاتا۔ کمال، نائلہ اور بوا جی سے ملتا اور محض چند سیکنڈز کے لیے اس کے کمرے میں جا کر اس سے ''السلام علیکم'' اور ''کیسی ہو'' جیسی مختصر بات کر کے باہر آجاتا۔ وہ اسے جواب دیے بغیر اپنا کام کرتی رہتی اور وہ چونکہ اس چیز کے لیے خود کو تیار کر کے لاتا تھا، اسی لیے جواب کا صرف ایک سیکنڈ انتظار کر کے اسے پھر سے اس کے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر یونہی باہر بھی آجاتا تھا۔

ایسا کب تک چلے گا، وہ نہیں جانتا تھا مگر پانچویں روز جب اس نے گھر پر فون کیا تو کال ودیعہ نے ریسیو کی۔ اسے لگا وہ اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دے گی۔ اپنے کمرے سے نکلنا، لوگوں سے ملنا، ٹیلی فون کالز اٹینڈ کرنا اس نے سب ہی کچھ چھوڑا ہوا تھا پھر نجانے آج اس نے فون اٹینڈ کر کیسے لیا تھا؟

''کیسی ہو؟'' ہچکچائے ہوئے انداز میں اس نے اس کی خیریت پوچھی۔ اس خوف میں گھر کر کہ وہ جواب دیے بغیر ریسیور کریڈل پر رکھ دے گی۔

''ٹھیک ہوں، تم ٹھیک ہو؟'' وہ اس لب و لہجے پر ساکت رہ گیا۔ اتنے دنوں سے جس سختی اور تلخی کو سہنے کا وہ عادی ہو چلا تھا آج اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں۔'' اس نے قدرے محتاط انداز میں اسے جواب دیا۔

''تم آج گھر نہیں آئے؟'' وہ اس سوال پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔

''ہاں وہ میں آنے کا سوچ ہی رہا تھا۔'' حیرت میں گھرے اس نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔

''سوچو مت، فوراً آجاؤ۔ میں فروٹ کیک بنا رہی ہوں اور آثار بتا رہے ہیں کہ کیک اچھا بننے والا ہے۔ جلدی سے آجاؤ، ہم چائے ساتھ پئیں گے۔'' ودیعہ نے اسے جلدی پہنچنے کی تاکید کر کے خدا حافظ کہہ دیا تھا اور وہ فون کے پاس کتنی دیر تک بیٹھا اس کے رویے کی تبدیلی کا سبب سوچتا رہا تھا۔ خود ترسی کی جس کیفیت کا وہ شکار تھی، آخر کار اس نے خود کو اس سے باہر نکال ہی لیا تھا اور ایسا کیوں نہ ہوتا؟ وہ ودیعہ کمال تھی، کوئی عام لڑکی نہیں، وہ بس یہی سوچ کر خوش ہو گیا کہ ودیعہ نے زندگی سے دور بھاگنے کے بجائے اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا ہے۔

''اللہ کا لاکھ شکر ہے عمر! ودیعہ پہلے جیسی ہو رہی ہے۔ کل شام سے اس کے مزاج میں تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ کل شام میں اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھ کر خوب باتیں کیں۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا پھر آج صبح مجھ سے خود فرمائش کی کہ مجھے بازار لے چلیں۔ میں گھر پر بور ہو رہی ہوں۔ اس نے بازار میں میرے ساتھ اپنی پسند کی بہت ساری شاپنگ کی اور اب کچن میں گھسی کام کر رہی ہے۔'' نائلہ نے اسے خوشی سے سرشار لہجے میں یہ

اطلاع لاؤنج ہی میں دے دی تھی۔

وہ مسکراتا ہوا کچن میں آیا تو وہ بواجی کے ساتھ مل کر کام کرتی نظر آئی۔

''آ گئے تم۔'' عمر کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔

''بالکل ٹھیک وقت پر آ گئے۔ کیک بالکل تیار اور چائے بھی، بس میں نکال رہی ہوں۔'' اس کے لہجے میں، اس کے برتاؤ میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں تھا، وہ اس سے اسی لہجے میں بات کر رہی تھی جس میں بچپن سے کرتی آئی تھی۔

''چلو لان میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔'' چائے بنا کر اس نے کپس ٹرے میں رکھے، پلیٹیں رکھیں، کیک اور چھری رکھی اور پھر ٹرے عمر کے ہاتھ میں پکڑا دی۔

''بواجی! آپ کی اور ممی کی چائے بھی نکال دی ہے میں نے۔'' بواجی نے مسکراتے ہوئے گردن ہلائی تو وہ عمر کی طرف پھر سے متوجہ ہوئی۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو، لان میں چلو بھئی۔'' وہ بیساکھی کے سہارے چلتی آگے بڑھی اور وہ ٹرے ہاتھ میں لیے کچھ گم صم سا اس کے پیچھے۔ ٹرے میز پر رکھنے کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے لان چیئرز پر بیٹھ چکے تھے۔

''اتنے چپ ہو کر کیوں بیٹھ گئے ہو؟ کچھ بات کرو۔'' ودیعہ نے کیک کا ایک بڑا سا پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھا اور عمر کی طرف بڑھایا۔ زندگی میں پہلی بار ودیعہ کے ہاتھ کی بنی کوئی چیز کھانے کو اس کا جی نہ چاہا پھر بھی اس نے پلیٹ لے لی۔ اس نے خود بھی اپنے لیے ایک پیس کاٹ لیا تھا اور کھانا بھی شروع کر دیا تھا جبکہ وہ پلیٹ ہاتھ میں لیے ویسا ہی بیٹھا تھا۔

''تمہارے مسودے کا کیا بنا؟ اور کتنے دن لگاؤ گے نظر ثانی کرنے میں۔ جان بکھم بیٹھا لندن میں تمہاری جان کو رو رہا ہوگا اور تمہارے فینز فون کر کے اور خط لکھ لکھ کر اسے اور الزبتھ کو عاجز کر رہے ہوں گے۔

''ہمارے ہر دل عزیز عمر حسن کا ناول آخر اپنا جلوہ کب دکھائے گا۔'' کچھ خدا خوف کرو، جلدی سے مسودہ روانہ کرو۔''

وہ خود ہی سوال کرنے اور خود ہی جواب دینے میں مصروف تھی۔ وہ خاموشی سے ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اس کا دل ایک عجیب بات اسے کہہ رہا تھا۔

''عمر حسن! آج یہ چہرہ تم آخری بار دیکھ رہے ہو۔'' اس کے دل کی حالت اس مریض جیسی ہو رہی تھی جو اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو، مدھم ہوتے ہوتے جس کے دل کی دھڑکنیں کسی بھی پل رک جانے والی ہوں۔

''عمر! میں اپنی جاب دوبارہ جوائن کر رہی ہوں۔ پانچ چھ مہینے بہت ہوتے ہیں گھر پر رہنے اور آرام کرنے کے لیے۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے پھر گھر پر رہ کر کیا کروں اور وہ جو تم مجھے مصنوعی ٹانگ لگوانے والا مشورہ دے رہے تھے، میں بھی سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ بیساکھی یا ویل چیئر کے ساتھ مجھے نارمل زندگی گزارنے میں دقت ہوتی ہے لیکن ٹانگ لگوا لینے کے بعد تو پھر میں واقعی اپنے روزمرہ کے تمام کام اطمینان سے کر سکوں گی۔'' وہ مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں اپنی معذوری اور مستقبل کے ارادے اس سے

ڈسکس کر رہی تھی۔

''یہ زندگی بھی بڑی عجیب ہے عمر! کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ آسمان پر اڑتے پرندوں کو بغور دیکھتے ہوئے بولی جو شام کے رخصت ہوتے ان لمحوں میں اپنے اپنے گھونسلوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔

''جو ہم اس سے مانگتے ہیں، وہ یہ ہمیں نہیں دیتی جو نہیں مانگتے، وہ بن مانگے دے دیتی ہے۔ اسی مانگنے نہ مانگنے اور حاصل ہو جانے نہ ہو پانے سے زندگی سے ہمارے گلے، شکوے شروع ہوتے ہیں۔ ہم انسان بڑے ناشکرے ہیں عمر! بڑے ناشکرے۔ جانتے ہو مجھے اس بات کا احساس کب ہوا۔ پرسوں میں ممی، پاپا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ وہاں ایک بچہ، شاید سات آٹھ سال کا ہوگا اسے میں نے ہسپتال کے گارڈن میں دیکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ تھا۔ میری تو ایک ٹانگ نہیں ہے اور اس کا پورا کا پورا دھڑ...... مفلوج تھا۔ وہ نہ اٹھ سکتا تھا، نہ کھڑا ہو سکتا تھا، نہ چل سکتا تھا۔ گارڈن میں فٹ بال کھیلتے چند بچوں کو وہ اتنی معصومیت سے ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں مایوسی اور زندگی سے نفرت نہیں بلکہ خوشی تھی۔ مجھے اس پل اپنے آپ پر بڑی شرم آئی عمر! وہ اتنا چھوٹا سا بچہ، جب وہ اللہ کی رضا میں راضی رہ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں؟ کیا اس کا دل نہیں چاہتا ہوگا کہ وہ اپنے عمر کے بچوں کی طرح دوڑے، بھاگے، چھلانگیں لگائے، اچھلے کودے؟ کہاں وہ سات سال کا بچہ اور کہاں میں تئیس سال کی لڑکی۔ اس کی سمجھ میں اتنی چھوٹی سی بات آگئی اور میرے نہ آئی۔ یہ میرے اللہ کی مرضی ہے کہ میں اپنی بقیہ زندگی اس معذوری کے ساتھ گزاروں۔ یہ اس کی عنایت تھی، اس کا کرم تھا کہ اس نے مجھے دونوں ہاتھوں اور دونوں ٹانگوں کے ساتھ پیدا کیا۔ میرا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ مجھے معذور ہی پیدا کرتا پھر میں کیا کر لیتی؟ کیا میں اللہ سے کیوں، کیا، کس لیے پوچھنے کا حق رکھتی ہوں؟ جو اس نے دیا، وہ اس کی نعمت ہے اور جو واپس لے لیا وہ اس کی امانت تھی۔ ہمیں شکر ادا کرنا نہیں آتا۔ ہاں گلے شکوے کرنے بہت آتے ہیں۔ میں نے اس بات پر اس کا شکر ادا نہیں کیا کہ میری دوسری ٹانگ بچ گئی، میرے دونوں ہاتھ بچ گئے۔ میری بصیرت، میری سماعت سب ٹھیک ہیں۔ اگر میں، اگر میں پوری کی پوری اپاہج ہو جاتی پھر...... ان کا کیا قصور ہوتا ہے جو وہ معذوری کی زندگی گزارتے ہیں اور میں نے ایسا کیا کارنامہ کیا ہے، جو اللہ مجھ سے کچھ واپس نہ لے۔ ایک بار میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اپنی مرضی اور اللہ کی مرضی میں فرق کا نام غم ہے۔ یہی تو میں بھی کر رہی تھی عمر! جو میں چاہتی تھی اللہ نے میرے لیے وہ کیوں نہ چاہا؟ مجھے خود پر اتنی ندامت ہو رہی ہے عمر! اتنی زیادہ کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ اپنی خود ترسی اور غم میں ڈوب کر میں نے اللہ کو تو ناراض کیا ہی ہے، ساتھ میں تم سب کا بھی بہت دل دکھایا ہے۔ جو میرے ساتھ ہوا، اس میں تم میں سے کسی کا کوئی قصور نہیں تھا، تم سب تو میری تکلیف کو اپنے دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہے تھے، پریشان ہو رہے تھے۔ کتنی خود غرضی کا مظاہرہ کر رہی تھی میں عمر! میں سب سے شرمندہ ہوں عمر! تم سب سے۔ سب سے زیادہ تم سے۔ میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے۔ مجھے تم سے معافی مانگتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ مجھے معاف کر دو عمر! پلیز مجھے معاف کر دو، میری ہر بدتمیزی کے لیے۔'' وہ بڑی پشیمانی اور ندامت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تم نے مجھ سے ایسا کچھ نہیں کہا ہے دیا! جس کے لیے تمہیں مجھ سے معافی مانگنی پڑے اور اگر کہا ہوتا تو میں تب بھی تمہاری کسی بات کا برا نہ مانتا۔ تم جانتی ہو نا یہ بات پھر بھی مجھ سے معافی مانگ رہی ہو؟'' وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا۔

''صرف معافی نہیں مانگ رہی، میں آج تم سے اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں، ہم دونوں کے مستقبل کے بارے میں۔''

''دیا! تم......''

''تم ابھی کچھ مت کہو! جو میں بولنا چاہتی ہوں پہلے وہ سن لو۔'' اس نے عمر کو بولنے سے روک دیا۔ وہ لب بھینچ کر بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

''ہم نے ایک دوسرے سے محبت کی، ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساری زندگی گزارنا چاہتے تھے، ہم شادی کر رہے تھے کہ اچانک یہ حادثہ ہو گیا۔ کیا یہ ضروری ہوتا ہے عمر کہ جس سے ہم محبت کریں، شادی بھی اس سے ہی کریں؟ کیا اگر ہماری شادی نہ ہوئی تو ہمارے دلوں سے ایک دوسرے کی محبت ختم ہو جائے گی؟ نہیں عمر! محبت ایسے ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ محبت کی تو تکمیل ہی اس وقت ہوتی ہے جب اس میں جدائی آ جائے۔ میں تمہارے دل میں ایک خوب صورت یاد بن کر سدا وہاں رہنا چاہتی ہوں، تمہاری زندگی پر ایک کبھی نہ ختم ہونے والا بوجھ بن کر نہیں۔ نہیں، ابھی کچھ مت کہو۔ ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔'' اس نے عمر کو لب کھولتے دیکھ کر فوراً ٹوکا۔

''مجھے تمہاری محبت پر قطعاً کوئی شک نہیں۔ اس سے پہلے جب جب غصے میں، میں نے تم سے جو کچھ بھی کہا تو دل سے نہیں کہا تھا۔ میرے دل کو یہ یقین ہے کہ تم اپنی محبت میں بالکل سچے اور ثابت قدم ہو، تم زندگی کی آخری سانسوں تک میرا ساتھ نبھاؤ گے، تم کبھی مجھ سے بیزار نہیں ہو گے، تنگ نہیں آؤ گے۔ تم مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہے بلکہ اپنی وفا نبھا رہے ہو، میں یہ بھی جانتی ہوں پھر بھی میں یہ چاہتی ہوں عمر کہ یہ شادی نہ ہو۔ تم ساری زندگی اپنے ایک گھر کے لیے ترسے ہو، اپنی ایک فیملی کے لیے ترسے ہو۔ میرا ساتھ تمہاری زندگی کے اس خلا کو کبھی اس طرح بھر نہیں پائے گا۔ تھوڑا سا حقیقت پسند بن کر سوچو، میں تمہارے لیے کیسی بیوی ثابت ہوں گی؟ تمہارے بچوں کی کیسی ماں بنوں گی؟ محبت بہت کچھ ہے عمر! لیکن محبت سب کچھ نہیں۔ زندگی کی باقی تمام سچائیوں سے منہ موڑ کر ہم صرف محبت کے سہارے اسے نہیں گزار سکتے۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اس کے باوجود ہم کبھی بھی ایک نارمل زندگی نہیں گزار پائیں گے۔ میں تمہیں تمہارا وہ خواب کا گھر کبھی نہیں دے پاؤں گی جس کی تم نے ہمیشہ آرزو کی ہے۔ یہ میں نہیں سمجھوں گی، تو کون سمجھے گا؟ میں ہمیشہ ایک چاہتوں اور رشتوں سے مہکتے گھر میں رہی ہوں۔ جان چھڑکنے والے دادا، پیار کرنے والے ماں باپ، مجھے زندگی میں گھر، رشتے، پرسکون ماحول سب کچھ ملا ہے اور تمہیں......؟ تمہیں گھر تو ملا، پرسکون ماحول اور رشتے بھی ملے مگر میری طرح حق کے ساتھ نہیں۔ تم نے انہیں احسان کی طرح وصول کیا۔ تمہاری زندگی کا یہ خلا بہت بڑا ہے اور اس کا بھرا جانا بے حد ضروری ہے۔ میں تمہیں وہ پرسکون گھر اور گھریلو زندگی نہیں دے پاؤں گی عمر! جس کی تمہاری زندگی میں ہمیشہ کمی رہی ہے۔ بچپن میں جو محرومیاں تم نے سہی ہیں، تم چاہو گے کہ تمہارے بچے کبھی ان کا شکار نہ ہوں۔ تم ایک بہت محبت کرنے والے اور اپنے بچوں پر جان لٹانے والے باپ بنو گے اور میں تمہارے بچوں کی کیسی ماں بنوں گی؟ کتنا بھی اپنی اس کمی کے ساتھ سمجھوتا کر لوں، اسے قبول کر لوں لیکن کمی مجھ میں ہے تو سہی نا۔ کیا میں انہیں وہ سب دے پاؤں گی جو تم انہیں دینا چاہو گے؟ زندگی کی مشکلات میں کٹھن راستوں اور دشوار راہوں میں، میں تمہارا سہارا نہیں بن پاؤں گی۔ تمہاری ضرورتیں اس طرح پوری نہیں کر پاؤں گی جیسے ایک نارمل اور آئیڈیل بیوی کو کرنا چاہیے۔ مجھے پتا ہے تم مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں کرو گے لیکن میرا ضمیر...... وہ تو مجھے ملامت کرے گا پھر میں ہر پل تم سے شرمندہ رہا کروں گی، نادم رہا کروں گی، احساس جرم کا شکار رہا کروں گی مگر محبت میں تم سے نہیں کر پاؤں گی۔ میرا

احساس جرم مجھے اس قابل چھوڑے گا ہی نہیں کہ میں تم سے محبت کر پاؤں۔ پلیز عمر! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور لہجہ التجائیہ۔ وہ التجا کرتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی اور عمر حسن وہ بس خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اب کچھ بھی بولنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ مدھم ہوتے ہوئے اس کی دھڑکنیں شاید رک ہی گئی تھیں۔

"ہم نے ساری زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزارنے کے خواب دیکھے تھے لیکن ہمارا ہر خواب سچ ہو جائے، یہ ممکن تو نہیں ہے نا۔ زندگی میں سب کچھ تو کسی کو بھی نہیں ملتا۔ ہمیں تقدیر کے اس فیصلے کو مان لینا چاہیے عمر! کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ میں تم سے یہ نہیں کہہ رہی کہ تم مجھے بھلا دو، مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو۔ تم مجھ سے محبت کرنا، تم مجھے اپنے دل میں ایک خوب صورت یاد کی طرح ہمیشہ وہاں رکھنا لیکن عمر! تم کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لو، کسی بہت اچھی لڑکی سے۔ ایسی لڑکی جو تمہیں ہر طرح آسودہ اور خوش رکھ سکے۔ جو تمہاری ذہنی اور جذباتی سب ضرورتیں پوری کر سکے جو قدم سے قدم ملا کر تمہارے ساتھ چل سکے۔ تم اس سے بھی محبت کرنے لگو گے۔ یہ تمہاری مجھ سے بے وفائی نہیں بلکہ اپنی بیوی سے وفاداری ہوگی۔ میں بھی آنے والے ایک دو سالوں میں کسی اپنے جیسے نامکمل اور ادھورے انسان کے ساتھ شادی کر کے زندگی کی ایک نئی سمت کا تعین کر لوں گی۔ دو نامکمل انسان مل کر ایک مکمل زندگی گزار سکتے ہیں لیکن ایک مکمل اور ایک نامکمل انسان کبھی ایک مکمل زندگی نہیں جی سکتے۔ ان کی زندگی میں ہمیشہ ایک کمی رہتی ہے۔"

وہ اس کی مسلسل چپ سے اگر یہ سمجھ رہی تھی کہ اسے قائل کر چکی ہے تو یہ ودیعہ کمال کی زندگی کی سب سے بڑی بھول تھی۔

"تم میری بات سمجھ رہے ہو نا عمر؟" زندگی اس کے اندر مر رہی تھی، وہ کیا سنتا اور کیا سمجھتا؟

"میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا عمر! ہماری سولہ سالوں کی محبت میں آج پہلی بار کچھ مانگنا چاہتی ہوں۔ بولو عمر! کیا جو آج میں تم سے مانگوں گی تم مجھے دو گے؟" اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں بولتے ہوئے ایک دم ہی عمر کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے تھے۔ وہ پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ودیعہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ان آنسوؤں کو خشک کرنے کے لیے عمر حسن کے ہاتھ اٹھ نہیں پائے تھے۔

"میری زندگی سے نکل جاؤ عمر! پلیز میری زندگی سے نکل جاؤ۔ میں تمہیں اس محبت کا واسطہ دے رہی ہوں جو تمہیں مجھ سے ہے۔ پلیز کہیں دور چلے جاؤ، کہیں بہت دور، مجھ سے دور۔ میرے اس گھر، اس شہر سے دور، بہت دور، میری زندگی سے دور۔ ہم زندگی میں پھر کبھی نہ ملیں اتنی دور۔"

کیا مانگ رہی تھی وہ اس سے؟ اس کی زندگی سے؟ پر وہ اسے انکار کیسے کر سکتا تھا۔ ودیعہ کمال کو انکار کرنا عمر حسن کو آتا نہیں تھا۔

عمر حسن بڑے بڑے نقاد جسے لفظوں کا جادوگر کہا کرتے تھے آج اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی بڑی خاموشی سے ہار رہا تھا۔ اسے زندگی بھر کے لیے شہر محبت سے جلا وطنی کی سزا سنائی جا رہی تھی۔ وہ غلط تھی، سراسر غلط تھی۔ اس کا ہر فلسفہ اور ہر دلیل غلط تھی۔ پر عمر حسن کو اسے نہ کہنا، آتا نہیں۔ محبت کے نام پر کی جانے والی ناجائز خواہش پر خود کو قربان کرنے کو وہ تیار ہو گیا تھا۔

اس نے اپنے ہاتھوں پر رکھے اس کے نرم و ملائم اور نازک ہاتھ بڑی آہستگی سے ہٹائے اور پھر کرسی پر سے اٹھا۔ ایک پل کو اسے ساری

کائنات چکراتی نظر آئی۔ گردوپیش کا سارا منظر اس کی نگاہوں میں گول گول گھومنے لگا۔ کرسی کی پشت کو تھام کر اس نے خود کو گرنے سے بچایا۔

''عمر......'' شاید کوئی الوداعی جملہ ادا کرنا رہ گیا تھا۔

''اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا، مجھے یاد کر کے کبھی اداس مت ہونا، کسی بہت اچھی لڑکی سے شادی کر لینا، لندن واپس چلے جانا، اپنا کیریئر بنانا اور ہاں سب سے اہم بات کبھی لکھنا مت چھوڑنا، وعدہ کرو کہ تم لکھنا نہیں چھوڑو گے۔''

یہی سب ناں؟ وہ ان جملوں میں سے کوئی ایک جملہ بھی سننا نہیں چاہتا، وہ اب کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ جب اس کی بات مان کر، اپنی زندگی گنوا کر وہ جا ہی رہا ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اسے پیچھے سے آواز دی جائے۔ محبت کا واسطہ دے کر، محبت کے نام پر اس سے کوئی ناجائز بات منوائی جائے۔ وہ شاید اس کے پیچھے اٹھ کر آ رہی تھی مگر اس نے اپنے قدموں کی رفتار ایک دم ہی تیز کر دی تھی۔ محبت کے نام پر اور کوئی وعدہ نہیں، مزید کوئی امتحان نہیں۔ جدائی کے جس تپتے، جھلستے صحرا میں اسے زندگی بھر کے لیے دھکیلا جا رہا تھا یہی ایک آزمائش زندگی بھر کے لیے کافی تھی۔ وہ نہ رکا، نہ ٹھہرا، نہ پلٹ کر اس آواز دینے والی کو دیکھا۔

☆☆☆

وہ وہاں کیوں آیا تھا؟ کس لیے آیا تھا؟ کیا اپنی مرگِ محبت کا ماتم کرنے؟ شامِ غریباں منانے؟ اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولتے اس نے خود سے پوچھا۔ آخری بار جب یہاں آیا تھا تو یہ سوچ کر کہ اگلی بار جب یہاں آئے گا تو تنہا نہیں ہوگا لیکن جب تنہائی نصیب میں لکھی ہو تو نصیب کا لکھا کوئی کیسے مٹائے؟ آج چھ مہینوں بعد وہ اس اپارٹمنٹ میں کھڑا تھا جہاں قدم قدم پر اس کے بچھائے پھول اپنی حرماں نصیبی کا ماتم کر رہے تھے۔ وہ مرجھا چکے تھے، خشک ہو کر بکھر چکے تھے۔ وہ پھول بھی شاید روتے روتے مرجھائے تھے، تب ہی تو فضا میں اپنی خوشبو چھوڑ گئے تھے، وہ بھی اداس اور سوگوار تھی۔

''ہمیں جس کے لیے سجایا گیا، بچھایا گیا وہ کہاں ہے؟ اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟'' دروازے سے لے کر کمرے تک جاتے پورے راستے میں بچھے ان مرجھائے ہوئے خشک پھولوں نے بڑی بے رحمی سے اس سے پوچھا۔ وہ پھول اس سے خفا تھے۔ وہ ان پر چلتا اپنے کمرے تک آ گیا۔

دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو گلاب کی ڈھیر ساری خشک و بے رنگ پتیاں اس پر گرنا شروع ہو گئیں۔ مرجھائی پتیوں کی اس برسات میں وہ اکیلا کھڑا تھا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے کمرے کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ سامنے بیڈ پر وہ دلہن بنی بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

''دیا! تم آج بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔''

''اس میں نئی بات کیا ہے؟ یہ جملہ تو آج سب نے مجھ سے کہا ہے۔'' دیوانہ وار وہ بیڈ کی طرف بھاگا مگر اس کے قریب جاتے ہی وہ وہاں سے غائب ہو گئی۔ شکست خوردہ وہ وہاں سے پلٹا۔

''تمہارا ارادہ مجھے بیوی بنانے کا ہے یا نوکرانی؟'' وہ ایک دم ہی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ لڑاکا بیویوں کی طرح کمر پر ہاتھ رکھے اسے گھورتی ہوئی۔

''دونوں۔'' اس کے لبوں سے بے اختیار یہ لفظ نکلا۔ اس بار اسے اپنے سامنے دیکھ کر وہ حقیقتاً مسکرایا تھا۔

مگر پھر فوراً ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ مسکراہٹ کی جگہ آنکھوں میں آنسوؤں نے لے لی۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی جمع ہوگیا تھا۔

''میں تمہیں بتاؤں گی کہ جس طرح تم مجھ سے محبت کرتے ہو، یہ کہتے ہو کہ تم میرے لیے کبھی نہیں بدلو گے۔ بالکل اسی طرح میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں اور میں بھی تمہارے لیے کبھی نہیں بدلوں گی۔''

''پھر آج تم کیوں بدل گئیں؟ دیکھو میں تو بالکل نہیں بدلا۔'' وہ چلا کر بولا۔

''تمہیں پتا ہے عمر! جب کوئی تمہاری تعریف کرتا ہے تو مجھے کیسا لگتا ہے؟ بالکل ایسا جیسے یہ تمہاری نہیں میری تعریف ہے۔'' وہ بھاگتا ہوا کمرے میں آیا اور بک شیلف میں سے اپنی کتاب نکال لی ''محبت کے نام'' پہلا صفحہ کھولتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''جب تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ تم صرف میرے لیے لکھتے ہو تو تمہارا یہ کہنا مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''جب میں بھی اچھا، میرا سب کہنا سننا بھی اچھا پھر یہ سنگدلانہ فیصلہ کیوں؟'' اس نے روتے روتے خود کلامی کی۔

''تھوڑا سا حقیقت پسند بن کر سوچو، میں تمہارے لیے کیسی بیوی ثابت ہوں گی، تمہارے بچوں کی کیسی ماں ہوں گی؟ میں تمہیں تمہارا وہ خوابوں کا گھر کبھی نہیں دے پاؤں گی جس کی تم نے ہمیشہ آرزو کی ہے۔'' وہ اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی تھی۔

''حقیقت پسند؟'' روتے روتے وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

''کتنی اچھی ہو تم جو حقیقت پسندی سے سوچتی ہو۔ برا تو میں ہوں جو خوابوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔'' وہ استہزائیہ انداز میں خود پر قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور لبوں پر استہزائیہ قہقہے تھے۔

''اور اس حقیقت پسندی میں بھی تمہیں میرے خواب یاد رہے۔ میرا محبتوں سے مہکتے ایک گھر کا خواب۔ تم نے اسے یاد رکھا۔ کتنی سچی محبت ہے تمہیں مجھ سے۔ تم میرے خوابوں تک سے پیار کرتی ہو لیکن تمہیں ایک بات یاد نہیں رہی دیا! میں نے ''میرے'' گھر کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا، میں نے ''ہمارے'' گھر کا خواب دیکھا تھا۔ میں نے زندگی سے بہت کچھ کبھی نہیں مانگا۔ میں نے زندگی سے صرف محبت مانگی تھی اور میں محبت کے کہتا ہوں، معلوم ہے نا تمہیں؟ نہ، نہ اب کچھ مت بولو۔ میں نے تمہاری سب باتیں خاموشی سے سنی تھیں۔ اب تم بھی سنو، تم مجھ سے محبت تو کرتی ہو دیا! پر ویسی نہیں جیسی میں تم سے کرتا ہوں۔ تم محبت میں انا رکھتی ہو اور میری محبت میں کہیں انا نہیں۔ ہاں دیا! آج تمہارے بارے میں ایک بات جانی ہے میں نے۔ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو مگر مجھ سے بھی کہیں زیادہ تم اپنی انا سے محبت کرتی ہو۔ تم اپنی انا سے اتنی محبت کرتی ہو کہ اس کے پیچھے تمہیں کوئی رشتہ اور کوئی جذبہ نظر نہیں آتا۔ تمہاری انا، تمہاری خودداری، تمہاری عزت نفس ان سب کو میں بھی عزیز تر رکھتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ ایک روز وہ تمہیں اتنی عزیز ہو جائے گی کہ اسے سربلند رکھنے کے لیے تم اپنی محبت کو اس کی بھینٹ چڑھا دو گی۔ تمہاری شخصیت کا ایک پہلو، تمہاری فطرت کا ایک رخ جس سے میں ہمیشہ صرف نظر انداز کرتا رہا۔ وہی ایک پہلو، وہی ایک رخ ایک روز مجھ سے میری زندگی کی تمام خوشیاں چھین لے گا۔ اگر جانتا ہوتا تو کبھی اسے نظر انداز نہ کرتا۔ وہ سب کو دینا چاہتی ہے مگر لینا کسی سے نہیں۔ وہ سب پر مہربانیاں کرے پر کوئی اس پر مہربانی نہ کرے اور اس

''سب'' لفظ میں سب شامل ہیں، سب۔ عمر حسن بھی اور ایسار وزاول سے ہے۔ ہاں دیا! تم نے ہمارے رشتے کو بھی ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا ہے۔

میں تمہیں تم سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔ تم نے ہمیشہ مجھے دیا مگر کبھی بھی مجھ سے کچھ لینا گوارا نہیں کیا پھر آج میری محبت جس پر تمہیں بھروسہ اور یقین تو ہے مگر جو تمہیں خود سے بدتر نظر آنے لگی ہے کیونکر قبول کروگی؟ تمہیں مجھ سے جدا ہونا گوارا ہے پر اپنی انا کی شکست منظور نہیں۔

گزرے برسوں کے کتنے واقعات تھے، کتنی باتیں تھی جو مجھے کرب میں مبتلا کر دیا کرتی تھیں جو مجھے بہت دکھ دیتی تھیں اور پھر میں تمہارے ان رویوں کی توجیہات تلاشتا تھا، اپنی خامیاں ڈھونڈتا تھا۔

''دیا سمجھ دار ہے، میچور ہے۔ میں جذباتی ہوں، بے وقوف ہوں۔ ہر بات کو جذباتی انداز میں حساس ہو کر بہت سوچتا ہوں اور پھر دکھی ہونے لگتا ہوں۔'' ودیعہ کمال..... پختہ سوچ، سمجھ دار، میچور۔ عمر حسن جذباتی، احمق، بے وقوف۔ پر مجھے بتاؤ دیا! آج میں کیا کروں؟ آج تمہارے کسی رویے کی وہ توجیہہ نہیں ڈھونڈ پا رہا جو ہمیشہ ڈھونڈ لیا کرتا تھا۔ آج اپنی خامیاں تلاش کرنے میں ناکام ہو رہا ہوں۔ آج میرے ہی اندر کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ ہاں عمر حسن جذباتی ہے مگر ودیعہ کمال کی طرح انا پرست نہیں۔ آج جذباتی عمر حسن انا پرست ودیعہ کمال کی سب سچائیاں دیکھ رہا ہے۔

جب وہ کم تر تھا، تب ودیعہ نے اسے قبول کیا مگر جب اسے ایسا لگا کہ اب وہ عمر حسن سے کم تر ہوگئی ہے تو اپنی انا کو سر بلند رکھتے اپنا راستہ الگ کر گئی۔

''تم سب سے بہتر ہو، تم سب سے برتر ہو، تم سب سے اچھے ہو، تم لکھ سکتے ہو، تم لکھ کر اسے چھپوا سکتے ہو، تم سب کچھ کر سکتے ہو۔'' اسے یہ یقین دلاتی، قدم قدم اس کا ساتھ نبھاتی وہ اسے گمنامی سے شہرت کی بلندیوں پر لے گئی۔ ودیعہ کے کسی فعل کو، کسی عمل کو، کسی بات کو عمر حسن نے احسان نہیں سمجھا۔ ہمیشہ اس کی محبت جانا اور اس محبت کو ہمیشہ پورے حق کے ساتھ وصول کیا۔ پر آج دل کو یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا کہ وہ محبت ایک احسان تھی، ایک عطا تھی، ایک بھیک تھی۔ وہ محبت میں ایک دوسرے سے برابری کے درجے پر نہیں کھڑے تھے۔ ودیعہ کمال بہت اونچائی پر تھی، عمر حسن بہت نیچے تھا لیکن اگر کبھی وقت بدلا تو وہ لینے والی سیڑھی پر کبھی کھڑی نہیں ہوگی۔ وہ عمر حسن سے صرف اپنی خوشیاں اور اپنے سکھ بانٹے گی، اپنے آنسو اور اپنے دکھ نہیں۔ وہ صرف اس کی خوشیوں کا ساتھی ہے، دکھوں کا نہیں۔ زندگی کی چھاؤں میں وہ اس کے ساتھ چل سکتا ہے مگر تپتی جھلستی دھوپ وہ تنہا سہے گی۔ جب وہ اس کے قابل نہیں تھا، تب وہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرلے گی۔ اس کے نام کی انگوٹھی پہن لے گی۔

اور جب یوں ہوا کہ اس کی اپنی دانست میں وہ عمر کے قابل نہیں رہی تو اسے اپنی زندگی سے نکالنے کا فیصلہ بھی خود کرلیا۔ ہم زندگی ساتھ گزاریں گے کا فیصلہ بھی خود اور ہم زندگی بھر اب کبھی ملیں گے نہیں کا فیصلہ بھی خود۔ پہلے فیصلے میں محبت اور انا دونوں سر بلند تھیں، دونوں خوش تھیں۔

ہسپتال سے گھر آنے کے بعد اس حادثے کے ساتھ سمجھوتا کرتے جب تم نے اپنے مستقبل کو سوچنا شروع کیا تو اس مستقبل میں سے عمر حسن کو نکال دیا..... عمر حسن کا وجود تمہارے پاس جانے سے رک نہیں رہا تھا جو تم سے محبت کرتے رہنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ غصہ، تحقیر، نفرت یہ تمام ہتھیار اس کی پیش قدمی روکنے ہی کے لیے استعمال کیے گئے تھے۔ شاید وہ ان سے خائف ہو کر پیچھے ہٹ جائے، شادی کی بات کرنے ہی نہ پائے مگر وہ یہ بات کیوں نہ کرتا؟ ودیعہ کمال کے تمام تر بدترین اور بدصورت رویوں کے باوجود اس نے ایسا کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اب ان کی شادی نہیں ہوسکتی۔

سو جب یہ دیکھا گیا کہ عمر حسن کسی تحقیر، کسی تذلیل اور کسی نفرت سے بھی پیچھے نہیں ہٹ رہا تو پھر اسی کی محبت کو اس کے خلاف استعمال کر ڈالا۔

''تم نے میری محبت کو ہتھیار بنا کر مجھ ہی کو مار ڈالا۔ اتنی بے رحمی، اتنی سنگ دلی کے ساتھ۔'' ''پلیز میری خاطر'' کہہ کہ تم نے زندگی بھر مجھ سے بے شمار باتیں منوائی تھیں مگر اب کی بار جو منوایا ہے اس نے مجھ سے میری زندگی ہی کو چھین لیا، اس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔'' وہ اس کے تصور سے لڑ رہا تھا۔ وہ اس کی پرچھائیوں پر چلا رہا تھا۔

''دو انسانوں کی زندگی کا فیصلہ تم نے اکیلے کر ڈالا۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا تھا ودیعہ کمال؟ مجھ سے تو پوچھتیں کہ میں کیا چاہتا ہوں پھر مجھے بتاتیں کہ تم کیا چاہتی ہو پھر ہم مل کر اپنی اپنی الجھنوں کا کوئی سرا تلاش کرتے۔ ساتھ مل کر کوئی ایسا فیصلہ کرتے جو ہم دونوں کے لیے قابل قبول ہوتا مگر ودیعہ کمال مجھے یہ حق کیسے دے دیتی؟ وہ تو مجھ سے برتر تھی۔ فیصلہ کرنا اس کا منصب تھا اور فیصلے قبول کرنا میری اوقات۔

محبت ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت کرتے تھے مگر محبت میں برابر نہیں تھے۔ ہم میں ایک صرف دینے والا تھا اور ایک صرف لینے والا۔ تم نے مجھے زمین پر مضبوطی سے قدم جما کر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ تم نے مجھ سے میرے زندہ رہنے کی وجہ چھین لی۔ تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا، ودیا؟'' وہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہوا چلا رہا تھا۔ شدید ترین اشتعال میں، غصے سے پاگل ہوتے، اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود کتاب کو پوری قوت سے دیوار پر مارا۔ وہ دیوار کے بجائے میز پر اوپر نیچے رکھی چھ فائلوں پر گری۔ فائلیں کتاب گرنے سے بے ترتیب ہوئیں۔ ایک یا دو میز سے نیچے فرش پر بھی گریں۔ کتاب کے فائلوں سے ٹکرانے اور فائلوں کے نیچے فرش پر گرنے سے اس کے اپنے رونے اور چیخنے سے ہٹ کر بھی ایک دوسرا شور کمرے میں گونجا۔ اس شور نے اسے ایک دم ہی چپ کروا دیا۔ وہ رونا بھول کر فائلوں کو دیکھنے لگا۔ اس نے لائٹس آن نہیں کی تھیں، پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بے ترتیب ہو کر میز پر بکھرنے اور فرش پر گرنے والی ان فائلوں پر اس کی نگاہیں جم گئیں۔

''لکھنے میں گم ہو کر زیادہ دیر تک مت جاگا کرو عمر! اور سنو چائے یا کافی کثرت سے پینے کے بجائے دودھ یا جوس پی لیا کرو۔''

''دو سالوں میں تم سے یہ ناول لکھا گیا ہے، دوسرے رائٹرز کو دیکھو، بعض تو سال میں دو دو، تین تین ناولز تک لکھ لیتے ہیں۔''

''تمہارے مسودے کا کیا بنا؟ اور کتنے دن لگاؤ گے نظر ثانی کرنے میں؟''

''تمہارا یہ ناول تمہارے پہلے ناول سے بھی زیادہ اچھا ہے۔ دیکھنا یہ کیسے ہاتھوں ہاتھ بکے گا اور دیکھنا یہ تمہیں کتنے سارے لٹریری پرائز جتوائے گا۔''

''نہیں چاہئیں مجھے کوئی لٹریری پرائز ودیعہ کمال! نہیں چاہئیں۔'' وہ اپنے چاروں طرف گونجتی اس مدھر آواز کو بازگشت کو سن کر خوش نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی پیش گوئیوں کو سن کر خوش نہیں ہوا تھا بلکہ وہ ایک دم ہی شدید ترین غصے میں آ گیا تھا۔ وہ بہت زور سے چلایا تھا اور پھر ایک دم ہی اسے نجانے کیا ہوا تھا۔ اس کے آنسو، اس کی بے بسی، اس کا غم اچانک ہی شدید اشتعال اور جنون میں بدل گیا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھ کر میز تک آیا، اس نے لائٹس آن کیے بغیر ٹٹول کر میز پر بکھری اور فرش پر گری تمام فائلیں فوراً اٹھا لیں۔ اس کی کلائی پر بندھی گھڑی رات کے ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ اپنے اپارٹمنٹ میں بند ہو کر روتے اور چلاتے اس نے نجانے کتنے گھنٹے گزار دیئے تھے۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ ان تمام فائلوں میں تمام صفحات موجود ہیں، وہ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

گہری اور مہیب تاریکی میں وہ فرنیچر اور دوسرے سامان سے ٹھوکریں کھاتا اپارٹمنٹ کے دروازے سے باہر نکل آیا تھا۔ اسے نہ وقت کا کچھ ہوش تھا، نہ کسی اور بات کی کوئی پروا۔ وہ اندھادھند پوری رفتار سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو ہو جائے۔ گاڑی کہیں ٹکراتی ہے تو ٹکرا جائے۔ وہ مرتا ہے تو مر جائے، اسی خطرناک ترین رفتار سے گاڑی چلاتا وہ اپنی مطلوبہ جگہ تک بہت جلدی پہنچ گیا تھا۔

رات کے اس پہر وہ ساحل پر تنہا کھڑا تھا، اسے دیکھنے اور سننے والا کوئی ذی روح وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ چھ فائلیں تھیں جن میں اس کا مکمل اصل مسودہ اور اس کی نقل دونوں موجود تھے۔ کچھ دیر وہ ساحل پر کھڑا سمندر کو دیکھتا رہا۔ وہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ وہاں اندھیرا تھا، ویرانی تھی، موت کا سا سکوت تھا۔ فقط جو آواز وہاں تھی وہ بپھرے ہوئے سمندر کی۔ ساحل پر کھڑے ہو کر اس نے ایک ایک کر کے تمام فائلوں میں سے سارے کاغذ نکال لیے وہ بہت سارے کاغذ تھے، ڈھیر سارے۔ ایک ہاتھ میں تمام خالی فائلیں اور دوسرے میں ڈھیر سارے کاغذ لیے وہ آہستہ آہستہ پانی کی طرف بڑھا۔ پہلے پانی نے اس کے پیروں کو چھوا پھر ٹخنوں کی پھر پنڈلیوں کو پھر گھٹنوں کو وہ سمندر کی بے رحم موجوں کے مقابل مضبوطی سے جم کر کھڑا تھا۔ سب سے پہلے اس نے ساری فائلیں ایک ساتھ اچھال کر پانی میں بہت دور پھینک دیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ان کئی سو صفحات کو دیکھا، صرف ایک پل ہی اس نے انہیں دیکھا پھر اوپر والا صفحہ لہروں کے سپرد کر دیا۔

''تم کبھی لکھنا مت چھوڑنا عمر!''

''نہیں لکھوں گا میں اب کبھی۔ دیکھ لینا تم، میں اب کبھی نہیں لکھوں گا۔'' وہ بہت زور سے چلایا۔ اس نے لہر کے ساتھ بہتے صفحے کو بغور دیکھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں نکل رہا تھا، ایسی موت کی سی بے حسی اس پر طاری تھی۔ وہ صفحہ لہر کے ساتھ بہتا کچھ پل نظر آیا پھر کہیں گم ہو گیا۔

''یہ دیکھ رہی ہو، یہ صفحے جو میں سمندر میں بہا رہا ہوں، مجھے انہیں سمندر میں ڈبوتے ذرا سی بھی تکلیف نہیں ہو رہی، ذرا سا بھی درد نہیں ہو رہا۔ یہ سوچ کر کہ ان میں میرے تخلیق کیے کردار ہیں۔ میں ان کرداروں میں جیا تھا، ان کے ساتھ ہنسا اور رویا تھا۔'' وہ پھر بلند آواز سے چیخا۔ بپھرے ہوئے سمندر کے بے ہنگم شور میں اس کی چیخیں بالکل ہی گم ہو گئی تھیں۔ وہ ایک کے بعد ایک صفحہ سمندر کی نذر کیے جا رہا تھا۔

آخری چند صفحات اس کے ہاتھ میں رہ گئے تھے۔ وہ نہ صفحے لہروں کے سپرد کرنے کی رفتار کم کر رہا تھا اور نہ چلا نا۔ ہاں صفحہ وہ ایک ایک کر کے بہا رہا تھا۔

کسی کے جسم کا قطرہ قطرہ کر کے خون نکال کر ہر ہر عضو کاٹ کر اذیتیں دے کر قسطوں میں مارا جائے یا تلوار کے ایک وار سے گردن اڑا دی جائے۔ موت تو دونوں ہی صورتوں میں ہو جائے گی۔ پر اسے تکلیف والی موت چاہیے تھی، لمحہ لمحہ مرنے والی۔ ایک دم سے آ جانے والی موت نہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر ہاتھ میں اب صرف آخری صفحہ رہ گیا تھا۔

''اور جس روز تمہارا ناول پبلش ہو جائے گا جس روز وہ مجھے بڑے بڑے بک شاپس میں رکھا نظر آئے گا، شاید میں اس روز خوشی سے پاگل ہو جاؤں گی۔''

''اب کسی بک شاپس میں تمہیں عمر حسن کا نام نظر نہیں آئے گا۔ بہت کتابیں نظر آئیں گی مگر ان کتابوں میں عمر حسن کی کتاب نہیں ہو گی۔''

اس نے وہ آخری صفحہ بھی سمندر کے حوالے کر دیا۔ وہ اب خالی ہاتھ کھڑا تھا۔

''کوئی بات نہیں عمر! تمہاری اگلی کتاب کی اشاعت کے وقت میں ضرور تمہارے ساتھ ہوں گی، تب ہم اپنی خوشی دھوم دھام سے ساتھ مل کر منائیں گے۔ آج کی ساری کمی ہم تب پوری کر لیں گے۔'' وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔

''اگلی کتاب بڑے دھوم دھام سے میں نے سمندر کو سونپ دی ہے ودلیعہ کمال! دیکھو اسے پسند آئی ہے یا نہیں۔'' وہ قہقہے لگا رہا تھا، وہ پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اپنی اگلی کتاب، اپنا دوسرا ناول، اپنا پورا کا پورا مسودہ وہ بپھری لہروں کو تھما چکا تھا، سمندر کے سپرد کر چکا تھا۔ یہ اگر خود اذیتی تھی تو تھی۔

اپنا سب کچھ گنوا کر وہ خالی ہاتھ بے تاثر چہرہ لیے سمندر کو دیکھ رہا تھا۔ بہت دیر یونہی کھڑے رہنے کے بعد وہ واپس پلٹا۔ لہروں کی اونچائی، اُنکا بہاؤ اسے اپنے ساتھ بہا رہا تھا۔ وہ گرتا پڑتا، کئی جگہ چوٹیں کھا کر واپس ساحل پر آ گیا تھا۔ ساحل کی گیلی ریت پر بیٹھ کر اس نے رات کا باقی رہ جانے والا وقت گزارا تھا۔ سمندر کے اس طرف سے طلوع ہوتا سورج، ایک نئی صبح، ایک نیا دن۔ پر عمر حسن کی زندگی میں اب کوئی صبح نئی صبح نہیں تھی، کوئی دن نیا دن نہیں تھا۔ اس کی زندگی کا اب ہر دن ہر صبح ایک ہی جیسا ہونا تھا۔ بے مہر اور نامہربان۔

☆☆☆

جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ماہا ملک کا یہ خوبصورت ناول ہمارے اپنے ہی معاشرے کی کہانی ہے۔ اسکے کردار ماورائی یا تصوراتی نہیں ہیں۔ یہ جیتے جاگتے کردار اسی معاشرے کا حصہ ہیں۔ زندگی کی راہوں میں ہم سے قدم قدم پر ٹکراتے ہیں۔ یہ کردار محبت کے قرینوں سے بھی واقف ہیں اور رقابت اور نفرت کے آداب نبھانا بھی جانتے ہیں۔ انہیں جینے کا ہنر بھی آتا ہے اور مرنے کا سلیقہ بھی۔ خیر و شر، ہر آدمی کی فطرت کے بنیادی عناصر ہیں۔ ہر شخص کا خمیر انہی دو عناصر سے گندھا ہوا ہے۔ ان کی کشمکش غالب ایسے شاعر سے کہلواتی ہے۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔

آدمی سے انسان ہونے کا سفر بڑا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔ لیکن ''انسان'' درحقیقت وہی ہے جس کا ''شر'' اس کے ''خیر'' کو شکست نہیں دے پایا، جس کے اندر ''خیر'' کا الاؤ روشن رہتا ہے۔ یہی احساس اس ناول کی اساس ہے۔

میرا پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میری آنکھوں سے ایک تواتر سے گرتے آنسوؤں نے میرے سامنے موجود صفحے کو بھی گیلا کر دیا تھا۔ کئی جگہ انک پھیل گئی تھی۔ کئی جگہ لفظ مٹے مٹے سے ہو گئے تھے۔ میں لکھتے لکھتے رک گئی تھی۔

کسی اور کے لیے شاید اس کیفیت کو سمجھنا مشکل ہو مگر میں ایک رائٹر ہوں، میں جانتی ہوں کسی بھی لکھنے والے کے لیے اس کی تحریر کیا حیثیت رکھتی ہے۔ بات بہت گھسی پٹی ہے، ہزاروں بار لکھی جا چکی ہے پھر بھی اس کی سچائی ختم نہیں ہو سکتی کسی بھی لکھنے والے کے لیے اس کی تحریر اس کی اولاد کی طرح ہوتی ہے۔ کیا کوئی ماں اپنی اولاد کو پانیوں کے سپرد کر سکتا ہے؟ اور اگر بالفرض کبھی اسے کسی بھی سبب ایسا کرنا پڑ جائے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ ڈوبنے والا بچہ اتنا نہیں روئے گا جتنا وہ ماں روئے گی، وہ بچہ اتنا نہیں چلائے گا جتنی وہ ماں چلائے گی۔ اس بچے کو اتنی تکلیف نہیں ہو گی، جتنی اس کی ماں کو ہو گی۔ اور ایک شخص اپنا پورا کا پورا مسودہ...... میں صرف اس سوچ پر کانپ گئی تھی۔ وہ کس کرب سے گزرا ہو گا، وہ کس درد سے گزرا ہو گا، بے بسی کی انتہا پر یہ خود اذیتی اس نے کس طرح سہی ہو گی۔ وہ دکھ انہوں نے تنہا جھیلا تھا۔ نہ اسے کسی نے دیکھا، نہ سنا، نہ محسوس کیا۔ پر آج میں اس رات کے ایک ایک لمحے پر زار و قطار رو رہی تھی۔

''بیٹا! اب تک جاگ رہی ہو؟ سوئیں نہیں؟'' ابا میاں کمرے کی لائٹ جلی دیکھ کر اندر آ گئے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ کر جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے تھے مگر وہ میرے آنسوؤں کو دیکھ چکے تھے۔ وہ میرے قریب آ گئے اور جھک کر میرے چہرے کو دیکھا۔

''میری بیٹی لکھتی ہے، مجھے بہت اچھا لگتا ہے مگر اس لکھنے کے پیچھے وہ سونا چھوڑ دے، کھانا کم کر دے، اس کے ہونٹ مسکرانا بھول جائیں، اس کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر جائیں اور اس کی آنکھوں کے نیچے یہ گہرے گہرے حلقے پڑ جائیں، یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں۔'' میں ان سے کہنا چاہتی تھی کہ۔

''ابا میاں! ہم رائٹرز نارمل لوگ نہیں ہوتے، ہم بظاہر نارمل لگتے ہیں مگر ہم نارمل نہیں ہوتے۔ ہم ایک زندگی میں کئی زندگیاں جیتے ہیں، صرف اپنی ذات کے ہی دکھ نہیں، نجانے کن کن کے دکھوں کی صلیب اپنے کاندھوں پر لیے پھرا کرتے ہیں۔''

پر جو میں نے ان سے کہا، وہ ایک مسکراہٹ بھرا جملہ تھا۔

''ابا میاں! یہ ناول مکمل کر لوں پھر دل بھر کر آرام کروں گی۔ خوب سوؤں گی، خوب کھاؤں گی اور خوب ہنسوں گی۔''

''یعنی آج رات بھی سونے کا ارادہ نہیں ہے؟'' وہ میرے جواب پر مسکرائے اور گھڑی کی طرف اشارہ کیا جو صبح کے چار بجا رہی تھی۔ میں نے کچھ جھینپے ہوئے انداز میں گردن ہلائی۔ پچھلے اٹھائیس دنوں سے میرا یہی معمول تھا۔ میں سارا دن اور ساری رات اپنے کمرے میں بند ہو کر لکھتے ہوئی گزار رہی تھی۔ آٹھ اور نو گھنٹے والی میری طویل نیند ان دنوں کم ہو کر صرف تین گھنٹے رہ گئی تھی۔ میں صرف کھانا کھانے اور ناشتا کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلتی تھی اور گھر سے باہر نکلے تو مجھے پورے بیس دن ہو چکے تھے۔

''اس روز عمر حسن سے مل کر آنے کے بعد جو میں گھر واپس آئی تھی تو بس ایک دھن ہی سوار تھی۔ ناول جلد از جلد مکمل کرنے کی۔

ابا میاں نے مجھے لکھنے پر مصر دیکھ کر سونے سے متعلق مزید کوئی تاکید نہیں کی، بس اتنا کہتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔

''لکھو مگر پھر نماز پڑھ کر سو جانا اور ہاں صبح جلدی اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ میں ابا میاں سے ایک

سوال پوچھنا چاہتی تھی مگر پوچھ نہیں پائی تھی۔

''ابا میاں! جو ہم سے بہت پیار کرتے ہیں پھر وہی ہمیں دکھ کیوں دے جاتے ہیں۔'' اس سوال کا جواب عمر حسن نے بھی بہت ڈھونڈا ہوگا اور اس سوال کا جواب میں بھی بہت ڈھونڈ رہی تھی۔ عمر حسن سے اتنی بے تحاشا محبت کرنے والی ودیعہ کمال اسے اتنا بڑا دکھ کیسے دے گئی؟

ناول یہاں تک لکھ لینے کے بعد میں اتنی زیادہ اداس اور دل گرفتہ ہوگئی تھی کہ آگے لکھنے کے لیے مجھے خود کو پرسکون اور نارمل کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر پانی کا ایک گلاس پیا، واش روم جا کر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے منہ پر مارے پھر کمرے سے نکل کر کچن میں آئی۔ وہاں سے اپنے لیے کافی کا ایک کپ بنا کر میں واپس کمرے میں آگئی۔ کافی پی لینے کے بعد جب میں نے خود کو پرسکون محسوس کیا تو دوبارہ سے لکھنے بیٹھ گئی۔ عمر حسن کی آگے کی کہانی۔

☆☆☆

''نکل رہا ہوں تمہاری زندگی سے۔ اب کبھی تم سے نہیں ملوں گا۔ اب کبھی تمہارے اس شہر میں نہیں آؤں گا۔ ہو جاؤ اب خوش کہ تمہاری دنیا میں اب تمہیں سب نظر آئیں گے مگر عمر حسن نظر نہیں آئے گا۔'' وہ اپنا شہر چھوڑ رہا تھا، وہ اپنے لوگوں کو چھوڑ رہا تھا۔ اس شہر سے اس کے خواب جڑے تھے۔ اس کی یادیں جڑی تھیں، اس کی محبتیں جڑی تھیں اور وہ ان سب کو چھوڑ کر تنہائیوں کے تپتے ریگستان میں عمر بھر جھلستے رہنے کو قدم رکھ رہا تھا۔

عمر حسن نام کے ایک بے سہارا انسان کی اجڑی، ویران زندگی اسی شہر میں سنوری تھی اور پھر اسی شہر میں دوبارہ اجڑ بھی گئی تھی۔ ایک اجڑی زندگی کو بڑے پیار سے اس لڑکی نے خود سنوارا اور پھر خود ہی دوبارہ اجاڑ بھی دیا؟ اس نے کتنے لوگوں کے ساتھ ظلم کیا۔ اس کے اپنے جن کا وہ سہارا بننا چاہتا تھا، اسے ان سے جدا کر دیا۔ اس نے ایک ماں اور ایک باپ سے ان کے بڑھاپے کا سہارا ان کا بازو، ان کا جوان بیٹا جس پر انہیں بڑا مان تھا جس سے بڑی امیدیں تھیں چھین لیا۔ اس نے ایک مرجانے والے دادا کی روح کو بے چین و بے قرار کر دیا کہ جس کے بھروسے وہ اپنی جان سے عزیز پوتی کو چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ اسے بیچ راستے میں چھوڑ کر ان کا وہ بھروسہ توڑ گیا تھا۔ ان کے اعتبار کا خون کر گیا تھا۔ ودیعہ کمال اتنی خود غرض کیسے ہوگئی تھی؟ اپنے اتنے سارے پیاروں کو دکھ دیتے کیا ایک پل کو بھی اس کا دل نہیں کانپا تھا؟ اپنی انا اسے اتنی عزیز تھی، اتنی زیادہ عزیز..... اپنی زندگی سے جڑے ہر عزیز ترین رشتے سے بھی بڑھ کر عزیز..... انا کی دیوار سے اس پار اسے کوئی رشتہ نظر نہیں آیا تھا۔ کوئی آہ، کوئی آنسو کوئی سسکی اس تک نہیں پہنچی تھی؟

''ابا میاں! اب میں قیامت کے دن آپ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ کیا کہوں گا آپ سے کہ آپ سے کیا وعدہ کیوں نہ نبھا سکا، کیا یہ کہ آپ کی محبت پر اس لڑکی کی محبت غالب آگئی۔ اس نے اپنی محبت کا واسطہ دے کر مجھ سے ایک ناجائز بات منوائی اور میں مان گیا۔ آپ کی محبت، آپ کی شفقت، آپ سے کیا وعدہ سب بھول گیا۔

آپ نے جو مجھ پر بھروسہ کر کے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیا تھا، میں اس بھروسے کی لاج نہ رکھ پایا۔ اس نے کہا۔ میری زندگی سے چلے جاؤ اور میں چپ چاپ اٹھ آیا۔ آپ سے بڑھ کر اس لڑکی کو چاہنے کی خطا کر بیٹھا۔ آپ کو اتنا نہیں چاہ سکا جتنا اسے چاہ لیا۔ آپ سے اتنی محبت نہیں کر سکا جتنی اس سے کی۔'' وہ اپنے شہر سے مسلسل دور ہو رہا تھا اور ٹرین کے ہر اگلے اسٹیشن پر وہ یہ لفظ دہرا رہا تھا۔

وہ اس شخص کی روح سے نادم تھا، شرمسار تھا، پشیمان تھا کہ جس کی محبتوں اور چاہتوں کا قرض وہ مرتے دم تک نہیں ادا کر سکتا تھا۔ اپنا غم بہت بڑا تھا۔ برداشت سے بڑا، ہمت سے بڑا۔ سولہ سالوں سے جس محبت کو وہ پورے حق سے وصول کرتا آیا تھا، وہ محبت آن واحد میں اس پر احسان بنا دی گئی تھی۔ وہ سولہ سالوں سے محبت کی بھیک پا رہا تھا۔ یہ احساس کوئی معمولی احساس نہیں تھا۔ دل ٹوٹ کر کرچی کرچی تھا، لہولہو ہوا تھا مگر اپنے دکھ کے ساتھ اور بھی بہت سے دکھ جڑے ہوئے تھے۔

ابا میاں کا دکھ، کمال علی خان کا دکھ، نائلہ کمال کا دکھ، بوا جی کا دکھ۔ وہ کتنے لوگوں کو دکھی کر کے جا رہا تھا۔ وہ کتنے لوگوں کے بھروسے کا خون کر کے جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اسے اپنا مان کر، اس پر اعتبار کیا اور وہ ان کے اعتبار کو تار تار کر کے جا رہا تھا۔

''دو دیعہ مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے اور اپنی جان عزیز میں صرف اسی کو سونپ سکتا ہوں جس پر مجھے پورا بھروسہ اور مکمل اعتبار ہو اور عمر! تم سے بڑھ کر میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔''

''میں جانتا ہوں عمر! ودیعہ کو صرف تم خوش رکھ سکتے ہو، تمہارے ہوتے اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں آئیں گے۔''

''خدا نے تم جیسا بیٹا دے کر بیٹا نہ ہونے کے میرے سارے گلے دور کر دیے۔ عمر! تم اتنے پیارے بیٹے ہو جس پر ہر ماں فخر کرے۔''

''اگر تم نہ ہوتے عمر! تو میری بٹیا کا کیا ہوتا۔ وہ تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔''

وہ کتنی آنکھوں سے امید ختم کر کے جا رہا تھا، وہ کتنے ہونٹوں کی ہنسی چھین کر جا رہا تھا، وہ کتنے چہروں پر کرب اور رنج بکھیر کر جا رہا تھا، وہ کتنے دلوں کو توڑ کر جا رہا تھا، وہ کتنے انسانوں کے اعتبار کا بے دردی سے قتل کر کے جا رہا تھا۔ وہ ان میں سے کسی سے معافی مانگ لینے تک کے قابل نہیں رہا تھا۔ ودیعہ کمال نے اسے کتنے انسانوں کا مجرم بنا دیا تھا۔ عمر حسن کے لیے اب معافی کہاں تھی؟ نجات کہاں تھی؟ پناہ کہاں تھی؟ وہ نگر نگر پھرے گا، در در بھٹکے گا مگر دل کا سکون اب اسے عمر بھر کبھی نصیب نہ ہوگا۔ دوسروں کو دکھ دینے والے خود کس طرح خوش رہیں گے؟

وہ لندن واپس نہیں جا رہا تھا۔ اگر جلاوطنی ہی کاٹنی تھی تو کسی اور کی منتخب کردہ جگہ کیوں؟ وہ اب ودیعہ کمال کو یہ حق نہیں دے گا کہ وہ اس کی مردہ ہوتی زندگی کہاں گزرے گی کا فیصلہ کرے۔ اسے کہاں سزا کاٹنی ہے، وہ جگہ کا انتخاب خود کرے گا اور وہ جگہ لندن ہرگز نہیں تھی۔

زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب بے بسی اور بے اختیاری کی انتہا پر پہنچ کر انسان کا نہ اپنے حالات بدلنے پر زور چل سکے، نہ کسی اور پر اسے کوئی اختیار ہو تو پھر اپنی بے بسی کا وہ خود اپنے آپ سے انتقام لینے لگتا ہے۔ دوسروں کی، کی گئی ہر زیادتی کی سزا وہ خود کو دیتا ہے۔ خود کو دکھ دے کر، تکلیف پہنچا کر، خود سے انتقام لے کر وہ انتہا پسندانہ خود اذیتی ہی میں سکون محسوس کرتا ہے۔ کیریئر، گھر، دولت، شہرت، مستقبل، زندگی یہ سارے لفظ اب اس کے لیے بے معنی تھے۔ زندگی کو آسائشوں اور خوب صورتیوں سے کس کے لیے بھر رہا تھا جسے آسائشوں کی عادت تھی جو عیش و آرام میں پلی بڑھی تھی۔ جب وہ وجہ ساتھ نہیں تھی تو یتیم خانے میں آنکھ کھولنے والے، یتیم خانے کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کھڑے ہونے والے عمر حسن کی زندگی تو کہیں پر بھی گزر سکتی تھی، کسی بھی طرح گزر سکتی تھی۔ جو اپنا سب کچھ گنوا چکا ہو پھر وہ بہت بے فکر اور نڈر ہو جاتا ہے۔ مزید کچھ اور کھو دینے کا خوف جو دل میں نہیں ہوتا۔

وہ بھی بے فکر ہو گیا تھا، نڈر اور بے خوف ہو گیا تھا۔ کسی دن کوئی ٹرک اسے کچلتا ہوا چلا جائے، کوئی بس اسے روند جائے، کوئی گاڑی اسے ٹکر مارتی گزر جائے یا رات میں سوتے سوتے اس کا دل بند ہو جائے تو اس کی موت پر کوئی دو آنسو بہانے والا بھی نہیں ہو گا۔

اس نے لندن میں خود سے متعلقہ ہر فرد کو یہ اطلاع دے دی تھی کہ وہ لندن واپس نہیں آ رہا۔ وہ اب وہاں کبھی واپس نہیں آئے گا۔ بے بی ایم بکس اور عمر حسن کے مابین ہونے والا اس کے دوسرے ناول کا معاہدہ اس نے توڑ دیا تھا۔ دو فریقین کے مابین ایک معاہدہ ہوا تھا۔ ان میں کوئی بھی ایک اس معاہدے کو توڑ سکتا تھا کہ ایسا اسی معاہدے کی ایک شق میں درج تھا۔ سو اسے ختم کرنے والا وہ ٹھہرا تھا۔

اس کے پاس بیرون ملک سے حاصل کی گئی اعلیٰ ڈگری تھی۔ اس کے پاس سیلبریٹی اسٹیٹس تھا۔ میڈیا کوریج اپنے ملک میں بھی اسے اتنی بے تحاشا ملی تھی کہ لوگ اسے با آسانی پہچان لیا کرتے تھے۔ وہ ان چیزوں کو اپنے حق میں استعمال کر سکتا تھا، اگر ایسا کرنا چاہتا تو......

مگر ایک مری ہوئی زندگی کے لیے عالیشان مقبرہ تعمیر کر لیا جائے یا قبر کچی رہنے دی جائے، زندگی تو مری ہوئی ہی رہے گی۔ سو وہ بغیر کسی لگن کے جس پہلی جگہ ملازمت کے لیے گیا، بغیر یہ دیکھے اور جانے کہ اسے وہاں سے کیا ملے گا اور کتنا ملے گا، وہاں ملازمت اختیار کر لی۔ ہاں اگر وہ وہاں ملنے والی تنخواہ پر غور کرتا اور اسے اپنی پاؤنڈز والی شاندار آمدنی سے بدلتا تو خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا۔

لوگ اسے پہچانتے تھے، لوگ اس کے پیچھے آتے تھے، اس کی اگلی کتاب منظر عام پر کب آ رہی ہے، پوچھتے تھے اور دل ہی دل میں اس بات پر حیران ہوتے تھے کہ شہرت کی بلندیوں پر پہنچا ایک بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ معروف مصنف راولپنڈی کے ایک بالکل ہی عام سے کالج میں پڑھا رہا ہے؟ اس کی تو کتابیں ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں کہ وہ کیا اس کا پورا خاندان عیش و آرام کی زندگی گزارے۔ وہ لوگوں سے بھاگتا تھا، وہ لوگوں سے چھپتا تھا۔ لکھنے اور کتاب سے متعلق ہونے والی ہر بات اس کے زخموں سے چور ہوئے بدن کو نئے گھاؤ لگاتی تھی۔ ان زخموں سے پھر سے خون بہنے لگتا تھا۔ ”مت یاد دلاؤ مجھے کہ میں لکھا کرتا تھا، میں نے کوئی کتاب لکھی تھی، میری کوئی کتاب چھپی تھی، میں نہیں یاد رکھنا چاہتا یہ بات۔“

”میں نہیں آ رہا، میں نہیں لکھ رہا“ والی بات پر جان بکھم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس کے حساب سے یہ مشہور ہو جانے والے ایک انسان کی ایک ادائے خود ستائی تھی۔ ناز نخرے تھے۔ اپنے ہاتھوں ہاتھ بک جانے والے نام کو کیش کرانے کا ایک انداز تھا، سو اس نے وہی بات کی جو اس کے حساب سے عمر حسن چاہتا تھا۔ مزید پیسہ، مزید دولت۔ وہ جو جو مراعات مانگے گا وہ سب وہ اسے دیں گے اور وہ اسے یہ سمجھانے میں ناکام ہو جاتا تھا کہ وہ اب لکھنا نہیں چاہتا۔ نہ کم پیسوں کے لیے نہ بے تحاشا دولت کے لیے۔ کئی دوسرے پبلشنگ ہاؤسز بھی اس کے تعاقب میں آئے تھے۔

وہ اسے بھول رہا ہے، آہستہ آہستہ وہ اسے بالکل بھول جائے گا، خود کو بڑی شدت سے وہ یقین دلا رہا تھا مگر خود سے یہ جھوٹ وہ چند ماہ بھی نہ نبھا سکا تھا۔ صرف چند ماہ بھی وہ اس فریب میں خود کو مبتلا نہیں رکھ سکا تھا۔ اسے بھلانے کی ہر کوشش ناکام تھی۔ یہاں تک کہ خود سے بولنے والا جھوٹ بھی۔

”عمر! تمہیں کہانی آتی ہے؟“ وہ اپنے بستر پر لیٹا تھا اور اس آواز کو سنتے ہی وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ سامنے ایک آٹھ سال کی بچی بالوں کی دو پونیاں بنائے بڑی آس اور امید سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''بتاؤ نا عمر! تمہیں کوئی کہانی آتی ہے۔'' وہ کسی بھی قیمت پر اس سے کہانی سننا چاہتی تھی۔ اس نے چلانے کی کوشش کی۔

''کیوں سناؤں میں؟ جاؤ میں نہیں سناتا۔ جاؤ یہاں سے۔'' مگر وہ چلا نہیں پایا، وہ آہستہ سے بولا۔

''کون سی کہانی؟''

''کوئی سی بھی کہانی جو تمہیں آتی ہو، مجھے سناؤ۔'' وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کمرے کی لائٹ جلائی۔

''عمر کسی کتاب کو پڑھنے میں اتنا مزا نہیں آتا جتنا تمہاری کہانی سننے میں، میری سمجھ میں نہیں آتا تم انہیں سوچتے کیسے ہو۔''

''دیا......'' اس کے ہونٹوں سے ایک آہ کی صورت یہ نام نکلا۔

''تم لکھنا چھوڑ رہے ہو۔'' اب اس شرارتی بچی کی جگہ آنکھوں میں رنج اور دکھ لیے ایک لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ہاں لکھنا چھوڑ رہا ہوں، تمہاری وجہ سے۔ کیا تم نے مجھے لکھنے کے قابل چھوڑا ہے؟''

''تم لکھنا مت چھوڑو عمر! کسی اور کے لیے نہ سہی تم میرے لیے لکھو۔''

''دیا......'' وہ اس پیہم اصرار سے تھک سا گیا تھا۔

''دیا! تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ مجھے جواب دو، بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ دو گی؟ کیا تم مجھے کبھی بھول سکو گی؟ جب ان سب سوالوں کا جواب نہیں ہے پھر یہ ظلم کیوں؟ یہ سنگ دلی کیوں؟ مجھے اپنی زندگی سے نکال کر تمہاری انا تو سرخرو ہو گئی مگر تمہاری محبت......؟ تمہیں اپنی محبت پر ذرا سا بھی رحم نہیں آیا۔ میرے چلے آنے کے بعد جب تمہاری انا اپنی جیت کا جشن منا رہی ہو گی تب تمہاری محبت کس طرح تڑپ تڑپ کر روئی ہو گی۔'' وہ ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے پاس آ گیا۔

''تم نے مجھ سے میری عزت نفس، میرا وقار، میری آن سب کچھ چھین لیا۔ تم نے مجھ سے میرے زندہ رہنے کی وجہ چھین لی۔ ناکام ہو گیا ہوں تمہیں برا سمجھنے میں، ناکام ہو گیا ہوں تم سے نفرت کرنے میں۔ میرے دل سے تمہاری محبت کبھی نہیں نکل سکتی دیا! میری زندگی کی آخری سانس تک نہیں۔'' عمر حسن نے اس روز مکمل شکست قبول کر لی تھی۔ وہ اس سے کبھی بھی نفرت نہیں کر سکتا، وہ اسے کبھی بھی بھول نہیں سکتا۔ وہ اس سے محبت کرنا مرتے دم تک ترک نہیں کر سکتا۔ اس رات سمندر کی بے رحم موجوں کے سپرد اپنا مسودہ کرتے جو اس نے کبھی نہ لکھنے کا عہد کیا تھا، وہ اس عہد سے پل بھر میں پھر گیا تھا۔ چند ماہ بھی نہیں لگے تھے اسے اپنے اس عہد کو توڑنے میں۔

''میں اب کبھی نہیں لکھوں گا۔'' وہ اس لڑکی سے ایسے ضد باندھ سکتا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں، وہ اس لڑکی سے ایسی ضد باندھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی کتاب تلاشتی ہو گی، وہ ہر بک اسٹور میں جا کر اس کے نام کی کتاب ڈھونڈتی ہو گی۔

عمر حسن کو جس بھی انداز سے ودیعہ کمال نے ٹھکرایا تھا، پر اس کی دوسری کتاب کی تو وہ پل پل منتظر ہو گی۔ اس کا لکھنا ودیعہ کمال کے لیے کیا معنی رکھتا تھا، کیا وہ جانتا نہیں تھا۔ اس رات جنون میں آ کر جو کچھ اس نے سمندر میں کھڑے ہو کر کہا تھا، وہ سب تو مایوسی، ناامیدی اور غم کی انتہاؤں پر پہنچے ایک بے بس ناکام اور غم زدہ انسان کے منہ سے نکل جانے والے غیر اختیاری جملے تھے۔

اپنی ضد بھول کر، اپنی ناراضگی چھوڑ کر وہ اسی وقت لکھنے بیٹھ گیا۔ اپنے غم میں ڈوب کر، خود ترسی میں مبتلا ہو کر وہ کتنی خود غرضی کا مظاہرہ اتنے مہینوں سے کر رہا تھا۔ ودیعہ کو اس کی کتاب کا انتظار تھا، اس کے لاکھوں چاہنے والوں کو اس کی کتاب کا انتظار تھا۔ اتنے سارے لوگ، اتنی ساری محبتیں پھر بھی وہ خود کو کنگال کہتا ہے، ناکام کہتا ہے۔ وہ لکھے گا۔ وہ لکھنا کبھی نہیں چھوڑے گا۔

اتنی محبتوں کا اسے مان رکھنا ہی پڑے گا۔ جنون میں آ کر جو کچھ وہ اپنے مسودے کے ساتھ کر چکا اسے تو اب بدل نہیں سکتا مگر نئے سرے سے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ اس کے پاس بے شمار کہانیاں تھیں کہنے کے لیے۔ کہانیاں سوچنے کی اسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ بے شمار کہانیاں اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ پوری کی پوری اس کے ذہن میں واضح تھیں۔ پر اس رات اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟ لفظوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کاغذ تھے، اس کے ذہن میں کہانی تھی مگر اس کہانی کو کہنے کے لیے جو لفظ اسے درکار تھے، وہ اسے مل نہیں رہے تھے۔ وہ کہیں گم تھے اور وہ انہیں ڈھونڈ رہا تھا اور ایسا زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔ وہ کئی گھنٹوں تک بیٹھا رہا وہ کئی گھنٹوں تک خالی کاغذوں کو گھورتا رہا، وہ کئی گھنٹوں تک لکھنے کی بہت کوشش اور بہت جدوجہد کرتا رہا پھر بہت کوششوں کے بعد بڑی مشکلوں سے وہ چند سطریں لکھنے میں کامیاب ہوا مگر جیسے ہی اپنی لکھی ان تین سطروں پر اس کی نگاہ ٹک گئی، وہ بے یقینی سے ساکت بیٹھا رہ گیا۔

"یہ میں نے لکھا ہے؟" یہ بے رنگ، بے ربط اور بے روح لفظ اس کے کیسے ہو سکتے تھے۔ اس کے لفظوں میں تو ایک موسیقی، ایک حرارت، ایک زندگی ہوا کرتی ہے، اور یہ..... یہ بے روح اور بدصورت لفظ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لکھنے کی صلاحیت سے مطلق محروم ایک شخص زبردستی لکھنے کی، زبردستی کہانی کہنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس نے اس صفحے کو پرزے پرزے کر کے پھاڑا اور دوسرا صفحہ اپنے سامنے کر لیا۔ دوسرے صفحے کے ساتھ بھی وہی کوشش اور پھر وہی پھاڑنا پھر تیسرا پھر چوتھا پھر پانچواں۔ صبح ہوتے ہوتے اس کے کمرے میں اس کی میز کے گرد پھٹے ہوئے، مڑے تڑے کاغذوں کا ایک ڈھیر تھا۔

اس کے کالج جانے کا ٹائم ہونے لگا تو وہ میز پر سے اٹھا اور جھک کر ان تمام مڑے تڑے کاغذوں کو سمیٹنے لگا۔ انہیں سمیٹتے اور پھر کوڑے دان میں ڈالتے اس کی آنکھوں میں بے تحاشا تھکن اور درد بھرا ہوا تھا۔ اس پر ابھی بھی بے یقینی کی کیفیت طاری تھی۔ ایسا اس کے ساتھ زندگی میں کبھی ہوا ہی نہیں تھا کہ وہ لکھنا چاہے اور لکھ نہ پائے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری، اس نے کوشش ترک نہیں کی۔ اگلی رات وہ پھر پچھلی رات والی مشق دہراتا رہا۔ وہی ساری رات کا جاگنا اور وہی صبح فرش پر جابجا بکھرے پھٹے اور مڑے تڑے گولہ بنے کاغذوں کو سمیٹنا۔ اسی ایک معمول کو دہراتے نجانے اسے کتنے بے شمار دن ہو گئے تھے۔

اور صبح ہوتے جب وہ نڈھال ہو کر اپنا سر میز پر گراتا تو بے بسی سے چلا اٹھتا۔ "میں کیسے لکھوں، تم مجھے بتاؤ، میں کیسے لکھوں۔ میں لکھنا چاہتا ہوں، یقین کرو میں لکھنا چاہتا ہوں مگر لکھ نہیں پا رہا۔" کئی مہینوں کی ناکام کوششوں کے باوجود بھی اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی۔ وہ حوصلہ نہیں ہارے گا، وہ کوشش نہیں چھوڑے گا۔ لکھنا ہی عمر حسن کا اصل ہے۔ لکھنے کے علاوہ وہ کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتا۔ اسے لکھنا ہے، عمر حسن کو لکھنا ہے اور اس کے لیے وہ ہر کوشش کر دیکھے گا۔ اس نے شہر بدلا، جگہ بدلی، ماحول بدلا اور ایک بار نہیں بار بار بدلا۔ جگہ بدلے گی، ماحول بدلے گا، لوگ بدلیں

گے تو اس سے لکھ لیا جائے گا۔ ماحول کی تبدیلی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پھر سے زندہ کر دے گی۔ جب اپنی اس کوشش میں ناکام رہا تو اس نے شہر اور ماحول بدلنے والی سوچ میں کچھ وسعت اور پیدا کی۔ بدلا جانے والا شہر پر فضا ہو، وہاں ہریالی ہو، سبزہ پہاڑ خوبصورتی پھر اس نے پر فضا مقامات اور کھلی کھلی آب و ہوا والے علاقوں کو چننا شروع کیا۔ فطرت سے قریب ہو گا تو اس سے لکھ لیا جائے گا۔

مگر پورے چار سالوں سے وہ کوششیں کر رہا تھا اور اس کے پاس کسی کو بطور ثبوت دکھانے کے لیے کہ ''دیکھو میں لکھتا ہوں'' چند صفحے بھی نہیں تھے۔ ہر رات وہ جاگتا تھا اور ہر رات کی صبح اس کے کمرے کے فرش پر کاغذ ہی کاغذ بکھرے ہوتے تھے۔ ان کاغذوں میں کوئی ایک لفظ، کوئی ایک فقرہ بھی ایسا نہیں تھا جسے دیکھ کر یہ کہا جا سکے کہ اسے عمر حسن نے لکھا ہے۔

پورے چار سالوں کی مسلسل کوششوں کے بعد جس روز اس نے ہار مانی جس روز خود پر ایک مدت سے ہوتے انکشاف کو اس نے خود تسلیم کر لیا کہ اب وہ کبھی لکھ نہیں پائے گا، اس روز وہ واقعی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

''تمہارے اندر کے رائٹر کو دریافت کس نے کیا تھا؟''

''تم نے۔''

''تمہیں سب سے پہلے یہ بات کس نے بتائی تھی کہ تم لکھ سکتے ہو؟''

''تم نے۔''

''میں اب کبھی لکھ نہیں سکوں گا، یہ میرے ساتھ کس نے کیا؟''

''تم نے۔'' وہ اپنے پاس گونجتی اس آواز سے لڑا۔ بہت زور سے چلایا۔

''تم نے مجھے اپنی زندگی سے کیا نکالا کہ لفظ میری زندگی سے نکل گئے۔''

''تم میرے لیے لکھو۔'' یہ بات مجھ سے کبھی مت کہنا۔ تمہارے بغیر میں لکھنا بھول گیا ہوں۔ اب لفظ عمر حسن کے سامنے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے نہیں کھڑے ہوتے۔ وہ اب اس کے قریب بھٹکتے بھی نہیں۔'' وہ فرش پر بکھرے کاغذ سمیٹتے ہوئے زار و قطار رو رہا تھا۔ زار و قطار، بلک بلک کر، کسی ایسے انسان کی طرح جس سے اس کی آخری متاع بھی چھن گئی ہو۔

''میں لکھنا بھول گیا۔ دیکھو دیا! میں لکھنا بھول گیا۔ کھو گئے سب لفظ مجھ سے۔ آ کر دیکھو، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ نہیں لکھ سکتا اب میں، کبھی بھی نہیں لکھ سکوں گا اب میں۔'' اس نے اپنا سر زور زور سے دیوار پر مارا، وہ چیخ چیخ کر رو دیا۔

''ایک ایک کر کے میری ہر وہ متاع جس پر مجھے مان تھا، مجھ سے چھن گئی۔ تم، میرے لفظ...... نہ تم میری تھیں نہ میرے لفظ میرے تھے۔ میں نے تم دونوں پر بھروسہ کیا، تم دونوں کو اپنا مانا، مجھے لگا تم دونوں زندگی بھر میرا ساتھ نبھاؤ گے مگر تم دونوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ قلاش ہو چکا عمر حسن، کنگال ہو چکا عمر حسن، اس کے پاس گنوانے کو واقعی اب کچھ بھی نہیں بچا ہے۔''

☆☆☆

دنیا میں کہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ کبھی عمر حسن نام کا ایک رائٹر تھا، وہ کہاں چلا گیا، وہ اب کیوں نہیں لکھتا؟ لوگوں کے پاس یہ سوچنے کی اتنی فرصت نہیں تھی۔ شروع میں لوگوں نے اس کی کمی محسوس کی پھر یہ کمی بھی آہستہ آہستہ بالکل نہ پہچانے جانے میں بدل گئی۔

Forever اور عمر حسن کا ذکر کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا Book Shops کے پچھلے سے پچھلے شیلفوں میں Forever منتقل ہوتی رہی۔ اس پر گرد جمتی رہی۔ کسی بہت بڑی سی دکان کے کہیں کسی آخری کونے میں بہت سی نظر انداز ہوئی گرد آلود کتابوں کے بیچ گرد چڑھی اس کتاب کا سرورق کیسا ہے، اس کا نام کیا ہے اور اس کا مصنف کون ہے، یہ جاننے کی کسی کے پاس فرصت نہیں تھی۔

Forever آؤٹ آف پرنٹ ہوگئی، وہ قصہ پارینہ بن گئی، عمر حسن لوگوں کے ہجوم میں کہیں کھو گیا، لوگوں نے اسے بھلا دیا۔ دنیا میں لکھنے والوں کی کمی نہیں۔ اتنے بے شمار، لاتعداد رائٹرز ہیں۔ ہر سال مختلف زبانوں میں ہی کیا صرف انگریزی زبان میں لاکھوں، کروڑوں کتابیں شائع ہوتی ہیں پھر لوگ اسے کیوں یاد رکھتے اور آخر کب تک یاد رکھتے؟ انہوں نے اسے بھلا دیا۔ یہ تھی عمر حسن کی حقیقت۔ یہ ہے ایک رائٹر کی حقیقت اور یہ ہے اس دنیا کی حقیقت، دنیا کی یہی حقیقت ہے۔ یہ جتنی جلدی آسمان پر چڑھاتی ہے، سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے، اتنی ہی جلدی اٹھا کر زمین پر پٹخ بھی دیتی ہے۔

اس کے اندر کے تخلیق کار کا قتل اس سے محبت کرنے والوں ہی نے کیا۔ پہلی بار اور سب سے گہرا وار اس سے بے تحاشا اور والہانہ محبت کرنے والی ودیعہ کمال نے کیا۔ اسے پہلی بار ودیعہ کمال نے قتل کیا پھر ایک ایک کر کے ہر محبت کرنے والے نے اس کا قتل کیا۔ عمر حسن ایک حساس انسان جس کی خواہشات لامحدود نہیں تھیں جو فقط محبت کا متلاشی تھا جو زندگی میں محبت کے سوا کچھ چاہتا نہیں تھا، اس نے زندگی بھر محبت کے نام پر دھوکا کھایا۔

☆☆☆

عشق کا قاف

www.paksociety.com

عشق کا قاف سرفراز راہی کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ ع ش ق ...... عشق ...... ازل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ جذبہ جب جب اپنے رخ سے حجاب سرکاتا ہے، انہونیاں جنم لیتی ہیں۔ مثالیں تخلیق ہوتی ہیں۔ داستانیں رقم ہوتی ہیں۔ ''عشق'' کی اس کہانی میں بھی اسکے یہ تینوں حروف دمک رہے ہیں۔ ''عشق کا قاف'' میں آپ کو عشق کے عین، شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے سرفراز راہی نے اپنی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگویا ہے۔ اپنے احساس کے جس الاؤ میں پل پل جلے ہیں، ان انگارہ لمحوں اور شبنم گھڑیوں کی داستان لکھنے کے لئے خون جگر میں موئے بیان کیسے ڈبویا ہے، آپ بھی اس سے واقف ہو جائیے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔

میں نے اپنے سامنے بکھرے صفحات کو دور ہٹایا اور قلم بند کر کے میز پر رکھ دیا۔ میرا ذہن اس وقت بہت بری طرح منتشر ہو رہا تھا۔ میرے دل کی عجیب سی حالت تھی۔ میں ایک رائٹر کی کہانی لکھ رہی تھی۔ ایک تخلیق کار کے عروج و زوال کی کہانی۔

اور جہاں سے میرے اس مرکزی کردار۔ اس تخلیق کار کی گمنامی اور زوال شروع ہوا تھا، وہیں میں ٹھٹک کر، کانپ کر رک گئی تھی، ٹھہر گئی تھی۔ کیا لفظوں کا رشتہ اتنا کمزور رشتہ ہوتا ہے؟ ایک قاری اور ایک ادیب کے رشتے کی اصل بنیاد یہ لفظ...... یہ لفظ جن سے بڑا دھوکا کوئی نہیں، جنہیں بھلائے جانے میں کچھ وقت نہیں لگتا۔

کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے
کل کوئی مجھ کو یاد کرے کیوں کوئی مجھ کو یاد کرے
مصروف زمانہ میرے لیے کیوں وقت اپنا برباد کرے

سچ ہی تو کہا ہے ساحر نے، بالکل سچ۔ Forever کو شائع ہوئے بیس برس گزر چکے ہیں اور بیس برسوں بعد آج ایسا کون ہے جسے Forever یاد ہو جسے عمر حسن یاد ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میں رائٹنگ ٹیبل سے فوراً اٹھ گئی تھی۔

''زنیرہ عباس کو تو یاد ہے، وہ تو نہیں بھولی نہ Forever کو نہ عمر حسن کو۔'' سامنے آئینے میں نظر آتے میرے ہی عکس نے بڑی سنجیدگی سے مجھے جواب دیا۔

''اگر یہ فرض کر لیں اگر یہ مان لیں کہ دنیا کے ہر فرد نے بشمول ودیعہ کمال کے، عمر حسن کو بھلا دیا ہے، تب بھی زنیرہ عباس کو تو وہ یاد ہے۔ زنیرہ عباس تو اسے ہرگز نہیں بھولی۔ وہ اس کے لفظوں سے محبت کرتی ہے، زنیرہ عباس، عمر حسن کی ایک قاری ہے لیکن کیا وہ بھی ویسی ہی قاری ہے جو لفظوں کا بے احتیاطی سے استعمال کرنے کے بعد انہیں خود ہی بھول بھی جائے؟'' میرے اندر سے ابھرتی مایوس سوچوں کو میرے عکس نے میرا ہی حوالہ دے کر غلط ثابت کیا۔ عمر حسن کے ساتھ اپنا موازنہ کرنا ابھی ایسی میری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ میرے سفر کا آغاز تھا جبکہ وہ تو شہرت، مقبولیت، پذیرائی سب کچھ پا چکے تھے۔ بڑے مصنف کے مقابل میری کوئی حیثیت نہیں تھی جو میں ان کا اور اپنا موازنہ کرتی۔ شہرت، مقبولیت اور پذیرائی پا لینے کے بعد جو کچھ ان کے ساتھ ہوا اس سے بہت مایوس اور ناامید ہوئی تھی۔

اپنے سفر کے آغاز ہی میں اس کے عبرت ناک انجام کا سوچ کر ڈر گئی تھی مگر میرے عکس نے مجھے میرا ہی حوالہ دے کر میری مایوسیوں اور ناامیدیوں کو ختم کر کے مجھے نئی آس اور نئی امید دلائی تھی۔

میں نے اپنے آنسوؤں کو فوراً خشک کیا اور ایک مرتبہ پھر رائٹنگ ٹیبل پر آ گئی۔ میرا ناول اختتامی مرحلے میں تھا۔ میں آج اسے ختم کر کے ہی یہاں سے اٹھنا چاہتی تھی۔

میں نے قلم ہاتھ میں لیا اور پھر سے لکھنا شروع ہو گئی۔

☆☆☆

شہر محبت سے بے دخلی کے 19 طویل سال، 19 سالوں سے وہ بغیر کسی جرم اور بغیر کسی خطا کے قید تنہائی کاٹ رہا ہے۔ زندگی اس کے اندر مر چکی ہے پھر بھی وہ جی رہا ہے۔ وہ کہتی تھی...... میں تمہیں تمہارے خوابوں کا گھر نہیں دے پاؤں گی مگر وہ تو اس کے بنا عمر بھر کوئی گھر ہی نہ بنا سکا اور اگر بنا بھی لیتا تو اس میں تنہا رہ پاتا؟ بعض لوگ زندگی میں بہت سی محبتیں کرتے ہیں اور بعض کے لیے ان کی ایک ہی محبت ان کی پوری حیات پر محیط ہوتی ہے۔ اس کی زندگی سے نکل آنے کے بعد وہ کسی اور سے محبت کر ہی نہیں پایا۔

اس کے لیے دنیا بدل گئی، لوگ بدل گئے۔ آج ایک پر فضا مگر چھوٹے سے شہر میں گمنامی کی زندگی جی رہا ہے۔ جن لوگوں کے درمیان وہ زندگی گزار رہا ہے، وہ یہ تک نہیں جانتے کہ پہلے وہ کون تھا؟ کیا تھا؟ بہت عام لباس پہنتا ہے، بسوں میں سفر کرتا ہے، چمن زار سے ملحقہ ایک دو کمروں کی انیکسی میں رہتا ہے۔ جو تنخواہ ملتی ہے اس میں وہ ایک گاڑی افورڈ کر سکتا ہے۔ ذرا کوشش کر کے اگر پیسے جمع کر لے تو اپنا ایک گھر بھی بنا سکتا ہے مگر گھر، گاڑی، بینک بیلنس کس کے لیے؟ اس کی ضروریات زندگی تو اس طرح بھی پوری ہو رہی ہیں پھر وہ، وہ سب کچھ کیوں بنائے جن کا اس کے مرنے کے بعد کوئی وارث بھی نہیں ہوگا۔

چمن زار میں آنے والے کتنے معذور بچوں کا علاج وہ اپنے پیسوں سے کروا دیتا ہے۔ وہ جو کچھ کماتا ہے، اپنی سادہ ضروریات زندگی پوری کرنے کے بعد باقی سارا کا سارا انہیں بچوں کی بہبود پہ خرچ کر دیتا ہے۔ چمن زار میں اس کی ملازمت ہے، وہ یہاں کا نگراں ہے لیکن اگر ذرا سا غور کریں تو پتا چلے گا یہ اس کی ملازمت نہیں، اس کی عبادت ہے۔ خود یتیم اور بے سہارا تھا اور آج اس قابل ہے کہ دوسروں کا سہارا بن سکے تو ایسا کیوں نہ کرے۔ وہ کئی زندگیوں کے لیے امید کی کرن ہے۔ وہ کئی معصوم دلوں کی خوشی ہے۔ وہ اپنا کھو جانے والا ہر رشتہ انہی میں ڈھونڈتے ہیں اور وہ انہیں اپنی پناہوں میں لیے ان کے لیے چھپر چھایا بنا انہیں دنیا کی ہر مصیبت سے بچانے میں کوشاں رہتا ہے۔ بظاہر ہنستے مسکراتے، زندہ دلی سے قہقہے لگاتے اس شخص کی آنکھوں میں اگر پل بھر کے لیے بھی غور سے دیکھا جائے تو وہاں خوشی نہیں، صرف دکھ نظر آتے ہیں۔

جب رات میں وہ اپنی انیکسی میں قدم رکھتا ہے، جہاں تنہائی اس کی منتظر ہوتی ہے تو اس کے لبوں پر سے وہ مصنوعی ہنسی غائب ہو جاتی ہے۔ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آتا ہے تو بستر پر لیٹنے سے پہلے اپنی سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی ایک فریم شدہ تصویر نکالتا ہے۔ اس تصویر میں چھ لوگ ہیں اور ان چھ افراد میں سے ایک فرد وہ خود بھی ہے۔ کبھی وہ بھی انہیں میں سے ایک تھا، کبھی وہ بھی ان کے ساتھ تھا، کبھی وہ ان کی زندگی کا حصہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگتے ہیں۔

''ابا میاں! مجھے معاف کر دیں، میں آپ سے کیا وعدہ نبھا نہیں پایا۔ میری وعدہ خلافی کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کی محبت کا حق ادا نہیں کر سکا۔ اس کوتاہی کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ اتنا برا ثابت ہوا ہوں میں ابا میاں! سوچتا ہوں قیامت کے دن آپ کا سامنا کیسے کروں گا۔

آنٹی، انکل! پلیز مجھے معاف کر دیں، میں ایک بیٹے کا فرض نہیں نبھا سکا۔ جب تک مجھے آپ لوگوں کی ضرورت تھی، آپ لوگوں کے ساتھ رہا مگر جب آپ لوگوں کو میری ضرورت پڑی تو میں خود غرضی اور کم ظرفی کا مظاہرہ کرتا آپ لوگوں کو چھوڑ آیا۔

بوا جی! مجھے معاف کر دیں، میں آپ کی بیٹی کا خیال نہیں رکھ پایا۔ آپ کو اتنا سارا دکھ دے کر خاموشی سے چلا آیا۔'' وہ ان سب کا مجرم تھا،

ان سب کی آنکھوں میں آنے والے بہت سے آنسوؤں کا ذمہ دار وہ تھا پھر آخر میں اس کی نگاہیں اس لڑکی پر ٹھہرتی ہیں۔ جس نے آسمانی رنگ کا خوب صورت لباس پہن رکھا ہے جو دلہن کا سا روپ لیے سجی سنوری مسکرا رہی ہے اور مسکراتے ہوئے اس کے گالوں کے ڈمپل بے حد نمایاں ہو رہے ہیں۔

''تم خوش ہو؟'' نہیں نا؟ مجھے دکھ دے کر کم از کم خود تو خوش رہ لیتیں۔ تم خوش ہوتیں تو شاید میں بھی خوش رہ پاتا۔ پر اب کیسے خوش رہوں دیا! جانتا ہوں کہ تم خوش نہیں ہو۔ تمہارے لیے میرے دل نے کبھی کوئی غلط پیغام مجھ تک نہیں پہنچایا اور وہ مجھ سے کہتا ہے کہ دیا خوش نہیں۔ نہ تم خوش ہو، نہ میں خوش ہوں، نہ ہم سے محبت کرنے والا ہمارا کوئی بھی پیارا خوش ہے پھر یہ سب کیوں دیا؟'' اس سے یہ سب بولتے بولتے اشک اس کے چہرے سے ٹپک کر اس تصویر پر گرنے لگتے ہیں۔

وہ اس تصویر کو ساری رات اپنے سرہانے رکھ کر لیٹا رہتا ہے۔ تصویر میں موجود تمام لوگوں سے کبھی معافی مانگتا ہے اور کبھی اپنے دل کی باتیں کہنے لگتا ہے۔ ان کے بغیر اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے، یہ بتانے لگتا ہے۔

صبح وہ اپنے بستر سے بہت نڈھال اور پژمردہ اٹھتا ہے مگر جب چمن زار کے احاطے میں قدم رکھتا ہے جہاں بہت سے معصوم چہرے آنکھوں میں امید لیے اس کی راہ دیکھ رہے ہوتے ہیں تو وہ مسکراتا ہوا ان کے قریب چلا آتا ہے۔ اس نے رات کس کرب میں بتائی، کوئی یہ کبھی نہیں جان پاتا۔ اسے دکھ چھپا کر مسکرانا جو آتا ہے۔ دن رات کا یہ سفر یونہی چل رہا ہے اور یونہی چلتا رہے گا۔ شہر محبت کے دروازے شاید عمر بھر اس پر نہیں کھلیں گے۔

☆☆☆

آخری لفظ لکھ لینے کے بعد میں نے ایک گہری طمانیت بھری سانس لی پھر ابھی ابھی لکھے اس آخری صفحے پر دوبارہ ایک نظر دوڑائی۔ مطمئن ہو کر ایک منٹ بعد میں نے اس صفحے کو پلٹ دیا۔ اب میرے سامنے فائل میں لگا اس صفحے سے اگلا خالی صفحہ تھا۔ میں نے اس خالی صفحے کو خالی ہی رہنے دیا اور اسے بھی پلٹ دیا۔ اب پھر میرے سامنے ایک خالی صفحہ تھا۔ میں نے پورا ناول سیاہ روشنائی سے لکھا تھا۔ اب جو میں اس صفحے پر لکھ رہی تھی، وہ نیلی روشنائی سے تھا جو مجھے لکھنا تھا، وہ لکھ کر میں بہت جلدی فارغ ہو گئی تھی۔ میرا ناول مکمل ہو چکا تھا۔ مکمل؟ ہاں جہاں تک اور جو کچھ بھی مجھے لکھنا تھا، وہ سب میں لکھ چکی تھی اور اب مجھے اپنے لکھے تمام صفحات کو اکٹھا کرنا تھا۔ میں نے تمام صفحات کو اکٹھا کیا، انہیں staple کیا اور پھر تمام صفحات کو لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ میں اپنے لکھے ہوئے پر اب نظر ثانی کرنا چاہتی تھی۔ ایک مہینہ دن رات لگ کر میں نے اسے لکھا ہے۔ جتنا اس ناول کو لکھتے وقت میری آنکھیں بھیگی، چھلکی اور برسی ہیں کبھی کسی تحریر کو لکھتے وقت نہیں برسیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس بار جو میں نے لکھا وہ سو فیصد حقیقت تھی۔ ایک شخص کی زندگی کی سچی کہانی جسے لکھتے وقت الفاظ میرے ہیں۔ انداز تحریر میرا ہے، کسی بھی واقعہ اور کسی بھی بات کو سوچنے کا طریقہ اور دیکھنے کا نظریہ میرا ہے مگر کہانی میں اپنی مرضی سے میں نے کوئی تبدیلی نہیں کی۔

اس ناول کو لکھنے کے دوران طاری ہونے والی اپنی کیفیت شاید میں عمر بھر نہیں بھلا سکوں گی۔ اس ناول نے میری سوچ اور میرے نظریات میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ اسے لکھنے کے بعد میرا نظریہ محبت بہت وسیع ہوا ہے۔ محبت پر میرا یقین کامل ہوا ہے۔ محبت صرف قصے کہانیوں ہی

میں نہیں ملتی، محبت ہماری اس دنیا میں اپنی پوری سچائی کے ساتھ، اپنے مکمل وجود کے ساتھ موجود ہے۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، صبح کے سات بج رہے تھے۔ ساری رات جاگ کر میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ لکھنے بیٹھ گئی تھی۔ ناول ختم کرنے کی دھن ایسی تھی کہ رات بھر نیند کا ہوش ہی نہیں رہا تھا اور اب جب لکھ کر فارغ ہو چکی تھی تو گھڑی یہ بتا رہی تھی کہ سونے کا ٹائم گزر چکا ہے۔

اور ناشتے کے دوران مجھے ابا میاں سے یہ بھی کہنا تھا کہ وہ پہلی دستیاب فلائٹ سے میری واپسی کی سیٹ بک کروا دیں۔ مجھے اپنے شہر واپس پہنچنے کی ایک دم ہی بہت جلدی ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''ارے آپ؟'' سجاد کے ساتھ انہیں لاؤنج میں داخل ہوتا دیکھ کر میں حیران ہوئی۔ گیٹ پر ہونے والی بیل کو سن کر میرے ذہن میں یہ بالکل نہیں آیا تھا کہ آنے والے مہمان عمر حسن ہیں۔ لاؤنج میں میرے سارے بیگز اور سوٹ کیس جمع تھے۔ ابا میں اور رنا کے پاس آتے وقت چاہے صرف ایک ننھا سا بیگ لے کر آؤں، واپسی ہمیشہ اتنے ہی ساز و سامان کے ساتھ ہوا کرتی تھی۔ میرے بہن بھائیوں کے لیے بہت سے تحائف تھے اور بھی ڈھیر ساری سوغاتیں تھیں جو مجھ سے بے پناہ پیار کرنے والے میرے ساتھ کر رہے تھے۔ میری روانگی دوپہر میں تھی جبکہ ابھی صبح تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اپنی ساری پیکنگ سے فارغ ہونے کے بعد ان سے ملنے جاؤں گی مگر میرے جانے سے پہلے وہ خود یہاں آ گئے تھے۔

''روانگی کی تیاریاں مکمل ہیں؟'' انہوں نے اردگرد بکھرے سامان کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو ابا میاں نے میرے جانے کا بتایا ہوگا۔''

''ظاہر ہے انہوں نے ہی بتانا تھا۔ تم جیسی بے مروت لڑکی سے تو یہ توقع کی نہیں جاسکتی کہ اپنے جانے کا بتا دیتیں۔'' انہوں نے ایک مصنوعی سی خفگی چہرے پر طاری کی۔

''کل ہی تو میں نے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ کل کا سارا دن رنا کے ساتھ شاپنگ کرتے گزر گیا لیکن آپ سے ملے بغیر تو میں نے ہرگز نہیں جانا تھا۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ کو خدا حافظ کہنے آنے ہی والی تھی۔'' وہ یوں مسکراتے رہے، گویا انہیں میری بات کا بالکل یقین نہ آیا ہو۔

''میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ چاہیں تو ابا میاں یا رنا سے تصدیق کر لیں۔ میں نے انہیں بھی بتا دیا تھا کہ پیکنگ ختم کرتے ہی......''

میرے پرزور قسم کے وضاحتی بیان کو انہوں نے درمیان میں روک دیا۔ ''میں یونہی مذاق کر رہا تھا، مجھے تمہارے کہے بغیر بھی یہ یقین ہے کہ تم مجھ سے ملے بغیر یہاں نہیں جاتیں۔ دراصل میں محبت کو ساتھ لے کر اسلام آباد جا رہا ہوں۔ وہاں اس کے ہاتھ کے سلسلے میں ایک ڈاکٹر سے میں نے اپائنٹمنٹ لے رکھا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں چلا گیا اور پیچھے تم مجھ سے ملنے آئیں تو مجھے نہ پا کر بہت مایوس ہو گی۔ سو خود ہی جا کر تم سے مل آؤں۔'' انہوں نے مجھے اتنی اہمیت دی، میرے جانے کو اتنی اہمیت دی کہ بڑے ہونے کے باوجود خود مجھ سے ملنے آ گئے۔

''آپ بیٹھیں تو سہی۔'' میں نے انہیں کھڑے کھڑے گفتگو کرتے دیکھ کر بیٹھنے کو کہا مگر وہ بیٹھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔

''اس وقت یہ تکلفات رہنے دو، تم اپنی تیاریاں نمٹاؤ، میں بس کھڑے کھڑے تم سے ملنے آیا ہوں اور پھر محبت بھی میرا انتظار کر رہا ہے۔''

''محب آپ کے ساتھ ہے؟ کہاں ہے وہ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ باہر لان میں رک گیا ہے، آنٹی کے پرندوں کے پاس۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر اپنے ہاتھوں میں موجود نفیس سے ریپنگ پیپر میں لپٹا ایک پیکٹ میری طرف بڑھایا۔

''یہ تمہارے لیے، تمہیں تحفہ دینے کے لیے زیادہ سوچنا نہیں پڑا۔ ایک رائٹر کو کتابوں سے بہترین اور کیا تحفہ دیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ کتابیں تمہارے ذوق کے مطابق ہیں اور انہیں تم جب جب پڑھو گی تمہیں میں بھی یاد آ جایا کروں گا۔'' میں اس روز کے بعد ان سے آج مل رہی تھی اور مجھے ان کے چہرے پر کہیں یہ پچھتاوا نظر نہیں آ رہا تھا کہ انہوں نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ کیوں بتا دیا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میں نے ان سے تحفہ لینے میں ذرا بھی تکلف نہیں برتا تھا۔

''کتابوں کا بہت شکریہ لیکن میں آپ کو ایک بات بتاؤں، آپ کو یاد رکھنے کے لیے مجھے کوئی یادگار اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سب کے بغیر آپ کو یاد رکھوں گی اور زندگی بھر یاد رکھوں گی۔ آپ اپنی تحریر میں جتنے اچھے لگتے ہیں، خود اس سے کہیں بڑھ کر اچھے ہیں۔ آپ کی تحریر کو پڑھ کر میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا تھا اور آپ سے مل کر بھی میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ آپ بہت، بہت اچھے ہیں۔''

میں نے صدق دل سے اپنے جذبات ان تک پہنچائے اور وہ انہیں سن کر اخلاقاً مسکرائے بھی مگر اب میں انہیں جانتی تھی، مجھے پتا تھا وہ میری باتوں کو کم از کم ان جملوں کو ایک جذباتی اور نو عمر قاری کی جذباتی باتیں سمجھ رہے ہیں۔

''ہمارا ہر قاری بے وفا نہیں ہوتا۔ یقین کریں کہ ہمارا ہر قاری ہمیں نہیں بھلا دیتا۔ کیا میں نے آپ کو بھلایا؟ میں آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی، یہ بھی نہیں کہ آپ اس دنیا کے کس گوشے میں چھپ گئے ہیں پھر بھی میں آپ کے لفظوں سے محبت کرتی تھی، ان لفظوں ہی کی وجہ سے میں آپ کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ اگر میں ایبٹ آباد نہیں آتی، آپ سے کبھی مل نہ پاتی تو کیا آپ کبھی جان پاتے کہ اس دنیا میں ایک لڑکی زنیرہ عباس بھی ہے جو آپ کے انداز تحریر کی بہت بڑی پرستار ہے۔ اسی طرح نجانے اور کتنے ایسے لوگ ہوں گے جن سے آپ مل نہیں پائے مگر وہ آپ کو یاد رکھے ہوئے ہوں گے۔''

''تمہاری معصومانہ سی مجبوری مجھے اچھی لگتی ہے۔'' برسوں پہلے ایک لڑکی تھی جو انہیں مایوسیوں سے ہر اس بار باہر نکال لیا کرتی تھی جب کبھی وہ ناکام اور ناامید ہو جاتے تھے پھر اگر آج میں انہیں کسی مایوسی سے نکالنے کے لیے کچھ کہہ رہی تھی تو انہوں نے مجھ میں اسی کی جھلک دیکھنی تھی۔ وہ سب کے ساتھ اچھے تھے، وہ ہر ایک کے ساتھ پرخلوص اور بامروت تھے مگر میری اہمیت غیر معمولی تھی اور میری غیر معمولی اہمیت اس لیے تھی کہ میں انہیں اپنے مزاج اور اپنی عادتوں میں بالکل ودیعہ کمال جیسی لگا کرتی تھی جو اس جیسا ہوگا اس سے بھی محبت ہو جائے گی۔ کیسی محبت تھی یہ اور کیسی لڑکی تھی وہ؟ اسے بدقسمت کہوں یا بدنصیب۔ مجھ سے کوئی ایسی محبت کرے تو میں زندگی بھر کبھی ایک پل کے لیے بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑوں۔

''تمہارے ناول کا کیا بنا؟ مکمل ہوا کہ نہیں؟'' وہ جانے کے لیے پلٹنے لگے تھے اور پلٹتے پلٹتے انہیں اچانک ہی میرے ناول کا خیال آیا تھا۔

''جی ہو گیا۔'' اس میں جھوٹ تو نہیں تھا۔ ناول تو میں نے پورا لکھ لیا تھا جو وہ سمجھ رہے تھے، وہ نہیں کوئی اور سا سہی، پر لکھ تو لیا تھا۔ میں نے

سامنے میز پر رکھے اپنے بیگ پر اچٹتی نگاہ کی۔ اس بیگ میں میرے دونوں مسودے موجود تھے۔ میں لکھنے کیا آئی تھی اور لکھ کر کیا لے جا رہی تھی۔

''چلو یہ اچھا ہو گیا'' تمہارے یہاں آنے کا مقصد پورا ہو گیا۔ بہت دنوں سے باہر کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں تو میں سمجھ گیا تھا کہ خوب زور و شور سے لکھا جا رہا ہے۔ پروفیسر صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا تھا کہ مصنفہ صاحبہ آج کل کمرے میں بند ہو کر دھڑا دھڑ صفحے سیاہ کیے جا رہی ہیں۔''

''آپ دعا کریں کہ میری کہانی پڑھنے والے کے دل پر اثر کر جائے۔ میرے لفظوں میں وہ تاثیر ہو کہ پڑھنے والے کے دل میں اتر جائیں۔''

''انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔ دل سے لکھے جانے والے لفظ بے اثر نہیں ہوتے اور جہاں تک دعا کی بات ہے تو میری سب دعائیں اور ساری بہترین تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ تم لکھو، لکھو اور خوب لکھو۔ تم پڑھی جاؤ، پسند کی جاؤ اور خوب پذیرائی پاؤ۔ تمہارے سارے خواب پورے ہوں۔ زندگی سے وہ سب پا لو جو پانا چاہتی ہو اور ایک روز اتنی مشہور ہو جاؤ کہ میں فخر سے اپنے جاننے والوں سے کہہ سکوں کہ یہ چھوٹی سی لڑکی جو باتیں بہت بڑی بڑی لکھا کرتی ہے، یہ میری بہت پیاری دوست ہے۔'' انہوں نے اپنے دعائیہ جملوں کے اختتام پر کچھ شرارتی سا لہجہ اختیار کیا تو میں بھی ان کے ساتھ ہنس پڑی۔ کچھ دعائیں میری بھی تھیں ان کے لیے مگر وہ میں انہیں بتانا نہیں چاہتی تھی۔

میری بھی دعا تھی، خواہش تھی، تمنا تھی کہ عمر حسن پھر سے لکھنے لگیں۔ ایک تخلیق کار اپنے فن سمیت یونہی ضائع نہ ہو جائے مگر میں ان سے یہ بات کس طرح کہوں؟ اب اتنے برس گزر چکے ہیں۔ شاید وہ میرے کہنے پر بھی اب لکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے اندر کا تخلیق کار اگر مرا نہیں تھا تو زندہ بھی نہیں رہ سکا تھا۔ اسے جگانے کے لیے، عمر حسن سے پھر سے لکھوانے کے لیے جو جادوئی لہجہ اور جو طلسمی الفاظ چاہیے تھے، وہ مجھے نہیں آتے تھے۔

ہم دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے باہر آ گئے۔ محب مجھے دیکھ کر کچھ شرمیلے سے انداز میں مسکرایا پھر پرندوں سے توجہ ہٹا کر وہ ہم دونوں کے قریب آ گیا۔

''السلام علیکم'' اس نے جھٹ مجھے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام، کیسے ہو محب؟ سننے میں آ رہا ہے کہ محب صاحب فٹ بال کے بڑے زبردست کھلاڑی ہیں۔''

''آپ نے میرا گیم دیکھا تھا؟''

جب میں نے اس بچے کو پہلی بار دیکھا تھا تو یہ زندگی سے مکمل طور پر مایوس اور نا امید نظر آیا تھا۔ اسے دنیا کی کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی اور آج تقریباً ڈیڑھ مہینے بعد یہی بچہ آنکھوں میں امیدیں اور امنگیں لیے کھڑا تھا۔ اس بچے کی طرف دیکھتے دیکھتے دوسروں کی زندگیوں میں خوشیاں بکھیرنے والے اس شخص کی طرف میں نے دیکھا اور بے اختیار سوچنے لگی۔ اب اس کی اپنی زندگی میں بھی خوشیاں آ جانی چاہئیں۔

''میں نے دیکھا تو نہیں ابا میاں سے سنا ہے۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ محب گراؤنڈ میں بچوں کے ساتھ فٹ بال بہت عمدہ کھیل رہا تھا لیکن خیر اگلی بار جب میں یہاں آؤں گی، تب خود بھی آ کر تمہارا گیم ضرور دیکھوں گی۔'' محب کے ساتھ باتیں کرتے کرتے ہم تینوں گیٹ تک آ گئے تھے۔

''پھر یہاں دوبارہ کب آ رہی ہو؟'' گیٹ سے نکلنے سے پہلے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''دیکھیں شاید......''

''بھئی شاید والی بات مت کرو، دوبارہ جلدی آؤ اور آ کر اپنا وہ ناول لکھو جس کا ہیرو میں ہوں گا۔'' انہوں نے میری بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ انہوں نے یہ جملہ محض شوخی اور شرارت میں کہا تھا مگر میں تو واقعی انہیں اپنے ناول کا ہیرو بنا چکی تھی لیکن یہ بات میں نے انہیں ہرگز ہرگز بھی نہیں بتائی تھی۔

☆☆☆

''اب کچھ دنوں تک اس مصیبت سے دور رہنا۔ اللہ اللہ کر کے ایک عذاب ختم ہوا ہے۔ یہ نہیں ہو کہ جاتے ہی دوسری بلا سر پر لے لیں۔'' مجھے رخصت کرتے وقت یہ تنبیہی جملے نانا نے بڑی خفگی سے کہے۔

''نانا! آپ میرے لکھنے کو مصیبت کہہ رہی ہیں اور میرے ناولز کو عذاب اور بلا۔ بڑے دکھ کی بات ہے کہ مصنف کی قدر اس کے اپنے گھر والے ہی نہیں کر رہے۔'' مجھے جیسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔

''ارے ہمیں تو مصیبت اور عذاب ہی لگتا ہے۔ لے کر ہماری نازوں پلی بچی کی شکل بگاڑ دی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش نہ سونے جاگنے کی کوئی فکر۔ لگی پڑی ہیں دن رات۔ میں پوچھتی ہوں زنیرہ! کیا سب رائٹرز تمہاری طرح کے ہوتے ہیں اور اگر ہوتے ہیں تو ان کے گھر والے یہ خبط الحواسی برداشت کیسے کرتے ہیں؟''

''میرا تو خیال ہے میرے ہی جیسے ہوتے ہیں اور ان کے گھر والے انہیں کیسے برداشت کرتے ہیں، یہ تو گھر والوں ہی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔'' ابا میاں میری اور نانا کی گفتگو کو انجوائے کرتے مسکرا رہے تھے۔

نانا کے ساتھ کچھ دیر اسی طرح کی باتیں کرنے کے بعد ابا میاں اور نانا سے دعائیں لیتی اور انہیں خدا حافظ کہتی جب میں کراچی کے لیے عازم سفر ہوئی تو بہت مطمئن اور بہت خوش تھی۔ میرے سامنے میرا وہ ہینڈ بیگ رکھا تھا جس میں میری دو بہت قیمتی متاع تھیں۔ ایک مکمل، ایک نامکمل۔ میرا نامکمل مسودہ تو نامکمل ہی تھا۔ اس میں بہت تھوڑا سا کام باقی تھا مگر اب جلدی بھی اسے جلدی سے مکمل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

☆☆☆

مسودہ بھجوانے کی آخری تاریخ گزر چکی تھی۔ وہ تاریخ جس تک میری ایڈیٹر نے میرے مسودہ کا انتظار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ میرا ناول اب اگلے ڈیڑھ دو سالوں تک میگزین میں جگہ نہیں پا سکے گا، میں خوش اور مطمئن تھی۔ جو ناول میں نے پورا لکھ لیا اپنے اس ناول کے ساتھ میں کیا کرنے والی تھی مجھے اچھی طرح معلوم تھا اور شروع وقت سے معلوم تھا۔ میں یہ ناول کیوں لکھنا چاہتی ہوں اور لکھ لینے کے بعد مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ ناول شروع کرنے سے پہلے ہی میرے ذہن میں پوری طرح واضح تھا۔

☆☆☆

ڈیئر ایڈیٹر!

ناول آپ نے پڑھا۔ کیا آپ کو ایسا لگا کہ یہ کہانی یہاں ختم ہو جانی چاہیے۔ مجھے یقین ہے آپ کو ایسا ہرگز نہیں لگا ہوگا۔ حقیقی زندگی میں بہت اچھے لوگوں کے ساتھ اکثر بہت کچھ بہت اچھا نہیں ہو پاتا مگر کوئی بھی کہانی خاص طور پر اس کا انجام لکھتے وقت میرے ذہن میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ میرا قاری میری تحریر سے کوئی بھی منفی اور مایوس کن پیغام حاصل نہ کرے۔ وہ کتاب بند کر کے رکھے تو کوئی مایوسی بھری سوچ اور منفی بات اس کے ذہن پر طاری نہ ہو۔ بہت اچھے کے ساتھ آخر تک سب کچھ برا اس لیے ہوتا رہا کیونکہ اس کی اچھائیاں اس کی بہت بڑی کمزوریاں تھیں اور بدترین آدمی آخر تک اس لیے کامیاب ہوتا رہا کیونکہ اس کے پاس وہ تمام صفات تھیں جو اس زمانے میں کامیابی کے لیے درکار ہیں۔

میں اپنے قاری تک کسی بھی انداز میں کوئی بھی ایسا پیغام کبھی بھی نہیں پہنچانا چاہتی مگر اس بار اپنے قاری کے بارے میں سوچنے کی تو نوبت ہی نہیں آئی ہے۔ اس بار اپنی کہانی کو اختتام تک لاتے لاتے میں خود اس منفی احساس کی گرفت میں بڑی شدت سے آنے لگی ہوں کہ انسان کو بہت اچھا نہیں ہونا چاہیے۔ انسان کو کسی سے بہت سچی محبت کر لینے والا نہیں ہونا چاہیے، ورنہ آخر میں وہ بالکل اکیلا رہ جاتا ہے۔ بالکل تنہا...... اس کے پاس نہ کوئی رشتہ بچتا ہے، نہ کوئی محبت یہاں تک کہ دل کا سکون بھی نہیں۔ میں بہت ارفع و اعلیٰ ترین انسانی صفات اور محبتوں پر سے اپنا یقین کھونا نہیں چاہتی، اسی لیے چاہتی ہوں کہ اس کہانی کو آگے بڑھایا جائے، اس کا کچھ اور انجام کیا جائے۔

ابھی طفل مکتب ہوں اور ناول نگاری کے فن سے بہت زیادہ آگاہ بھی نہیں ہوں پھر بھی یہ سمجھتی ہوں کہ یہ ناول ابھی ختم نہیں ہوا۔ ابھی یہ ناول اپنے اندر ایک منفی پیغام چھپائے ہوئے ہے اور یہ اس کا بہت بڑا جھول ہے اور اس منفی اثر کو بے اثر کرنے کے لیے اس جھول کو دور کرنے کے لیے اس کا اختتام کچھ اور ہونا چاہیے مگر وہ اختتام کیا ہو؟ میں یہاں آ کر الجھ گئی ہوں۔ اسے اختتام تک پہنچانا مجھے میرے اختیار سے باہر نظر آ رہا ہے۔ سو آپ اس کام میں میری مدد کر دیجیے۔

کوئی بھی لکھنے والا کسی دوسرے فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس کی کہانیوں میں تبدیلیاں کرے، اس کا آغاز یا انجام مصنف کی مرضی اور اجازت کے بغیر از خود کر ڈالے یا بدل ڈالے۔

مگر میں یہ حق اپنی خوشی اور رضامندی سے آپ کو دے رہی ہوں کہ میرے اس ناول کا اختتام آپ کریں۔ پیچھے خالی صفحہ اسی مقصد کے لیے چھوڑا گیا ہے۔ آپ اس خالی صفحے میں وہ انجام لکھ دیں جو آپ کے خیال سے اس ناول کا وہ انجام ہونا چاہیے کہ جو پڑھنے والے پر کوئی بھی منفی سوچ اور غلط تاثر نہیں چھوڑے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ جو انجام آپ تجویز کریں گی میں اسے بغیر کسی بحث یا اختلاف کے خوش دلی کے ساتھ قبول کر لوں گی۔

اپنے ناول کے ایک بہترین اور منطقی انجام کی منتظر

زنیرہ عباس

یہ میرے اس خط کا مضمون تھا جو میں نے اپنے مسودے کے آخری صفحہ پر تحریر کیا تھا اور یہ خط جس کے نام لکھا گیا تھا میں اس وقت اپنا مسودہ لیے اسی کے روبرو تھی۔

''آپ مستقبل کی عظیم ایڈیٹر سے مل رہے ہیں۔''

''آنے والے وقت کا کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی روز میں کسی بڑے اخبار یا میگزین کے ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھی ہوں۔'' بعض دفعہ کہی باتیں کس طرح سچ ہو جاتی ہیں، چوبیس پچیس برس پہلے کون جانتا تھا کہ ودیعہ کمال واقعی ایک روز پرنٹ میڈیا کی ایک قد آور شخصیت بن چکی ہوگی۔ ادبی حلقوں میں جانی پہچانی اور قابل قدر شخصیت، ایک بڑی سرکولیشن والے مشہور میگزین کی ایڈیٹر۔ کیسی عجیب بات تھی میں عمر حسن اور ودیعہ کمال ان دو لوگوں کو کسی ذاتی حوالے سے جب نہیں بھی جانتی تھی، تب بھی ان دونوں ہی سے واقف تھی۔

جس طرح پچھلے کئی سالوں سے عمر حسن کو ایک مصنف کے طور پر جانتی تھی، اسی طرح ودیعہ کمال کو بھی ایک بڑے میگزین کی ایڈیٹر کے طور پر شکل سے اور نام سے دونوں طرح پہچانتی تھی۔ ادب سے شغف رکھنے والا ایسا کون ہو سکتا ہے جو ودیعہ کمال کو نہ جانتا ہو۔ میں ان کے میگزین کے لیے نہیں لکھتی تھی۔ میں ایک دوسرے میگزین کے لیے لکھا کرتی تھی مگر ان کا میگزین بھی ہر ماہ پابندی سے پڑھتی ضرور تھی اور اس پابندی اور باقاعدگی کی سب سے بڑی وجہ اس کا معیار تھا۔ ان کا رسالہ ہر لحاظ سے ایک بہترین اور معیاری رسالہ تھا۔

اور اس اعلیٰ ترین معیار کے پیچھے جو شخصیت کلیدی اہمیت کی حامل تھی، میں ان سے کیونکر ناواقف ہو سکتی تھی۔ اس اعلیٰ معیار کے پیچھے کارفرما ذہن ودیعہ کمال کو میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، باصلاحیت اور قابل خاتون کے طور پر جانتی تھی۔ اکثر اخبارات کے ادبی صفحات پر کسی کتاب کی تقریب رونمائی یا ادب وفن اور شعر و سخن کے حوالے سے منعقد ہونے والی مختلف تقاریب کی تصاویر میں بہت سے شاعروں، ادیبوں، ناشروں اور مدیروں کے درمیان ان کی بھی جھلک نظر آ جایا کرتی تھی۔

پھر زیادہ اچھے طریقے سے میں ان سے اس وقت واقف ہوئی تھی۔ جب تقریباً سال ڈیڑھ سال پہلے ایک اخبار کے ادبی صفحات میں ان کا تفصیلی اور باتصویر انٹرویو شائع ہوا تھا۔

اس انٹرویو کو پڑھنے کے بعد میں ودیعہ کمال کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ وہ میرے لیے ایک بہت پسندیدہ شخصیت بن گئی تھیں۔ اس انٹرویو میں انہوں نے اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے بارے میں، اپنے پسندیدہ شاعروں، ادیبوں کے بارے میں، اپنی پسندیدہ کتابوں کے بارے میں، اپنے مشاغل کے بارے میں اور آخر میں اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی سوالات کے جواب دیے تھے۔ یہاں تک کہ انٹرویو لینے والے نے ان سے ان کے شادی نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو انہوں نے اس کا بھی بڑی متانت کے ساتھ یہ جواب دیا تھا کہ انہیں ان کا ہم مزاج، انہیں کی جیسی ذہنی سطح کا حامل کوئی شخص نہیں ملا۔ اگر مل جاتا تو ضرور شادی کر لیتیں۔

تب میں اس جواب سے بہت متاثر ہوئی تھی۔

گھر والوں کے متعلق بات کرتے انہوں نے اپنے گھر کے تمام افراد کے بارے میں مختصراً بتایا تھا۔ ان میں سرفہرست سعادت علی خان کا،

اپنے ابامیاں کا ذکر کیا گیا تھا۔ انہیں اپنی بہترین تعلیم وتربیت اور زندگی میں حاصل ہوئی ہر بہترین چیز اور ہر کامیابی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ گھر کے ان افراد میں بوا جی بھی شامل تھیں۔ اگر کوئی شامل نہیں تھا تو وہ عمر حسن تھا۔ اپنے بچپن کا ذکر کیا تھا مگر اس بچپن میں عمر حسن نہیں تھا۔ پسندیدہ کتابوں میں Forever کا نام نہیں تھا۔

ودلیعہ کمال وہ نہیں جو وہ انٹرویو کہہ رہا تھا، ودلیعہ کمال وہ ہے جیسا میں نے اسے اب جانا ہے۔ عمر حسن سے ان کی گزشتہ زندگی کے متعلق سب کچھ سنتے وقت میرے ذہن میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ میں اس پر ناول لکھوں گی مگر جب وہ مجھے گھر چھوڑنے میرے ساتھ چلتے ہوئے آرہے تھے تب ان کے اداس چہرے اور سست قدموں کو دیکھ کر میں نے خود سے سوال کیا تھا۔

''بس تمہارا صرف یہی مقصد تھا، ایک شخص کے تمام زخموں کو پھر سے تازہ کردو جو وہ اتنے برسوں میں بھول نہیں پایا اسے اور شدت سے یاد دلا دو؟ آج رات وہ گزشتہ تمام راتوں سے بھی زیادہ شدت سے روئے؟ کیا خوشیوں پر اس شخص کا کوئی حق نہیں؟ کیا اس کی زندگی یونہی گزرتی رہے گی اور ایک روز یونہی تمام ہو جائے گی۔ محرومیوں کے ساتھ، نارسائیوں کے ساتھ؟''

''اس شخص کا حق ہے خوشیوں پر، بہت زیادہ حق ہے۔ اس سے زیادہ خوشیوں کا کوئی اور حقدار ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت وقت بیت چکا، کئی ماہ و سال گزر چکے۔ زندگی کے کئی سال گنوائے جا چکے مگر پھر بھی ابھی کچھ دیر ہوئی ہے، بہت دیر نہیں ہوئی۔

جب تک زندگی باقی ہے، بہت دیر ہو بھی نہیں سکتی۔ زندگی کے کاسے میں ابھی بہت سے ماہ وسال باقی ہیں اور وہ باقی رہ جانے والے ماہ و سال اس اذیت ناک تنہائی میں کیوں جیے جائیں؟ مجھے اپنی داستان حیات سناتے وقت جو بات عمر حسن کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگی، وہ میں ان کے ساتھ چلتے چلتے اپنے نانا، نانی کے گھر تک پہنچتے وقت تک سوچ چکی تھی۔

''مجھے یہ کہانی لکھنی ہے، مجھے عمر حسن کی کہانی لکھنی ہے۔ اپنی شہرت اور ناموری کے لیے بہت لکھتی ہوں، پہلی بار کسی کی زندگی بدلنے کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔'' انہیں خدا حافظ کہہ کر گیٹ سے اندر قدم رکھتے میں نے خود سے کہا تھا۔

''اس لڑکی ودلیعہ کمال کو اس کی کچھ خامیوں سے آگاہ کیا جانا بہت ضروری ہے۔ یہ اسی کی زندگی کے واقعات ہیں جو میں لکھنے جا رہی ہوں مگر میں اسے ان تمام واقعات کو اس زاویہ سے دکھانا چاہتی ہوں جس سے اس نے پہلے کبھی انہیں دیکھا نہیں ہوگا۔

عمر حسن اور ودلیعہ کمال کی زندگی کی کہانی، ان کی محبت کی کہانی میں، میں ایک تیسرے فرد کی حیثیت سے شامل ہوئی اور تیسرا فرد جب کسی کے گزرے حالات سنتا ہے تو اسے اپنے زاویہ نگاہ سے دیکھتا، سوچتا، سمجھتا اور پرکھتا ہے۔

میں نے بھی عمر حسن اور ودلیعہ کمال کے متعلق بہت کچھ سوچا تھا۔ ودلیعہ کمال مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے کام کسی سے کروانا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اپنے آنسو کسی کے سامنے بہانا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ کسی کا بھی احسان لینا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ سب کو دینا چاہتی تھی اور لینا کسی سے نہیں۔ میں ان میں سے کسی بھی بات کے لیے اسے غلط نہیں سمجھتی تھی۔

ٹھیک ہے یہ اس کی فطرت تھی اور مکمل طور پر تو کوئی بھی انسان اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ان معاملات میں تھوڑی سی انتہا پسند تھی تو یہ ایک

ایسی فطری کمزوری تھی جو نظر انداز کی جا سکتی تھی۔ ودیعہ کمال کو پیش آئے اس حادثے کے بعد کے ودیعہ کمال کے تمام ردعمل بالکل جائز تھے۔ اس حادثے کے متعلق لکھنے کے دوران میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے کردار یعنی ودیعہ کمال کی جگہ خود کو رکھ کر دیکھا تھا۔ اگر میرے ساتھ ایسا حادثہ ہوتا تو پھر میرا ردعمل کیا ہوتا؟ قلم چلا کر چند سطروں میں اس حادثے کو لکھ دینے اور اسے حقیقت میں سہنے میں بہت فرق ہے۔ اس لڑکی نے وہ کرب سہا تھا۔

وہ اپنے ہر بدصورت رویے کے لیے حق بجانب تھی۔ ودیعہ کمال کو ہر بات کے لیے درست سمجھ لینے کے باوجود میں اسے اس کے آخری فیصلے کے لیے غلط سمجھتی تھی۔ بہت غلط، سراسر غلط۔ یہ کوئی عام سی محبت نہیں تھی، یہ عمر حسن اور ودیعہ کمال کی خاص محبت تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے متعلق یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح نہیں گزار سکتے۔ زندہ لاشوں کی طرح تو جی سکتے ہیں مگر زندہ لوگوں کی طرح نہیں۔ کیا ودیعہ کمال یہ سب نہیں جانتی تھی؟ بالکل جانتی تھی۔ اپنے ادھورے وجود کو عمر حسن کی زندگی سے نکال کر اسے ایک مکمل زندگی گزارنے کا موقع دیتے وقت کیا ودیعہ کمال کے دل کو یہ خبر نہیں تھی کہ اس کے بغیر مکمل، نامکمل، ادھوری یا پوری تو کیا وہ کسی بھی طرح کی زندگی جی ہی نہیں سکے گا۔ وہ زندگی کو ایک سزا کی طرح کاٹے گا اور یہیں آ کر ودیعہ کمال مجھے خود غرض بھی لگی تھی اور انا پرست بھی۔ اپنی انا پرستی میں اس نے خود اپنے آپ کو تو تباہ کیا ہی تھا، ساتھ ہی اس انسان کی زندگی بھی برباد کر دی تھی جسے اپنی زندگی سے بڑھ کر چاہتی تھی۔ وہ اس شخص کو کتنی بے رحمی سے تنہا کر گئی جس کی محبت کو دل میں بسائے خود بھی آج تک تنہا زندگی گزار رہی ہے۔ ایک انا کی خاطر اس نے کس سنگ دلی سے اس شخص سے خود کو چھین لیا، اس کی محبت کو چھین لیا، اس شخص سے اس کے تمام رشتے چھین لیے۔ وہ رات کہ کسی بھی سبب ودیعہ کمال اگر ساحل کے قریب کہیں موجود ہوتی اور عمر حسن کو صفحہ در صفحہ اس کا مسودہ لہروں کے سپرد کرتے دیکھ لیتی تو وہ منظر دیکھ نہ پاتی۔ اپنا ہر ظالمانہ فیصلہ واپس لے لیتی۔ عمر حسن کے مسودے کو بچا لیتی۔ ایک تخلیق کار کو مرنے سے بچا لیتی۔ اس لڑکی کو یہ یاد دلانا بھی بہت ضروری تھا کہ وہ شخص اپنی محبت میں کتنا سچا تھا وہ واقعی لکھنا بھول چکا تھا۔ وہ لفظ کھو چکا تھا۔ وہ کہانیاں کہنے کی صلاحیت گنوا چکا تھا۔

وہ یہ تو جانتی ہی نہیں ہوگی کہ اس سے بچھڑ کر عمر حسن نے کتنے سالوں تک لکھنے کی پیہم کوششیں کی تھیں۔ وہ شاید یہ سمجھتی ہوگی کہ اس سے جدا ہو کر عمر نے کبھی قلم ہاتھ میں ہی نہیں اٹھایا مگر میں اسے ہر اس رات کی کرب ناک تنہائی، بے بسی اور بے اختیاری کے بارے میں بتانا چاہتی تھی، جب لکھنے کی کوششوں میں نڈھال ہوتے پوری رات جاگتے رہنے کے بعد عمر حسن صبح اشکوں کے ساتھ اپنے کمرے میں ہر طرف بکھرے کاغذ سمیٹا کرتا تھا۔

میں ایک مشکل کام کرنے جا رہی تھی، میں ایک بڑا ہی عجیب و غریب کام کرنے جا رہی تھی۔ میں ایک لڑکی کے ہاتھوں میں اسی کے سوانح حیات دینے جا رہی تھی جس میں اس کی زندگی کے بہت سے دکھوں کا ذمہ دار میں نے اسی کو ٹھہرایا تھا۔

میرے لفظوں میں کتنا اثر ہے، یہ میں نہیں جانتی تھی مگر اتنا معلوم تھا کہ اس کہانی میں لکھا ہر لفظ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے لکھا ہے، صرف اور صرف کسی کی زندگی بدلنے کے لیے لکھا ہے۔ اس تحریر کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ ایک انسان کی زندگی میں خوشیاں پھر سے واپس آ جائیں۔

اور یوں کراچی آنے کے اگلے ہی روز میں اپنا مسودہ لیے دھڑکتے دل کے ساتھ ودیعہ کمال کی دفتر میں موجود تھی۔ ''ایڈیٹر ودیعہ کمال'' میرے کانوں میں بیس سال کے عمر حسن کا قہقہہ گونجا۔ ''ایک وقت آئے گا جب اپنے ہنسنے پر شرمندہ ہو گے اور تمہاری اتنی بتیسی کیوں نکل رہی ہے، میں کیا ایڈیٹر نہیں ہو سکتی۔ آنے والے وقت کا کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی روز میں کسی بڑے اخبار یا میگزین کے ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھی ہوں۔''

پر یقین مگر خفگی بھری آواز اٹھارہ سال کی ودیعہ کمال کی۔ میرے کانوں میں یہ آوازیں گونج رہی تھیں اور میں اپنے سامنے کرسی پر باوقار انداز میں بیٹھی میچور عمر کی خاتون کو دیکھ رہی تھی۔ میری کہانی میں ودیعہ کمال کا کردار اس وقت ختم ہو گیا تھا جب وہ تئیس سال کی تھی اور اس وقت میرے سامنے بیالیس سال کی ودیعہ کمال موجود تھیں۔ بہت باوقار، بہت شاندار اور بہت خوبصورت۔ ان کے چہرے سے دو تین سال کی کمی کے ساتھ ان کی عمر ظاہر ہو رہی تھی۔ بیالیس کے بجائے وہ انتالیس، چالیس کی لگ رہی تھیں مگر یہ ظاہر ہوتی عمر ان کی شخصیت کے وقار کو بڑھا کر انہیں مزید خوب صورت اور مزید گریس فل بنا رہی تھی۔ اخبارات میں تصاویر دیکھنے اور روبرو دیکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ میں انہیں آمنے سامنے پہلی مرتبہ دیکھ رہی تھی پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سے اس سے پہلے بھی بے شمار بار مل چکی تھی۔ ہاں میں مل تو چکی تھی، بے شمار بار، لاتعداد بار۔ ودیعہ کمال کے بچپن سے لے کر اس کے بڑے ہونے تک ہر سال، ہر مہینے اور ہر دن میں۔

اپنی زندگی کے جس جس مقام پر وہ خوش ہوئی تھیں، مسکرائی تھیں۔ میں بھی مسکرائی تھی اور جہاں ان کی آنکھوں سے اشک بہے، میری پلکیں بھی نم ہوئی تھیں۔ میں ودیعہ کمال کو خود ودیعہ کمال سے بھی زیادہ جانتی تھی۔ اپنی شخصیت کے وہ بہت سے پہلو جو شاید وہ بھی نہ جانتی ہوں، میں انہیں جانتی تھی۔

وہ فون پر کسی سے مصروف گفتگو تھیں۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی تھی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اب میرے پاس یہ کام تھا کہ میں کن انکھیوں سے ان کا جائزہ لیتی رہوں۔ سادہ مگر پر وقار لباس، سلیقے سے شانوں پر پھیلا دوپٹہ، کندھوں سے نیچے آتے سلکی بال جنہیں کیچر میں جکڑا گیا تھا۔ لبوں پر ایک بہت ہی ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک کہ جس کی موجودگی بھی بغور دیکھنے پر ہی ظاہر ہو۔ اس ایک رنگ کے سوا چہرے پر کسی بھی انداز میں کوئی رنگ استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ مکمل طور پر دھلا دھلایا صاف شفاف چہرہ، چہرے پر غرور یا تمکنت کی جگہ سادگی اور تواضع کسی بھی بڑی سرکولیشن والے اخبار یا میگزین کے ایڈیٹر کے متعلق میرا یہ خیال کہ "وہ تو سیدھے منہ کسی سے بات نہیں کرتے ہوں گے، اپنی بڑی سرکولیشن کے تکبر میں ڈوبے ہوتے ہوں گے۔" پہلے ہی منٹ میں غلط ثابت ہو چکا تھا۔

ودیعہ کمال کے متعلق، ان کی گزشتہ زندگی کے متعلق سب کچھ جان لینے کے باوجود یہاں آتے وقت ایک نفسیاتی خوف مجھ پر حاوی تھا۔

ہو سکتا ہے وہ اتنی خوش اخلاق اور اتنی بامروت نہ رہی ہوں۔ انیس سال کسی بھی انسان کو بدلنے کے لیے ایک بہت بڑا عرصہ ہے۔ اس عرصہ میں انسان واقعی بدل سکتے ہیں مگر ودیعہ کمال تو مجھے ویسی ہی لگ رہی تھیں جیسی وہ میری تحریر میں تھیں۔

وہ فون پر کسی مصنف سے گفتگو کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے کچھ کاغذات پڑے تھے، انہیں بھی گفتگو کے دوران ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس طویل گفتگو کے بیچ ان کے اسسٹنٹ نے ایک دو بار ان سے کچھ پوچھا تو انہوں نے ان دونوں کاموں کے دوران ان کی بھی بات سنی اور سر اثبات میں یا انکار میں ہلا کر یا محض ہاتھ کے اشارے سے ان کی بات کا جواب دیا۔

اور ان تمام مصروفیات کے ساتھ انہوں نے مجھے بھی نظر انداز نہیں کیا ہوا تھا۔ گاہے بگاہے وہ ایک سادہ اور پر خلوص سی مسکراہٹ اس طور پر میری طرف اچھالتیں جو مجھے یہ احساس دلاتی رہے کہ میں نظر انداز نہیں کی جا رہی ہوں۔ ایک وقت میں اتنے سارے کام اور وہ بھی اس خوبی سے

واقعی یہ کام وودیعہ کمال ہی کر سکتی ہیں۔ ایک کامیاب ترین ایڈیٹر ہی یہ سب اس طرح کر سکتا ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں اتنے سارے لوگوں سے ڈیل کر رہی تھیں اور کیا کمال کی بات تھی کہ ان سب میں سے کسی ایک کو بھی یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے توجہ نہیں دے رہیں۔

وہ مصنف کی طویل گفتگو سے عاجز آ رہی تھیں مگر اپنے لہجے کی خوش اخلاقی سے یہ ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھیں کہ ان کا دفتری کام ان کے سامنے پڑے صفحے، ان کے ماتحت افراد وہ ہر ایک کی طرف متوجہ تھیں۔

اور اپنی مصروفیات میں انہیں ایک بن بلایا مہمان بھی پوری طرح یاد تھا۔ ایک وقت میں اتنے سارے کام میں ان سے امپریس ہو رہی تھی۔

انہوں نے کسی بھی قسم کا کوئی زیور نہیں پہن رکھا تھا، سوائے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں تین نگوں سے آراستہ ایک انگوٹھی کے۔ دائیں ہاتھ سے وہ کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھیں اور بائیں ہاتھ سے انہوں نے ریسیور پکڑ رکھا تھا۔ میں ان کے ریسیور والے ہاتھ کو تھوڑی تھوڑی دیر بعد ضرور دیکھ رہی تھی۔ میری نگاہیں ہیر پھیر کر اس انگوٹھی پر جا کر ٹھہر رہی تھیں۔

"معاف کیجیے گا، آپ کو انتظار کرنا پڑا۔" ریسیور کریڈل پر رکھتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔ میں اس معذرت کے جواب میں "کوئی بات نہیں" جیسی ایک ہلکی سے مسکراہٹ اپنے چہرے پر لائی اور پھر فوراً ہی یہ بھی سوچا کہ مجھے ان کے پوچھنے سے پہلے خود ہی اپنا تعارف کروانا چاہیے۔

"میں زنیرہ عباس ہوں۔" بولنے کے ساتھ ہی مجھے اپنی حماقت کا شدید احساس ہوا۔ اس ڈھنگ لہجے میں خود اعتمادی کے ساتھ "میں زنیرہ عباس ہوں" کہا گیا تھا جیسے "میں بانو قدسیہ ہوں۔"

"تعارف کا اس سے بہتر طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا؟" میں نے دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کی مگر انہوں نے میرے تعارف کے انداز سے فوراً ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ میں "بہت کچھ" نہیں بھی ہوں، تب بھی خود کو "کچھ" سمجھتی ضرور ہوں اور چاہتی ہوں کہ مجھے میرے نام سے پہچان لیا جائے۔

"زنیرہ عباس۔" "صدائے آشنا" کی مصنفہ؟" میرے بے وقوفانہ تعارفی جملے کے محض ایک منٹ کے اندر اندر انہوں نے یہ بات کہہ کر مجھے سخت ترین حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں بالکل ہکا بکا رہ گئی تھی۔ ڈھائی تین سال پہلے کا میرا بالکل ابتدائی دور کا ایک ناول وہ انہوں نے پڑھا تھا، میرے لیے تو یہی حیرت کی بات تھی پھر مزید حیرت یہ کہ اسے اب تک اس کے عنوان اور مصنفہ کے نام کے ساتھ یاد رکھا ہوا تھا۔

"آپ نے میرا ناول پڑھا تھا؟" میں نے اسی خوشگوار حیرت و استعجاب میں گھرے ان سے یہ سوال پوچھا۔ کسی بھی فیلڈ میں سینئرز، جونیئرز کو بہت جلدی اپنی برابری کی سطح پر نہیں لاتے مگر وہ مجھ سے یہ کہہ کر کہ وہ مجھے جانتی ہیں، انہوں نے میری تحریر پڑھی اور یاد رکھی ہے، مجھے بہت معتبر کر گئی تھیں۔

وہ میری حیرت پر مسکرائیں اور دھیمے لہجے میں بولیں۔ "پڑھا تھا اور بہت پسند آیا تھا، تب ہی تو وہ اب تک یاد بھی ہے۔ آپ کا انداز تحریر بہت اچھا ہے۔ گو اس کے بعد آپ کی کوئی تحریر پڑھ نہیں پائی مگر آپ کا نام نگاہوں سے اکثر گزرتا رہتا ہے۔" اصولاً مجھے اپنی تعریف کے جواب میں فوراً شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

مگر میں ان کی تعریف کا شکریہ فوراً ادا نہیں کر پائی۔ میری خاموشی کی وجہ ان کی مسکراہٹ تھی۔ میری نگاہیں ان کی آنکھوں میں اٹک گئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے بالکل آمنے سامنے تھے۔ ان کی مسکراہٹ اور ان کی آنکھیں مجھے بہت جانی پہچانی لگ رہی تھیں۔

میں ودیعہ کمال کی آنکھوں میں بھی بالکل وہی درد ٹھہرا دیکھ رہی تھی جو میں نے عمر حسن کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ ودیعہ کمال کی آنکھیں مجھے عمر حسن کی آنکھیں لگ رہی تھیں۔

ودیعہ کمال بھی اسی کرب میں زندگی گزار رہی تھی جس میں عمر حسن۔

عمر حسن اس کے دل میں آج بھی اسی جگہ، اسی مقام پر تھا جہاں انیس سال پہلے تھا۔ میں ان آنکھوں میں دیکھتے چند لمحوں میں یہ یقین پا چکی تھی۔ میں یہاں آتے وقت یہ سوچ کر آئی تھی کہ ودیعہ کمال سے اگر لڑ نہ بھی سکی تب بھی در پردہ طنز و طعنے انہیں ضرور دے کر آؤں گی۔ میں عمر حسن کی زندگی کے 19 سالوں کا سارا حساب ودیعہ کمال سے مانگنے کے ارادے سے آئی تھی۔

اور اب میں سوچ رہی تھی کہ خود تباہ ہو جانے والے ایک انسان سے میں کسی اور کی تباہی کا کیا حساب مانگوں؟ تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلتے جس کے خود پاؤں شل ہو چکے ہیں، اس سے کسی اور کی تکلیف کا کیا ذکر کروں؟ جو خود پیاسا ہے جو خود دھوپ سہہ رہا ہے، اس سے کسی اور کی پیاس اور دھوپ کی کیا بات کروں؟ ودیعہ کمال محبت کرنا اور محبت نبھانا جانتی تھی، وفا کرنا اور وفا نبھانا جانتی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ کوئی اپنی پوری زندگی اس کے نام کر دے۔ عمر حسن نے اپنی زندگی کے انیس سال کسی پتھر کی محبت میں نہیں گنوائے تھے۔ ان کے بیچ آنے والی دوری، اس جدائی کا سبب ودیعہ کمال تھی۔ اس کے غلط ظالمانہ، ناجائز اور ناروا فیصلے کی وجہ سے وہ جدا ہوئے تھے مگر اس سے دور رہ کر خوش تو وہ خود بھی نہیں رہ پائی تھی۔ اس سے غلطی ہوئی تھی، اس سے بہت بڑی غلطی ہوئی تھی۔

میں نے چند لمحوں میں کیا کچھ سوچ ڈالا تھا مگر اپنی کوئی بھی سوچ ان پر ظاہر نہ کرتے میں نے بظاہر ہنستے مسکراتے بڑی خوش دلی کے ساتھ ان کی تعریف کا شکریہ ادا کیا۔ ان کی بہترین یادداشت اور خوش اخلاقی صرف میرا اور میرے ناول کا نام یاد رکھ لینے تک محدود نہیں تھی۔ انہوں نے اگلے کئی منٹوں تک میرے ناول کی تھیم، پلاٹ اور کرداروں کے متعلق تبصرہ کر کے مجھے مزید حیرت سے دوچار کر دیا۔ کسی انسان کی اس سے بہترین یادداشت میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مجھے اپنی اچھی یادداشت پر فخر بلکہ کسی قدر غرور تھا مگر یہاں تو مقابل مجھ سے بھی بڑھ کر تھا۔

''آپ ہمارے لیے بھی تو لکھیے۔'' مجھ سے یہ بات کہہ کر انہوں نے میرا کام مزید آسان بنا دیا تھا۔ مجھے باضابطہ لکھنے کی دعوت دے کر انہوں نے میرا مدعا میرے لیے کافی سہل کر دیا تھا۔

''بالکل لکھوں گی اور لکھوں گی کیا، میں آپ کے لیے لکھ چکی ہوں۔ دراصل میں آج آئی ہی اسی لیے ہوں۔'' میں نے اپنے بیگ میں سے سلیقے سے پیک ہوا اپنا مسودہ باہر نکالا۔

میرے ہاتھ میں مسودہ دیکھ کر وہ خوشگوار انداز میں یوں مسکرائیں، گویا آج یہاں اپنے دفتر میں بیٹھی ہی اسی انتظار میں تھیں کہ زنیرہ عباس آئے اور آ کر اپنا مسودہ انہیں سونپے۔

کسی کو ناراض نہ کرنے والی، سب کو ساتھ لے کر چلنے والی، سب کو خوش رکھنے والی ودیعہ کمال نے زندگی میں دو انسانوں کو بہت دکھ دیا تھا۔ بہت زیادہ دکھ دیا تھا۔ ایک عمر حسن کو اور ایک ودیعہ کمال کو۔ ودیعہ کمال نے ودیعہ کمال ہی کی خوشیاں چھین لی تھیں۔

''تم تو یک طرفہ اور حقیقت پسندانہ فیصلے کر کے بہت مطمئن تھیں پھر آج تمہارے چہرے پر یہ تھکن کیوں؟ تمہاری آنکھوں میں یہ درد کیوں؟ تمہاری انگلی میں انیس سالوں بعد بھی تمہاری منگنی کی یہ انگوٹھی کیوں؟ تمہارے بک شیلف میں اس شخص کی کتاب کیوں؟ اور تمہاری زندگی میں وہ ایک نامکمل اور ادھورا انسان جس کے ساتھ مل کر تمہیں ایک مکمل زندگی گزارنی تھی، کیوں نہیں؟''

ایک پل کو میرا دل چاہا میں ان سے یہ سب کہہ ہی ڈالوں۔ عمر حسن کا نام اپنے انٹرویو میں پسندیدہ رائٹر کے طور پر نہ لینے والی نے اپنے دفتر کے بک شیلف میں اسی کی کتاب سب سے نمایاں جگہ پر رکھی تھی۔ بظاہر کسی اور کو ڈھیر ساری کتابوں میں رکھی وہ کتاب ہرگز نمایاں نہیں لگتی ہوگی مگر میں جانتی تھی کہ وہ کتاب نمایاں جگہ پر رکھی ہوئی تھی، اس طرح کہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ جب بھی سر اوپر اٹھائیں تو نگاہیں سیدھی اسی کتاب سے ٹکرائیں۔ میں ان سے اس کتاب کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتی تھی مگر پہلے مسودے پر بات ہو رہی ہے تو پہلے اسی بات کو نمٹالوں۔

''میں آج اپنا مسودہ ہی لے کر آپ کے پاس آئی ہوں لیکن میں اس کے متعلق آپ سے کچھ بات بھی کرنا چاہتی ہوں۔'' میں نے مسودہ میز پر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ میرا دل یک بارگی بہت تیز دھڑکنے لگا تھا۔ میری محنت کامیاب ہوگی یا ناکام، کامیابی کا عزم رکھنے کے باوجود مجھے ناکامی کا ڈر بھی تھا۔

کراچی آنے کے بعد کل سارا دن میں نے وہ جملے اور وہ باتیں اپنے ذہن میں ترتیب دی تھیں جو مجھے ودیعہ کمال سے کہنی تھیں اور اب میں اپنے پہلے ہی سے سوچی بات ان سے کہنے لگی تھی۔ وہ میری طرف پوری طرح متوجہ تھیں۔

''ناول تو میں نے لکھ لیا ہے اور میں اپنی کہانی سے مطمئن بھی ہوں مگر پھر بھی اپنی کہانی کے ایک کردار کے حوالے سے کچھ الجھن کا شکار ہوں۔ میرا لیڈنگ فیمیل کیریکٹر اس کی نفسیات میں شاید درست طور پر سمجھ نہیں پا رہی، اسی لیے ناول کے اختتام پر ایک عجیب سی تشنگی اور بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ محض میرا وہم ہو اور کہانی ہر اعتبار سے مکمل ہو مگر میں پھر بھی اس بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتی ہوں۔''

''آپ کی کہانی کیا ہے؟'' انہوں نے مسودہ اپنی طرف کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''کہانی تو بہت سادہ سی ہے، زیادہ کرداروں کی بھیڑ بھاڑ نہیں ہے۔ مرکزی کردار بس دو ہی ہیں۔ انہیں کے احساسات، جذبات اور زندگی کے نشیب و فراز کی سادہ سی کہانی۔ محبت کو پا کر کھو دینے کی داستان مگر میں پھر بھی کچھ الجھن میں ہوں۔'' میں نے گول مول سا جواب دیا۔

''شاید میں آپ کو اپنی الجھن سمجھا نہیں پاؤں گی۔ دراصل لکھنے میں تو میری قوت اظہار بہت اچھی ہے۔ مگر بولنے میں بالکل نہیں۔ زبانی میں آپ کو وہ بتا نہیں پاؤں گی جو بتانا چاہتی ہوں۔

اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ یہ مسودہ پڑھ لیں۔ میں آپ کی رائے چاہتی ہوں تاکہ میری تشنگی دور ہو سکے۔'' میں نے اپنے سوچے ہوئے جملے ان سے کہہ ڈالے۔

''مجھے پتا ہے میں آپ سے تھوڑا سا ناجائز اور آؤٹ آف دا وے فیور مانگ رہی ہوں مگر کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرا مسودہ آپ خود پڑھیں، یہ آپ کی پوسٹ کے شایانِ شان نہیں، مگر میں اپنے مسودے پر آپ کا تبصرہ اور آپ کی رائے چاہتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ مسودہ سب سے پہلے آپ ہی دیکھیں؟'' وہ میری باتوں کے جواب میں مسکرائیں۔

''میں خود دیکھوں گی یہ وعدہ تو کر سکتی ہوں مگر فوراً دیکھوں گی یہ وعدہ نہیں کر سکتی۔ آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔''

مجھے اپنی باتوں میں کچھ ایسی باتوں کا فوراً اضافہ کرنا تھا جن سے چونک کر وہ جلد از جلد میرا مسودہ دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ جتنی دیر میں، میں یہ سب سوچ رہی تھی وہ چائے منگوا چکی تھیں۔

''کیا آپ نے بچپن ہی میں اس فیلڈ کا انتخاب کر لیا تھا؟'' چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا۔

''اس فیلڈ کا تو نہیں۔ ہاں علم و ادب اور لکھنے پڑھنے سے متعلق شعبہ کا انتخاب کروں گی یہ جانتی تھی۔ دراصل میری پرورش ایک علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی۔'' انہوں نے چائے کا سپ لیتے ہوئے مجھے جواب دیا۔

''اب تک کتنے رائٹرز کو متعارف یا یوں کہہ لیں کہ دریافت کر چکی ہیں؟''

''صحیح تعداد تو خود مجھے بھی یاد نہیں ہے۔ ویسے کیا یہ میرا انٹرویو ہو رہا ہے۔'' انہوں نے متبسم لہجے میں پوچھا۔ میں جواباً مسکرا دی۔

''آپ اتنے سالوں میں کتنے رائٹرز کو دریافت کر چکیں، یہ تو ظاہر ہے یاد رکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ مگر آپ کو یہ تو ضرور یاد ہوگا کہ پہلی بار آپ نے کس رائٹر کو دریافت کیا تھا؟ پہلی بار آپ نے کس رائٹر کو یہ بتایا تھا کہ وہ اگر چاہے تو بہت اچھا لکھ سکتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ پہلی بار آپ نے کس رائٹر سے لکھوایا تھا۔'' میرا لہجہ بھی سادہ تھا اور میری نظریں بھی مگر میرا سوال سادہ نہیں تھا۔ لیکن وہ دو یہ کمال تھیں اور اتنی جلدی بوکھلا جانے والوں میں سے وہ ہرگز نہیں تھیں، سو چہرے پر وہی نرم نرم سی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے عام سے لہجے میں بولیں۔

''اتنے برس بیت گئے۔ اب تو یہ یاد کرنا بھی بہت مشکل ہے۔ بیس برس ہو گئے مجھے اس شعبے سے وابستہ ہوئے اور بیس سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔''

میں خاموشی سے ان کی طرف ان نظروں سے دیکھتی رہی، جیسے مجھے ان کی بھول جانے والی بات کا سو فیصد یقین آ گیا ہے۔

پھر میں نے یونہی بیٹھے بیٹھے ان کے بک شیلف پر قصداً نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

''ارے Forever؟'' میں نے خوشی اور حیرت کا ایسا ملا جلا مظاہرہ کیا جیسے اس کتاب پر ابھی ابھی میری نگاہ پڑی ہے۔

''یہاں مجھے عمر حسن کی کتاب نظر آ رہی ہے۔ کیا میری طرح آپ بھی ان کی کتاب کو پسند کرتی ہیں؟'' میں نے بک شیلف سے نظریں ہٹا کر براہ راست ان کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں، اچھی کتاب ہے۔ مجھے پسند ہے۔'' انہوں نے سادہ سے لہجے میں بہت مختصر فقرہ بولا۔ مگر میں اس ذکر کو اتنی جلدی ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔

''میرے فیوریٹ رائٹر ہیں عمر حسن! آپ کے پاس ان کی کتاب دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ یعنی یہ کہ ہماری پسند کتابوں کے معاملے میں ایک سی ہے۔'' انہوں نے میری ایکسائٹمنٹ کا جواب محض ایک مسکراہٹ کے ساتھ دیا۔

''میں عمر حسن کی کتاب اتنی بار پڑھ چکی ہوں کہ سمجھیں یہ مجھے زبانی یاد ہو چکی ہے مگر اتنا اچھا رائٹر اور اس کی صرف ایک کتاب؟ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ جب وہ اتنا اچھا لکھ لیتے تھے پھر انہوں نے لکھنا چھوڑ کیوں دیا۔'' وہ خاموشی سے چائے کے سپ لیتی رہیں، یوں جیسے میرے جملوں میں جواب طلب تو کوئی بات ہے ہی نہیں، پھر وہ کیا بولیں۔ ان کے چہرے پر سکون اور اطمینان ہنوز قائم تھا۔ ایسے جیسے وہ میری کسی بات سے ڈسٹرب نہ ہوئی ہوں۔ مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ وہ میرے ناقابل فہم انداز پر اندر ہی اندر چونک رہی ہیں۔ میں انہیں چونکانا ہی چاہتی تھی اس لیے اس موضوع کو جاری رکھا۔

''میں نے تو اس بات پر بہت غور کیا ہے کہ عمر حسن نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ انٹرنیٹ تک کے ذریعے ان کی مزید کتابوں یا ان کی گمشدہ شخصیت کو تلاش کرنے کی بہت کوششیں کر چکی ہوں مگر سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آپ کو کیا لگتا ہے۔ انہوں نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟'' میرے جملوں میں ایک چھپی ہوئی کاٹ تھی۔

''اس بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی وجوہات ہوتی ہیں؟'' وہ اس ذکر کو مزید جاری رکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

''اپنی اپنی وجوہات؟ ہاں کیا کہہ سکتے ہیں کہ عمر حسن کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ ہم اس بارے میں کوئی رائے کیسے دے سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا کوئی قریب ترین فرد ان کے لکھنا چھوڑ دینے کی وجہ بنا ہو۔ اور ہو سکتا ہے وہی وہ فرد ہو جس کی وجہ سے انہوں نے لکھنا شروع کیا ہو۔''

وہ بالکل خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اپنے تاثرات بالکل بھی تبدیل نہیں ہونے دیے تھے۔ میں نے اپنا چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھا اور مزید بولی۔

''کبھی وہ فرد مجھے مل جائے تو میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ ایک ایسے شخص سے جو صرف لکھنے کے لیے پیدا ہوا تھا قلم چھین کر تمہیں کیا حاصل ہوا؟'' ان کے کمرے میں ان کے دفتر کا کوئی فرد داخل ہوا تھا، غالباً ان کا کوئی ماتحت جوان سے کچھ پوچھنے آیا تھا۔ وہ اپنی میز سے اٹھ کر خود ہی اس کے پاس چلی گئیں۔ میں سمجھ سکتی تھی کہ ایسا وہ محض اس تکلیف دہ موضوع سے بچنے کے لیے کر رہی ہیں۔ وہ اس موضوع پر کچھ کہنا سننا نہیں چاہتیں مگر وہ یہ بات صاف صاف مجھ سے کہہ نہیں سکتی تھیں۔

میں گردن گھما کر انہیں ان کے ایک ماتحت کے ساتھ پروفیشنل گفتگو کرتا دیکھنے لگی۔

اپنے ماتحت کو فارغ کر کے وہ واپس اپنی میز پر آئیں، اسی طرح چہرے پر اعتماد اور ہلکی سی مسکراہٹ لیے۔

''آپ فکر مت کیجئے زنیرہ! آپ کا مسودہ میں دیکھ لوں گی۔''

انہوں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی مجھ سے خشک قسم کے پروفیشنل لہجے میں کہا۔

وہ مجھے میرے سابقہ موضوع کی طرف کسی قیمت پر جانے دینا نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنی عزت افزائی پر ذرا بھی بدمزہ نہ ہوئی تھی۔ میرے چہرے کی مسکراہٹ ہنوز برقرار تھی۔

''ٹھیک ہے دیا! پھر میں چلتی ہوں۔ یوں بھی خاصا وقت لے لیا میں نے آپ کا۔'' اپنا بیگ کاندھے پر لٹکاتی میں کرسی پر سے اٹھی۔ وہ ایک دم چونکیں۔ وہ منجمد نگاہوں سے بالکل ساکت بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

مجھے اب مزید اس نوعیت کی کسی یاددہانی کی ضرورت نہیں تھی کہ میرا مسودہ آپ ہی دیکھیے گا اور پلیز جلدی دیکھ لیجیے گا۔ میں جانتی تھی کہ اب یہ مسودہ ان کے سوا کسی اور کے ہاتھوں میں ہرگز نہیں جائے گا۔

میں نے گم صم بیٹھی ودیعہ کمال پر جو مجھ کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھیں الوداعی نظر ڈالی اور باہر نکل آئی۔

''اللہ میرے لفظوں میں وہ اثر ڈال دے جو کسی کی زندگی کو بدل سکے۔ مجھے وہ ذریعہ بنا دے جو ان محبت کرنے والوں کے بیچ حائل ہوئی خلیج کو ختم کر سکے، جو ہر جدائی کو مٹا ڈالے، جو ہجر کی تپتی دھوپ کو وصل کی ٹھنڈی چھاؤں سے بدل سکے۔'' میں ان کے دفتر سے باہر آ گئی تھی۔

☆☆☆

اگر واقعی مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے، اگر واقعی میرے لفظوں میں اثر ہے تو وہ کسی کی زندگی کو بدل دیں گے۔

میں کل دوپہر سے لے کر آج صبح تک سارا وقت ایک کشمکش اور اضطراب میں مبتلا رہی تھی۔ میں بہت ٹینشن میں تھی۔

دن کے بارہ بج رہے تھے اور میں بے مقصد ٹی وی پر چینل بدلتی اپنی ٹینشن دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ امی اور میری چھوٹی بہن شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ گھر پر میں اور مانی تھے۔ مانی اخبار میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرا اور اس کی فلم کے متعلق چٹپٹی خبریں پڑھنے اور پھر مرچ مسالے لگا کر مجھے سنانے میں مصروف تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس کی فضول گوئی کو انجوائے کر لیتی مگر اس وقت کم از کم بالکل انجوائے نہیں کر پا رہی تھی۔

''بجو! میرا ہمارے ملک کی نامور ادارہ ہے، پڑوسی ملک میں ملک و قوم کا نام ''روشن'' کر کے آ رہی ہے۔ اس کے متعلق معلومات تو ہمیں رکھنی چاہئیں۔''

''اچھا گیٹ پر بیل ہو رہی ہے، جا کر دیکھو کون ہے۔'' میں نے اسے احساس دلایا۔ وہ اٹھ کر چلا گیا تو میں اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ چند منٹوں بعد واپس آیا۔

''آپ سے ملنے کوئی ودیعہ کمال آئی ہیں۔'' اخبار میرے ہاتھوں سے پھسل کر نیچے گرا۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں یک دم ہی صوفے پر سے اٹھی۔

''کہاں ہیں وہ؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آیا ہوں۔ گیٹ پر تو کھڑا رکھنے سے رہا۔'' میں اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

''آرام سے بجو! وہ آپ سے ملنے آئی ہیں تو ملے بغیر تو ہرگز نہیں جائیں گی۔'' مانی پیچھے سے چلایا تھا اور میں اس کی آواز نظر انداز کر کے اسی طوفانی رفتار سے بھاگتی ڈرائنگ روم تک آ گئی تھی۔

میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وہ مجھے صوفے کے پاس کھڑی نظر آئیں۔ انہوں نے سبز رنگ کا وہی لباس پہن رکھا تھا جو کل اپنے

آفس میں پہنا ہوا تھا۔کل کا وہ کلف لگا سوٹ آج کچھ سلوٹ زدہ ہو رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' اندر قدم رکھتے ہی میں نے انہیں سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' ان کا لہجہ بہت بجھا بجھا سا محسوس ہوا مجھے۔ان کی آنکھیں بہت سرخ اور سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''آپ بیٹھیں نا پلیز۔'' میں نے انہیں کھڑا دیکھ کر فوراً بیٹھنے کو کہا۔وہ بیٹھ گئیں۔میں بھی قدرے محتاط انداز میں ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔انہوں نے اپنے ہاتھوں میں ڈھیر سارے کاغذ پکڑ رکھے تھے۔میں ان کاغذوں کو پہچانتی تھی۔

وہ ان کاغذوں کے ساتھ کیا کرنے والی ہیں؟ وہ مجھ سے کیا کہنے والی ہیں؟ میں خوف زدہ انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی اور وہ بالکل خاموش بیٹھی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''وہ تمہیں ایبٹ آباد میں کب ملا زنیرہ؟'' کافی دیر کے بعد انہوں نے بہت آہستہ آواز میں مجھ سے پوچھا۔پرتکلف سے ''آپ'' سے وہ بے تکلفانہ ''تم'' تک آ گئی تھیں۔مجھے ان کے ''تم'' نے کسی قدر حوصلہ دیا تھا۔

''ڈیڑھ ماہ پہلے، میں پچھلے ڈیڑھ ماہ میں بہت مرتبہ ان سے ملی ہوں۔پرسوں دوپہر ان سے مل کر ہی کراچی واپس آئی ہوں۔''

''وہ کیسا ہے؟'' اس بار ان کی آواز پہلے سے بھی بہت ہلکی تھی، میں ان کی آواز نہیں سن سکی تھی۔میں نے ان کے ہونٹوں کی حرکت سے انکا سوال سمجھا تھا۔مجھے ان کی آنکھوں میں آنسو تیرتے نظر آئے تھے۔

''وہ بالکل ویسے ہی ہیں دیا! جیسا میں نے انہیں لکھا ہے۔بہت اداس، بہت تنہا۔'' کل ان کے دفتر میں، میں نے جان بوجھ کر انہیں اس نام سے بلایا تھا جبکہ اس وقت واقعی غیر اختیاری طور پر میرے منہ سے ان کے لیے یہ نام نکلا تھا۔ان کے چونک کر دیکھنے سے پہلے تک مجھے خود احساس نہیں ہوا تھا کہ میں نے انہیں کیا کہا ہے۔

''دیا؟'' انہوں نے میرے لبوں سے یہ نام سن کر اسے خود بھی دہرایا۔

''تم نے کل بھی مجھے دیا کہا تھا، میں تمہاری کسی بات سے اتنی ڈسٹرب نہیں ہوئی جتنی اس نام سے۔میری زندگی میں دو لوگ تھے جو مجھے اس نام سے پکارا کرتے تھے۔میں نے ان دونوں کو کھو دیا زنیرہ؟ ایک کو تقدیر نے مجھ سے چھین لیا اور دوسرے کو میں نے خود، خود سے دور کر دیا۔اسے میں نے خود گنوا دیا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔میرے سامنے وہ دیا بیٹھی تھی جس کی زندگی کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھی۔میں بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گئی۔

میں صوفے پر ان کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔

''کل جب تم مجھے دیا کہہ کر میرے دفتر سے چلی گئیں پھر میں وہاں مزید ایک پل نہ ٹھہر سکی۔میں نے تمہارے لکھے یہ صفحات اٹھائے اور گھر آ گئی۔انہیں تو میں نے پڑھنا شروع بھی نہیں کیا تھا اور صرف دیا نام پر ہی روئے چلی جا رہی تھی۔کل تم نے مجھے بہت رلایا ہے زنیرہ۔'' میں انہیں روتے ہوئے دیکھ رہی تھی مگر بولی کچھ نہیں تھی۔

''تمہاری کہانی میں نے پڑھ لی زنیرہ! اپنی غلطیاں دیکھ لیں، اپنی کوتاہیاں دیکھ لیں۔ خود کو بہت اچھا سمجھتی تھی۔ لگتا تھا میں کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتی۔ تمہاری طرح کبھی کوئی آئینہ دکھانے والا ملا ہی نہیں، جو مجھے بتاتا کہ میں زندگی میں کہاں کہاں پر غلط ہوں۔ میں غلط تھی زنیرہ! میں غلط ہوں زنیرہ!'' وہ بہت بری طرح رو رہی تھیں، میں ان کے لیے پانی لانے کے لیے اٹھنا چاہتی تھی مگر انہوں نے میرے ہاتھ اس مضبوطی سے پکڑ لیے تھے کہ میں اٹھ نہیں سکی۔

''مجھے وہ آخری فرد بھی نہیں ہونا چاہیے تھا جو اسے یہ احساس دلاتا کہ جس گھر کو وہ اپنا گھر سمجھتا ہے، وہ اس کا گھر نہیں جن لوگوں کو وہ اپنی فیملی سمجھتا ہے، وہ اس کی فیملی نہیں اور میں ہی وہ پہلی فرد بنی جس نے اسے یہ تمام اذیت ناک احساس دلائے، اس سے اس کا سب کچھ چھین لیا۔ صرف ایک پل میں کتنی آسانی سے اس سے کہہ دیا، یہاں سے چلے جاؤ۔ اتنی خود غرضی، اتنی سنگ دلی؟ آخر ہوتی کون تھی میں اس سے اس کا گھر چھیننے والی، اس سے اس کے رشتے چھیننے والی، میرا اختیار صرف میری ذات پر تو ہو سکتا تھا۔ میں یہ تو کہہ سکتی تھی کہ میں اب تم سے محبت نہیں کروں گی، میں اب تم سے شادی نہیں کروں گی مگر اسے یہ حکم دینے والی میں کون تھی کہ وہ ہماری زندگیوں سے نکل جائے۔ ہمیشہ کے لیے کہیں دور، بہت دور چلا جائے۔''

ان کے آنسو میرے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ انہیں کسی احساس جرم میں مبتلا کرنا میرا مقصد ہرگز نہیں رہا تھا۔ میں تو صرف کسی کی زندگی میں خوشیاں واپس لانا چاہتی تھی۔

''میں نے اس کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کی، اپنے گناہوں کا ازالہ کس طرح کروں زنیرہ! اس شخص کے ساتھ جس سے میں بے پناہ محبت کرتی تھی۔ اس سے اس کا گھر، اس کی فیملی، اس کی محبتیں، اس کا کیریئر سب کچھ چھین لیا۔ صرف ایک اپنی خود غرض انا کے پیچھے۔''

''آپ اس طرح مت سوچیں دیا! اگر وہ تنہا رہے، اذیتوں بھری زندگی جیتے رہے تو تنہا تو آپ بھی رہیں جو سزا انہوں نے کاٹی، وہ آپ نے بھی تو کاٹی ہے۔''

میں نے انہیں گناہ کے اس احساس سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ وہ اس طرح بکھر کر رو رہی تھیں کہ کوئی پتھر دل ہی اس منظر کو آنکھیں نم کیے بغیر دیکھ سکتا تھا۔

''میں نے کیا سزا کاٹی ہے؟ اگر دکھ ہے تو وہ میرے منتخب کردہ تھے۔ اگر اذیتیں کہیں تو وہ میری اختیار کردہ تھیں اور ان دکھ بھرے دنوں اور اذیت بھری راتوں میں بھی میں تنہا تو نہیں تھی۔ میرے ماں باپ، میرا گھر، میرے رشتے سب کچھ میرے پاس تھے۔

اصل سزا تو اس نے کاٹی ہے اور بغیر کسی جرم کے کاٹی ہے۔ بالکل تنہا، بالکل اکیلا، ایک ایسے احساس جرم کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے جو اس سے سرزد ہوا ہی نہیں تھا۔ میں کتنی بری ہوں زنیرہ! میں کتنی بری ہوں۔ میں جھولیاں بھر بھر کر اسے دکھ دیتی رہی جو میرے لیے خوشیوں کے سوا کچھ چاہتا نہیں تھا۔

میں نے اس سے اتنا کچھ چھین لیا جو ساری زندگی مجھ سے محبت کرتا رہا۔ تم مجھے پہلے کیوں نہیں ملیں زنیرہ؟ کہ آئینے میں مجھے میری وہ

صورت دکھا سکتیں جو میں خود دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے میری غلطیوں کا احساس دلانے والا۔ میں کتنی غلط ہوں، کبھی کسی نے نہیں بتایا۔ یہاں تک کہ عمر نے بھی نہیں۔ تم نے لکھا ہے نا زنیرہ! لیکن وہ مجھے میری کسی غلطی کا احساس کیسے دلا دیتا۔ عمر حسن کی محبت تو دیبہ کمال کو غلط سمجھنا جانتی ہی نہیں تھی۔''

پچھتاووں میں گھری، احساس ندامت میں مبتلا وہ آہستہ آواز میں بول رہی تھیں۔

''اس رات جب وہ گھر سے جا چکا تھا میں ساری رات بے قراری سے روتی رہی۔ رات بھر ایک پل کے لیے بھی میرے اشک نہیں تھمے تھے، میری بے چینی ختم نہیں ہوئی تھی۔ میں یہ سمجھتی رہی تھی کہ یہ بے چینی اس کے دور چلے جانے کی وجہ سے ہے مگر انیس سالوں بعد کل رات یہ جان پائی ہوں کہ اس رات عمر نے سمندر کے پاس کھڑے ہو کر کیا کیا تھا۔ میری وجہ سے وہ اب لکھ نہیں پاتا، میں اس حقیقت سے آگاہ تھی مگر اس بات سے نہیں کہ اس نے انیس سالوں میں اپنا دوسرا مکمل ناول کیوں پبلش نہیں کروایا۔ میں اس کے لیے دعائیں مانگتی تھی۔ یقین کرو زنیرہ! ان انیس سالوں میں۔ میں صرف اور صرف اسی کے لے دعائیں مانگتی تھی۔''

''دیبا......'' میں انہیں تسلی دینے کے لیے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''وہ محبت کے لیے لکھتا تھا، وہ میرے لیے لکھتا تھا اور جب میں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا پھر وہ کیسے لکھتا؟ اسے کتنا آگے جانا تھا اور تمہارے احساس دلانے سے پہلے تک بس رو رو کر اس کے لیے دعائیں کر کے سمجھتی تھی کہ اس کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اس کا سب کچھ چھین لیا، میں نے اس کی ہر خوشی برباد کر دی۔''

''دیبا! آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، بس اتنا کافی ہے مگر آپ پچھتا کیوں رہی ہیں؟ یہ پچھتاوے اس وقت تو ہو سکتے تھے جب اگر خدانخواستہ عمر حسن اس دنیا میں نہ رہے ہوتے مگر اب کیوں؟ انسان پچھتاتا تو تب ہے جب زندگی ختم ہو جاتی ہے۔'' میں نے ان کے آنسو صاف کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔

''ابھی آپ زندہ ہیں، ابھی عمر حسن زندہ ہے، ابھی آپ دونوں کی محبت زندہ ہے۔ ابھی کچھ دیر تو ہوئی ہے مگر بہت دیر نہیں ہوئی۔ آدھی زندگی گزر گئی، آدھی تو ابھی باقی ہے۔ آنے والے ماہ و سال تو ابھی آپ کی دسترس میں ہیں دیبا! انیس سال گزر گئے ہیں خدانخواستہ زندگی تو نہیں گزر گئی۔ پلیز دیبا! اس باقی رہ جانے والی آدھی زندگی کو برباد مت ہونے دیں۔ عمر حسن پھر سے لکھ سکیں گے، وہ پھر سے خوش رہ سکیں گے۔''

اس نے ان کے پچھتاووں اور کرب و اذیت میں گھرے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر امید کی ایک کرن جگمگاتے دیکھی۔

''آدھی زندگی؟'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔

''ہاں دیبا! آدھی زندگی...... اللہ نے آپ کی دعائیں سنی ہیں جو آدھی زندگی ضائع ہو گئی ہے نا آپ اس کی بھی سب محبتیں اور تمام خوشیاں اس باقی بچی آدھی زندگی میں عمر حسن کو دے سکیں گی۔ آپ ہر کمی اس آدھی زندگی میں پوری کر دیجئے گا۔'' ان کے چہرے پر امید کے ساتھ مسکراہٹ بھی پھیلی تھی۔ آنکھوں میں آنسو، لبوں پر ہنسی اور اس آنسوؤں بھرے چہرے پر امید وار خوشی۔ بڑا دلفریب منظر تھا یہ۔

میں ان کے پاس سے بغیر کچھ کہے اٹھی اور ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔ چند سیکنڈز میں، میں واپس ڈرائنگ روم میں ان کے پاس آ گئی۔

میں ان کے پاس آ کر بیٹھی اور اپنے ہاتھ میں دبی ایک پرچی ان کے سامنے کر دی۔ اس پرچی پر جلی حروف میں ایک ٹیلی فون نمبر درج تھا۔ جیسے ہی میں نے پرچی ان کی نگاہوں کے سامنے کی وہ مسکرانے لگیں۔

انہوں نے بغیر کچھ کہے بیگ میں سے اپنا موبائل فون نکالا اور ایک لمحہ بھی سوچے بغیر وہ نمبر ملانے لگیں جو اس پرچی پر لکھا تھا۔ انہوں نے نمبر ملا لیا تو میں فوراً ان کے پاس سے اٹھنے لگی۔

اس گفتگو میں یہاں اپنی موجودگی مجھے غیر مناسب لگی تھی مگر ودیعہ نے مجھے ہاتھ پکڑ کر اٹھنے سے روک لیا۔

''تم ہماری کہانی کا وہ کردار ہو جو ہم سے بالکل الگ نہیں۔ ہماری زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں جاننے اور اس میں شریک رہنے کا تمہیں حق ہے۔'' میں مسکراتے ہوئے واپس بیٹھ گئی۔ تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔ ریسیور اٹھاتے ہی یقیناً انہوں نے ''ہیلو، یہ چمن زار ہے، میں عمر حسن بول رہا ہوں۔'' جیسی کوئی بات کہی تھی۔ ودیعہ نے ان کا تعارفی جملہ خاموشی سے سنا۔ وہ آواز سنتے ہی ان کی آنکھوں سے پھر سے آنسو گرنے لگے تھے اور یونہی آنسو بہاتے مدھم آواز میں وہ ایک چھوٹا سا فقرہ بولیں۔

''عمر! لوٹ آؤ۔'' نہ سلام، نہ تعارف، نہ خیریت۔ بس یہ ایک مختصر سا جملہ اور لائن منقطع۔ وہ مجھے فراموش کیے ابھی بھی اسی آواز میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں ان کی ان کیفیات میں کچھ دیر کے لیے انہیں تنہا چھوڑنا چاہتی تھی، اسی لیے خاموشی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم سے کچن میں آ گئی۔

میں کچن میں ان کی تواضع کے لیے کچھ لینے آئی تھی مگر وہاں مجھ سے پہلے ہی مائی ٹرے تیار کرتا نظر آیا۔ میں اس کے سگھڑاپے پر مسکراتے ہوئے اس کے پاس آ گئی۔

اس نے دونوں گلاسز ٹرے میں رکھ کر ٹرے میرے ہاتھ میں پکڑا دی تھی۔ اس نے واقعی ٹرے بڑے سلیقے سے سجائی تھی۔ ایک پلیٹ میں براؤنیز اور ایک میں سینڈوچز۔ میں اس کے سگھڑاپے کی تعریف کرتے ہوئے واپس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ ودیعہ کے ہاتھوں میں میرا مسودہ تھا اور وہ اس پر کچھ لکھ رہی تھیں۔ میں ٹرے اپنے اور ان کے درمیان رکھ کر ان کے پاس بیٹھی تو انہوں نے میرے پوچھے بغیر ہی مسودہ میرے سامنے کر دیا۔ یہ میرے مسودے کا وہ آخری صفحہ تھا جسے میں نے خالی چھوڑ دیا تھا لیکن وہ صفحہ اب خالی نہیں تھا۔

''آدھی زندگی گزار دینے کے بعد آخر اس سنگ دل لڑکی کو کسی نے اس کی غلطیوں کا احساس دلا ہی دیا اور پھر یوں ہوا کہ اپنی غلطیوں پر نادم ہوتے ہوئے اس نے شہر محبت کے دروازے عمر حسن پر پھر سے کھول دیے۔ شہر محبت جو عمر حسن کے بغیر بہت ویران تھا پھر سے آباد ہو گیا۔'' میں یہ جملے پڑھ کر مسکرائی۔

''اب تو ٹھیک ہے، تمہاری کہانی میں اب تو کوئی منفی تاثر باقی نہیں رہا نا؟'' میں نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

''اب میں تو رائٹر ہوں نہیں، میں نے اختتام تمہیں بتا دیا۔ اسے ایک مکمل سین، ڈائیلاگز اور تمام تر منظر نگاری کے ساتھ تم خود لکھ لینا۔'' وہ بہت خوش اور بہت مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

''دیا! آپ یہاں سے جا کر آج ہی یہ مسودہ ضائع کر دیجیے گا۔ اسے نذر آتش کر دیں یا سمندر ہی میں بہا آئیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

میں بس یہ چاہتی ہوں کہ اس کا گواہ میرے اور آپ کے سوا کوئی نہ ہو، عمر حسن بھی نہیں۔ انہوں نے مجھ پر اعتبار کیا تھا۔ شاید انہیں یہ اچھا نہ لگے کہ میں نے وہ سب لکھ ڈالا جو انہوں نے مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے بتایا تھا۔ وہ اس حد تک جان لیں کہ میں کراچی آ کر آپ سے ملی ہوں، آپ سے کچھ کہا سنا ہے تو ٹھیک ہے مگر میں نے آپ ہی کی کہانی آپ کو لکھ کر دی، یہ انہیں کبھی مت بتایئے گا۔"

وہ جانے کے لیے اٹھیں تو میں نے بے ساختہ ان سے یہ بات کہی۔ وہ جواباً مسکرائیں اور سر اقرار میں ہلا کر مجھے یہ یقین دلایا کہ وہ اسے آج ہی ضائع کر دیں گی۔

میں ان کے ساتھ گیٹ تک آئی تھی۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے بڑی محبت سے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

"تم بہت اچھی ہو نیرہ!" انہوں نے بہت سچائی اور خلوص سے میری تعریف کی۔

"میں اچھی ہوں یا نہیں یہ تو نہیں جانتی۔ ہاں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ میں ہوں بالکل عمر حسن اور ودیعہ کمال جیسی۔ اگر انیس سال پہلے میں ان کی زندگی میں شامل ہوتی تو وہ سب نہ ہونے دیتی جو ہوا۔ دیا! آپ اور عمر حسن اور میں، ہم الگ الگ دنیاؤں کے الگ الگ لوگ ہیں۔ آپ لوگوں کی زندگیاں کچھ اور تھیں اور میری زندگی کچھ اور ہے۔ آپ لوگوں کا وقت کچھ اور تھا میرا وقت کچھ اور ہے۔ اتنے بہت سارے فرق کے باوجود ہم ایک جیسے ہیں کیونکہ ہم میں ایک قدر مشترک یعنی محبت ہے اور دیا! محبت الگ ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ محبت بدل بھی کیسے سکتی ہے۔ سالوں گزر جائیں، صدیاں بیت جائیں، محبت تو محبت ہی رہتی ہے۔ اس کا رنگ، روپ شکل سب وہی رہتی ہے۔"

اور اب مکمل ہو رہی تھی میری کہانی۔ یہ میری کہانی کا آخر منظر تھا۔ میرے ناول کا آخری سین۔ میری کہانی کا وہ اختتام کہ اس کا اس کے سوا کچھ اور اختتام ہوتا تو میں زندگی میں دوبارہ کبھی لکھ نہ پاتی۔ اس بار میں اپنی کہانی کے خوشگوار انجام کو تصور کی آنکھ سے نہیں بلکہ حقیقت میں دیکھ رہی تھی۔ میں خود اس آخری منظر کا ایک حصہ تھی۔ کتنی دلچسپ اور ناقابل یقین سی صورتحال ہے نا یہ؟ میں اپنے کمرے میں رائٹنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اس منظر کو کاغذ پر نہیں لکھ رہی تھی بلکہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ خود اس میں شامل ہوں۔

یہ سعادت علی خان کا گھر تھا، عمر حسن اور ودیعہ کمال کے ابا میاں کا گھر...... یہ گھر میری کہانی میں مرکزی اہمیت کا حامل تھا اور یہیں پر میری کہانی کا خوشگوار اور میرا من چاہا انجام ہو رہا تھا۔ میں اس گھر میں پہلی مرتبہ آئی تھی، پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اس گھر سے بہت اچھی طرح مانوس ہوں۔

میری کہانی کے زندہ کردار، ابا میاں کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھتے ہی میں سرمئی شیروانی، سفید شلوار میں ملبوس خوشی اور طمانیت بھرے انداز میں مہمانوں کا استقبال کرتے باریش و باوقار بزرگ کو پہچان گئی تھی کہ یہ ڈاکٹر کمال علی خان ہیں اور ان کے برابر میں نیلے رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے خاتون جنہیں دیکھتے ہی یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ جوانی میں کس قدر خوب صورت رہی ہوں گی۔ وہ ڈاکٹر نائلہ کمال تھیں اور دور ایک کرسی پر بیٹھی بہت ضعیف بہت سن رسیدہ خاتون جنہیں دیکھنے، سننے اور بولنے میں بہت کوششیں صرف کرنا پڑ رہی تھیں، وہ بوا جی تھیں۔ میں اپنے تینوں اہم کرداروں اور ان کے دلی جذبات کو سمجھتی تھی۔ میرے یہ تینوں کردار آج خوشی سے سرشار تھے۔

اور میرے دونوں مرکزی کردار، اندر داخل ہوتے ہی میں نے ان دونوں کو ڈھونڈا تھا اور فوراً ہی وہ دونوں مجھے نظر بھی آ گئے تھے۔ اس وسیع و

عریض اور خوب صورت لان میں محدود تعداد میں مدعو کیے گئے مہمانوں کے لیے ایک پر تکلف اور پروقار تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ میرے دونوں مرکزی کردار اسٹیج پر بیٹھنے کی بجائے اپنے مہمانوں سے خود جا کر ملنا پسند کر رہے تھے۔ عمر حسن کے لبوں پر وہ مسکراہٹ تھی جو میں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ پھر اپنوں کے درمیان تھے اور ان کے پہلو میں وہ کھڑی تھی، جس کے نام ان کی پوری حیات ہے پھر یہ مسکراہٹ ان کے لبوں پر کیوں نہ ہوتی؟ ان سے چھن جانے والی ان کی ہر متاع انہیں واپس مل گئی تھی اور سب کچھ واپس مل جانے کی خوشی ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔ میرون رنگ کے ہلکے کام والے نفیس لباس کے ہمراہ ہلکے میک اپ اور بہت کم جیولری سے آراستہ ودیعہ کمال بہت خوب صورت اور باوقار لگ رہی تھیں۔

میں ان دونوں کو ساتھ کھڑا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ جتنی میری عمر ہے، اس سے بھی طویل ان کی محبت کی عمر ہے۔ ایک لمبا سفر، ایک کٹھن سفر، ان دو لوگوں کی زندگیوں میں خوشیاں بہت دیر سے آئی تھیں۔

ابا میاں اس تقریب میں شرکت کے لیے خاص طور پر ایبٹ آباد سے کراچی آئے تھے۔ میں اس تقریب میں ان ہی کے ساتھ آئی تھی۔ وہ کمال علی خان اور نائلہ کمال کو ان کی بیٹی کی شادی کی مبارکباد دینے لگے تو میں ان دونوں سے سلام دعا کرتی عمر حسن اور ودیعہ کمال کے پاس جانے لگی وہ دونوں مجھے دیکھ چکے تھے، سو مجھ سے پہلے وہ میرے قریب پہنچ گئے۔

''مہمان خصوصی اتنی دیر سے تشریف لا رہی ہیں؟'' عمر حسن میری طرف مسکراتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''اتنی اہم تقریب میں شرکت کے لئے تیاری بھی تو خاص کرنی تھی۔ آپ دونوں کی شادی میں کوئی پہنا ہوا جوڑا تو پہن نہیں سکتی تھی۔ خاص آج کے لیے یہ نیا ڈریس بنوایا ہے۔ خاص اہتمام کرنے میں دیر تو ہونا تھی۔'' میرے اس جواب کے دوران ودیعہ نے میرے ہاتھ گرم جوشی سے تھام لیے تھے۔ میں نے بغور انہیں دیکھا اور پھر بے ساختہ ان کی تعریف کی۔ ''دیا! آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔'' عمر حسن میرے لبوں سے یہ نام سن کر خوشگوار انداز میں مسکرائے۔ سعادت علی خان اور عمر حسن کے بعد میں وہ تیسری فرد تھی جسے ودیعہ نے یہ نام لینے کا حق دیا تھا۔

''بہت بہت شکریہ۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم آج یہاں پر ہم دونوں میں سے کس کے مہمان کی حیثیت سے شرکت کر رہی ہو؟'' عمر حسن نے شرارتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے یہ سوال پوچھ کر جیسے مجھے مشکل میں ڈالنے کی کوشش کی۔

''مہمان؟'' میں نے انہیں ایسے دیکھا جیسے مجھے اس لفظ سے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔ ''کیا میں یہاں پر مہمان ہوں؟'' میرے اس انداز اور اس جواب پر عمر حسن بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

''محترم! آپ کے مقابل ایک ذہین رائٹر ہے اور آپ اسے اتنی آسانی سے لفظوں کے داؤ پیچ میں الجھا نہیں سکتے۔'' ودیعہ ہنستے ہوئے ان سے بولیں۔

''ویسے مذاق برطرف، تم درحقیقت یہاں پر مہمان نہیں ہو جس کے سبب آج یہاں یہ سب ہنگامہ وہ مہمان ہو بھی کیوں کر سکتی ہے۔ آج تو موقع نہیں پھر کسی دن فرصت سے تم سے ملوں گا تو وہ جادوئی اسم تم سے ضرور پوچھوں اور سیکھوں گا جس کے ذریعے تم پتھر دلوں کو موم کیا کرتی ہو۔''

ایک نظر ودیعہ پر ڈال کر انہوں نے کسی قدر دھیمی آواز میں مجھ سے یہ بات کہی۔ ودیعہ نے سب کچھ سن لیا تھا اور اب وہ مصنوعی خفگی سے

انہیں گھور بھی رہی تھیں۔ میں مسکراتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں کراچی آ کر ودیعہ سے ملی تھی، اس ملاقات میں، میں نے عمر حسن کی وکالت کرتے ودیعہ سے کچھ نہ کچھ کہا بھی ضرور تھا، اس سے ہٹ کر دوسری کوئی بات نہ میں نے انہیں کبھی بتائی تھی اور نہ ہی ودیعہ نے۔ ودیعہ مسودہ ضائع کر چکی تھیں اور وہ اب زندگی بھر کے لیے ایک راز کی طرح میرے اور ودیعہ کے سینوں میں محفوظ رہنا تھا۔ عمر حسن کریدتے ہوئے ہماری اس ملاقات کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے میں نے ودیعہ سے ایسا کیا کہا جو وہ اپنے پچھلے ہر فیصلے سے تائب ہو گئیں۔ وہ معلوم کرنے کی کتنی بھی کوشش کرتے مگر ہم دونوں سے کچھ بھی اگلوا نہیں سکتے تھے۔

''اکیس سالوں تک آپ دونوں کی منگنی رہی ہے، اگر آپ دونوں چاہیں تو گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں طویل ترین عرصہ تک منگنی شدہ رہنے والے جوڑے کے طور پر آپ دونوں کا نام آ سکتا ہے۔'' میری شوخ و شریر نگاہیں ودیعہ کی اسی انگوٹھی پر مرکوز تھیں۔

عمر حسن اور ودیعہ دونوں میرے شرارتی انداز کو انجوائے کرتے ہوئے ہنس پڑے۔

''آپ کے لکھنے کی وجہ پھر سے آپ کی زندگی میں آ گئی ہے۔ اب تو آپ لکھا کریں گے نا؟''

''بالکل لکھیں گے۔ اب یہ لکھنا چھوڑ کر تو دکھائیں۔ تم اور میں مل کر ان کا حشر نشر کر دیں گے۔ اگر اس نے لکھنا چھوڑنے کی بات بھی کی ہو تو۔'' ان سے پہلے ودیعہ نے مجھے جواب دیا۔

''وعدہ کریں آپ سال میں ایک ناول ہر حال میں لکھیں گے۔'' ودیعہ کے جواب کے بعد انہوں نے مجھے سر اثبات میں ہلا کر اپنے لکھنے کا یقین دلا دیا تھا۔

''وعدہ...... بالکل پکا وعدہ...... سال میں ایک کیا دو ناولز لکھا کروں گا۔'' میرے بچوں جیسے ضدی انداز پر انہوں نے زیر لب مسکرا کر مجھے یقین دہانی کرائی۔

''اور آپ کی اگلی کتاب کا انتساب کس کے نام ہوگا؟ مجھے پتا ہے آپ محبت کے لیے لکھتے ہیں مگر اگلا انتساب ہونا ''کسی'' اور کے نام چاہیے۔''

میں نے ''کسی'' پر خاص زور دیتے ہوئے کہا۔

''میری اگلی کتاب کا انتساب اس لڑکی کے نام ہوگا جو محبتوں کی قدر کرنا جانتی ہو جو محبت کرنے والوں کو عزیز تر رکھتی ہے اور جو پتا نہیں اب تک کہاں چھپی ہوئی تھی کہ ہمیں اتنی دیر سے ملی ہے۔ جانتی ہو اس لڑکی کا نام؟'' متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ میں نے نفی میں یوں سر ہلایا جیسے مجھے واقعی نہیں معلوم۔

''زنیرہ عباس! اور زندگی سے بس یہی گلہ ہے مجھے کہ وہ بہت دیر سے ملی ہے مجھے۔'' انہوں نے اچھے خاصے خوب صورت مصرع کا حشر نشر کرتے شوخی اور برجستگی سے کہا۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عمر حسن اور ودیعہ کمال دونوں بے تحاشا خوش تھے۔ دونوں بے تحاشا ہنس رہے تھے اور انہیں خود دیکھ کر میں بھی خوشی سے سرشار تھی۔

☆☆☆

اور میں اپنی کہانی کے آخری منظر سے نکل آئی تھی۔ مانی، مجھے اور ابا میاں کو واپسی میں لینے آیا تھا اور اب ہم اسی کے ساتھ گاڑی میں گھر واپس جا رہے تھے۔ ابا میاں، مانی کے برابر اگلی نشست پر اور میں پیچھے بیٹھی تھی۔

''ہوگئی بجو! آپ کے فیورٹ رائٹر کی شادی؟'' میں نے مسکرا کر سر اقرار میں ہلا دیا، جبکہ ابا میاں، مانی کو تقریب کی تمام تر تفصیلات بتانے اور ودیعہ کمال کی فیملی کی تعریفیں کرنے میں مصروف ہوگئے۔ میں نے خاموشی سے اپنا رخ کھڑکی کی طرف کرلیا۔ رات کا وقت تھا، سڑک پر اندھیرا، گاڑی میں بھی اندھیرا مگر میں پھر بھی احتیاطاً ان دونوں سے اپنا چہرہ چھپا کر اسے کھڑکی کی طرف ہی رکھنا چاہتی تھی۔ ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی میری آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تو بہت حیران ہوتے اور شاید کچھ پریشان بھی۔ میں انہیں یہ سمجھا ہی نہیں پاؤں گی کہ یہ آنسو خوشی کے آنسو ہیں جو منظر ابھی دیکھ کر آرہی ہوں، یہ اسی منظر کی سرشاری اور خوشی کے آنسو ہیں۔

یہ منظر میری کہانی کا وہ آخری منظر تھا جس کی تمنا میں، میں نے یہ کہانی لکھی تھی اور اس منظر کی یہ سرشاری اور یہ خوشی عمر بھر میرے ساتھ رہے گی۔ میرا رائٹنگ کیریئر کتنی دور تک جانے والا ہے، میں نہیں جانتی۔ ہوسکتا ہے میں زندگی بھر لکھتی رہوں، ہوسکتا ہے میں چند سالوں بعد لکھنا چھوڑ دوں۔ اگر میں یہ فرض کرلوں کہ اپنی زندگی کے آخری حصے تک لکھتی رہوں گی۔ تب بھی اگر اس طویل عمر کے آخری ایام میں کوئی پوچھنے والا مجھ سے آکر پوچھے گا۔

''زنیرہ عباس! آپ نے زندگی بھر بہت لکھا، آپ کی تحریروں کو لوگ بہت پسند بھی کرتے ہیں۔ خود آپ کو اپنی کون سی تحریر سب سے زیادہ محبوب ہے؟'' ''وہ کون سی تحریر ہے جو دل کے سب سے زیادہ قریب ہے؟'' تو میں اس پوچھنے والے کو لمحہ بھر سوچے بغیر یہی کہوں گی۔ ''مجھے میری وہ تحریر سب سے زیادہ محبوب ہے، سب سے بڑھ کر عزیز ہے، میرے دل کے سب سے زیادہ قریب ہے، جس کا ہر لفظ میں نے اپنے دل سے لکھا ہے، اپنے دل کی گہرائیوں سے لکھا، صرف کسی کی زندگی بدلنے کے لیے لکھا، فقط ایک فرد کے لیے لکھا، اس ایک فرد کے سوا اس تحریر کا کوئی قاری نہیں اور جو کبھی کہیں چھپی نہیں۔

ختم شد